جلتی چھاؤں

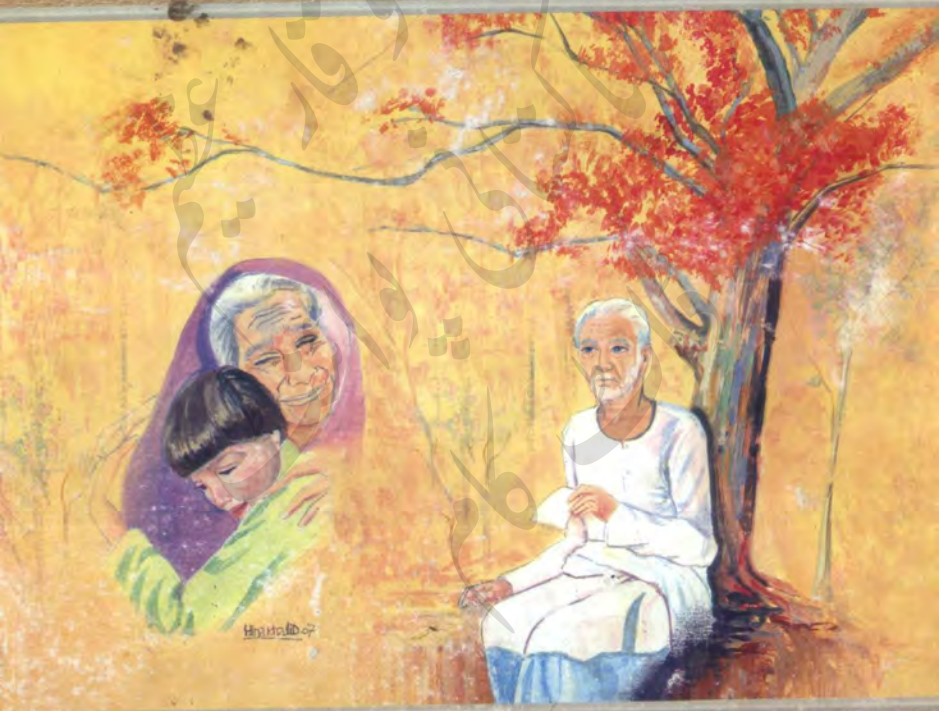

انور احسن صدیقی

پیش لفظ

''جلتی چھاؤں'' انسانی پستیوں اور انسانی رفعتوں کی ایک ایسی حقیقت افروز کہانی ہے جو اپنے مرکزی کردار کی عمر گریزاں کے ایک ایک لمحے کا احتساب کرتی ہے اور اسی کردار کے حوالے سے اپنے عہد کی ان پر اثر معروضی سچائیوں کا انکشاف کرتی ہے جو بیک وقت سفاک بھی ہیں اور نشاط آخریں بھی۔ جن سے واقف ہونے کے بعد تلخی ایام کا احساس تو شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی امید اور ناامیدی کے درمیان رہنے والی شدید کشمکش کے دوران امید کا اجالا اپنے وجود کی بقاء پر اصرار کرتا نظر آتا ہے۔ یہ انسانی رشتوں کی منافقانہ پامالی اور حرص و ہوس کی وحشی، طوفان خیز قوت احساس کے نازک شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں اور سب کچھ پا کر سب کچھ کھر دینے کے ناقابل تلافی المیے کی کہانی ہے۔

یہ انسانی ذہانت کی غیر معمولی قوتوں اور ان کے غیر انسانی ذاتی استعمال کی کہانی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غریبی انسانی زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہے۔ لیکن بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ دم گھونٹ دینے والی غریبی جب ناقابل تصور امیری میں بدل جاتی ہے تو یہ اس غریبی سے کہیں بڑا عذاب بن کر انسان کی لاج کو ذہنی اور اس کے دل و دماغ کو منتشر کر دیتی ہے۔ غریبی کے راستے سے گزر کر امیری کی منزل تک چلے ہونے والا سفر آخر انسان کو کیوں شیطانی آزمائشوں سے گزارتا ہے اور اس کی اعلیٰ انسانی صفات کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سنگلاخ راہوں کی موڑ ملتی چلتی جاتی ہیں۔ اس معاشرتی عمل کو اس کہانی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کراچی کے گجر نالے کے ساتھ آباد غریبی کی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی طرح طرح کی بدبوؤں سے بھری ہوئی ایک کچی بستی کی ایک خستہ حال جھونپڑی سے شروع ہو کر شہر کے مالدار ترین علاقے کے ایک دمکتے چمکتے مہکتے محل نما مکان تک پہنچتے پہنچتے یہ کہانی اپنے اندر زندگی کے ان گنت رنگ لیے ہوئے ہے اور یہی وہ سارے رنگ ہیں جن کے بارے آج کے عہد کا منظر نامہ تشکیل پاتا ہے جو روح پرور بھی ہے اور روح فرسا بھی۔

انور احسن صدیقی

کپڑے کے میلے کچیلے تھیلے میں، جس پر جابجا روشنائی کے بیسیوں دھبے نظر آ رہے تھے، بوسیدہ سی کتابوں اور تڑی مڑی کاپیوں کا ایک چھوٹا سا بوجھ اپنے ہاتھ میں جھلاتا ہوا فیضو جیسے ہی بڑی سڑک سے نشیب کی طرف اُتر کر بستی کی جانب بڑھا، ویسے ہی فضا ایک دم بدل گئی۔

کراچی میں دس نمبر لالوکھیت سے ناظم آباد پٹرول پمپ کی طرف جاتے ہوئے اُلٹے ہاتھ کو یہ بستی واقع تھی۔ یہاں سے ایک نالہ گزر رہا تھا جس کا نام گجر نالہ تھا۔ عام دنوں میں اس نالے میں پانی بہت کم ہوتا تھا اور کئی جگہوں پر تو پانی اتنا کم تھا کہ نالے کو بآسانی پار بھی کیا جا سکتا تھا۔ یہ نالہ دور کہیں سے آتا تھا اور سڑک کو کاٹتا ہوا آگے چلا جاتا تھا۔ فیضو کو یہ معلوم نہیں تھا کہ گجر نالہ کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ اسے تو صرف یہ معلوم تھا کہ اس نالے کے کنارے جو ایک کچی بستی آباد ہے اس بستی میں اس کا گھر واقع ہے۔

بڑی سڑک تو صاف ستھری تھی اور اس کے کنارے بنے ہوئے عمدہ اور پختہ مکانات بھی بڑے صاف ستھرے نظر آتے تھے۔ ان میں رہنے والے لوگ بھی صاف ستھرے تھے۔ ان گھروں سے جو بچے نکل کر باہر آتے تھے، وہ بھی اچھے اچھے کپڑوں میں ملبوس اور صاف ستھرے ہوتے تھے۔ فیضو روزانہ دن میں کم از کم دو بار اس سڑک کے اس حصے سے گزرتا تھا جو اس کی بستی سے لے کر اسکول تک کے راستے پر واقع تھا۔

اسکول کے اوقات کے علاوہ وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ ویسے بھی اِدھر اُدھر مٹر گشت کے لیے سڑک پر نکل آتا تھا اور ان اچھے اچھے مکانوں کے سامنے سے گزرتا تھا جن میں اچھے اچھے اور صاف ستھرے لوگ رہتے تھے اور یہ سارا منظر اس کی اپنی بستی سے بہت مختلف تھا۔

دوپہر کا وقت تھا' فیضو اسکول سے گھر واپس آ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ تنہا نہیں تھا' جاوید اور نصیر اس کے ساتھ تھے۔ وہ دونوں بھی گجر نالے کی بستی میں ہی رہتے تھے اور اسکول میں اس کے ساتھ پڑھتے تھے۔

فیضو نے اپنے دوستوں کے ساتھ جیسے ہی سڑک کے نشیب میں اُتر کر بستی کے علاقے میں قدم رکھا' ویسے ہی ناگوار لیکن جانی پہچانی اور مانوس بُو نے اس کا خیر مقدم کیا۔ بُو دراصل بہت سی مختلف بُوؤں کا مرکب تھی۔ اس میں سب سے زیادہ عنصر تو نالے کے سڑے ہوئے پانی اور کیچڑ کی بُو کا تھا' جو اس سارے علاقے میں رچی بسی رہتی تھی۔ بڑی سڑک پر اس بُو کا بہت کم احساس ہوتا تھا۔ کیونکہ نالہ نیچے تھا اور سڑک اوپر تھی اور کھلی فضا اور دھوپ مل کر بُو کی شدت کو کم کر دیتی تھیں لیکن نیچے اُترتے ہی نالہ پورے زور و شور کے ساتھ اپنے وجود کو منوانے پر تُل جاتا تھا۔

نالے کی بُو کے علاوہ بُوؤں کے اس مرکب میں گھٹے ہوئے تنگ و تاریک گھروں میں چوبیس گھنٹے ملنے والی بُو' گھروں کے باہر پانی کے نکاس کے لیے بنائے گئے گڑھوں کی بُو جن میں سیاہ غلیظ پانی جو اپنے اندر گھر کے مکینوں کی ساری گندگی کو سمیٹے ہوئے تھا' بھرا رہتا تھا اور بعض اوقات کناروں سے چھلک کر گلی میں بھی بہنے لگتا تھا' گلیوں کے وسط میں اور کناروں پر نالیوں کے اندر بہتے ہوئے پانی کی بُو بھی شامل تھی۔ نیچے اُترتے ہی بہت ساری بُوؤں کا یہ مرکب ہر انسانی وجود پر حملہ آور ہو جاتا تھا جو اس بستی کے اندر قدم رکھتا تھا۔

تینوں لڑکے آپس میں باتیں کرتے ہوئے بستی کے اندر داخل ہو کر کچھ دور تک ایک ساتھ چلتے رہے۔ یہ بستی سینکڑوں جھگیوں اور کچے اور نیم پختہ چھوٹے چھوٹے مکانوں پر مشتمل تھی۔ بے شمار پتلی پتلی' لمبی لمبی اور پُر پیچ گلیاں تھیں۔ جنہوں نے بستی کو نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ رکھا تھا۔ گلیوں کا یہ سلسلہ کسی بری طرح اُلجھے ہوئے دھاگے کی طرح پیچیدہ اور ناقابلِ فہم تھا۔ باہر سے آنے والے کسی بھی شخص کے لیے اس بھول بھلیوں میں پھنس کر باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنا واقعی بہت دشوار تھا۔ پتلی پتلی گلیوں کے دونوں جانب جھگیاں تھیں۔ چٹائیوں' لکڑی کے تختوں اور بانسوں وغیرہ سے بنی ہوئی جھگیاں..... کہیں کہیں لوگوں نے پختہ کمرے بھی بنوا رکھے تھے اور وہ اس طرح کہ دیواریں تو سیمنٹ کے بلاکوں کی تھیں' لیکن چھتوں پر ٹین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں لیکن ان پختہ کمروں کے ساتھ ہی جھگیوں پر مشتمل کمرے بھی مکان میں شامل تھے۔ جھگیوں کے دروازوں پر عام طور پر ٹاٹ کے بوسیدہ پردے پڑے رہتے تھے۔ کہیں کہیں لکڑی کے دروازے بھی نظر آتے تھے جو سارا دن کھلے

رہتے تھے اور ان پر بھی ٹاٹ کے پردے پڑے رہتے تھے۔ جھگیوں اور کچے مکانات کا یہ پُر پیچ خمدار سلسلہ نالے کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلا گیا تھا اور یہاں ایک پورا شہر آباد تھا۔

باہر سے آنے والوں کے لیے تو یہ بستی بے شک پتلی پتلی گلیوں کی ایک بھول بھلیوں کی حیثیت رکھتی تھی لیکن بستی کے اندر رہنے والوں کے لیے یہاں کا ہر راستہ کہکشاں کی طرح صاف' سیدھا اور روشن تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی بڑے اطمینان سے آڑھی ترچھی گلیوں میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے گندے پانی سے بھری ہوئی نالیوں اور گڑھوں کو عبور کرتے ہوئے اپنی اپنی جھگیوں اور ٹھکانوں تک پہنچ جاتے تھے۔ انہیں راستہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ بعض گلیاں تو اس قدر پتلی تھیں کہ ان میں بیک وقت دو آدمیوں کا چلنا ایک دشوار امر تھا اور پتلی گلیوں کے دونوں اطراف آڑی ترچھی' ٹیڑھی میڑھی' بدصورت اور بد وضع جھگیوں کی قطاریں چلی گئی تھیں۔ جن میں ایک خلقت آباد تھی۔ ان چٹائیوں' تختوں' بانسوں کے ٹکڑوں' سیمنٹ کے بلاکوں اور ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے اور اندر زندگی کا ہر رنگ موجود تھا۔

آئینہ لاکھ دھندلا اور داغ داغ سہی' لیکن زندگی کا کون سا عکس تھا جو اس میں موجود نہ ہو۔ محبت' نفرت' رقابت' غم' خوشی' شادی' پیدائش' موت' لڑائی' جھگڑے سب ہی کچھ تو تھا۔ انہی جھگیوں میں چٹائیوں کی ناتواں اور شرمسار دیواروں کے اندر شادی شدہ جوڑے اپنی سہاگ رات مناتے تھے۔ یہیں میلے کچیلے اور گندے بستروں پر نئی زندگی جنم لیتی تھی اور کسی نومولود کے رونے کی آوازیں دنیا میں ایک نئے' مفلس وجود کی آمد کی اطلاع دیتی تھیں۔

فیضو اپنے دونوں ساتھیوں سے جدا ہو کر ایک پتلی سی گلی میں مڑ گیا۔ سامنے ہی ایک جھگی کے دروازے کے آگے' جہاں ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا' سڑی ہوئی سبزیوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا جس میں سے ایک مختلف قسم کی بُو اٹھ رہی تھی اور گلی کی مجموعی بُو میں شامل ہو کر اس کی شدت میں اضافہ کر رہی تھی۔ یہ شوکت حسین سبزی فروش کی جھگی تھی جس کے وجود کا تصور اس کے ٹھیلے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ علی الصبح اپنا ٹھیلا لے کر بستی سے نکل جاتا تھا اور سہ پہر کو جب واپس آتا تھا تو تھوڑی بہت بچی کھچی سبزیاں اس کے ٹھیلے پر موجود ہوتی تھیں۔ ان میں سے جو استعمال کے قابل ہوتی تھیں وہ کسی نہ کسی شکل میں استعمال ہو جاتی تھیں' لیکن جو بالکل سڑ جاتی تھیں اور فروخت کے بالکل قابل نہیں رہتی تھیں۔ انہیں دروازے کے باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ چنانچہ شوکت سبزی فروش کی جھگی کے آگے سڑی ہوئی سبزیوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا جس میں سے اٹھنے والی سڑی ہوئی بُو اپنی علیحدہ شناخت پر اصرار کر رہی تھی۔

نالے کے ساتھ واقع یہ بستی کراچی کی ان سینکڑوں بستیوں میں سے ایک تھی جو 1947ء کے بعد اس شہر کی سرزمین پر جابجا خودرو جھاڑیوں کی طرح اُگتی چلی آئی تھیں اور ان سب میں رہنے والے وہ لوگ تھے جو ہندوستان کے مختلف شہروں' قصبوں اور دیہات سے ہجرت کر کے سیدھے کراچی آ گئے تھے۔ جہاں ان کے پاس نہ تو رہنے کا کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ زندہ رہنے کے لیے ضروری وسائل۔ رہائش کے لیے ان لوگوں نے شہر میں جابجا جھگیاں ڈال کر بستیاں قائم کر لی تھیں' جہاں یہ تمام سہولتوں سے محروم سخت کوش زندگی گزار رہے تھے اور اپنی شبانہ روز محنت اور جدوجہد کے ذریعے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے ایک نئی دنیا کی تعمیر میں مصروف تھے۔ غربت تھی کہ چاروں طرف سے اُمڈی پڑتی تھی اور اس یلغار کا مقابلہ کرتے ہوئے نئی راہیں تلاش کرنی تھیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں کا زمانہ تھا۔ کراچی شہر میں زندگی بڑی طوفانی رفتار سے کروٹیں بدل رہی تھی اور ہر کروٹ کے ساتھ ایک نیا عالم وجود میں آ رہا تھا۔

فیضو' شوکت حسین سبزی فروش کی جھگی کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ جھگی کا ٹاٹ کا پردہ ہلا اور اس کے پیچھے سے شوکت کی بیٹی مسعودہ نمودار ہوئی جو اپنے بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر اور فیضو سے کئی سال چھوٹی تھی۔ اس کے ہاتھ میں المونیم کی ایک پتیلی تھی جس میں پتلی پتلی دال بھری ہوئی تھی۔ اس نے پتیلی کو ٹیڑھا کر کے اس پتلی دال کو سڑی ہوئی سبزیوں کے اوپر انڈیلنا شروع کر دیا۔

''اچھی خاصی اتنی بہت سی دال تھی۔'' اس نے سامنے سے گزرنے والے فیضو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''غارت گئی بلی نے پتیلی میں منہ ڈال دیا۔ ساری دال خراب کر دی' اب پھینکنی پڑ رہی ہے۔''

''تو پتیلی پر ڈھکن ڈھانک کر کیوں نہیں رکھتیں؟'' فیضو نے اپنے قدم قدرے آہستہ کرتے ہوئے اس کی بات سن کر کہا۔

''آپا نے پتیلی کھلی چھوڑ دی تھی۔'' مسعودہ نے کہا۔ ''انہیں تو ہوش ہی نہیں رہتا کسی بات کا اماں نے بھی ان کی اچھی طرح خبر لی ہے۔'' مسعودہ اس بات سے خوش معلوم ہوتی تھی کہ اس کی بڑی بہن شاکرہ کو ماں نے خوب ڈانٹا۔

''اگر انہوں نے پتیلی کھلی چھوڑ دی تھی تو تم نے ڈھانک دی ہوتی۔'' فیضو نے پھت پھت کر کے گرتی ہوئی دال پر نظریں جماتے ہوئے اس کی بڑی بہن شاکرہ کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

''ہنھ' مجھے کیا معلوم تھا۔'' مسعودہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''باورچی خانے میں تو آپا کام کر رہی تھیں۔'' ناگواری کا تاثر مسعودہ کے چہرے اور آواز سے ظاہر تھا۔ گرتی ہوئی پتلی دال کی کچھ باریک باریک چھینٹیں فیضو کے پاجامے پر بھی پڑ گئیں۔ گلی ہی اتنی پتلی تھی کہ بچنا مشکل تھا۔

فیضو آگے بڑھ گیا۔ کچھ ہی دور آگے جا کر اس کی جھگی تھی' جسے آدھی جھگی اور آدھا مکان کہا جا سکتا تھا۔ اس میں ایک سیمنٹ کے پختہ بلاکوں سے بنا ہوا کمرہ شامل تھا جس پر ٹین کی چادروں کی چھت تھی۔ اس کے علاوہ چٹائیوں' بانسوں' لکڑی اور موٹے گتے سے بنے ہوئے دو کمرے اور بھی تھے۔ اینٹوں والا کمرہ ابا اور اماں کا تھا۔ دونوں کچے کمروں میں سے ایک کمرے میں دادی رہتی تھیں اور اس کمرے میں انہی کے ساتھ فیضو رہتا تھا۔ تیسرے کمرے میں جو پہلے دونوں کمروں سے چھوٹا تھا' گھر کا بہت سا ساز و سامان رکھا ہوا تھا' جس میں ٹین کے بکسوں اور ٹین کے کنستروں کے علاوہ اور بھی ایسی بہت سی چیزیں شامل تھیں جن کا مصرف فیضو کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا تھا لیکن وہ چیزیں وہاں رکھی ہوئی تھیں' کیونکہ وہ اس گھر کے سب لوگوں کو عزیز تھیں اور کوئی بھی ان کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان میں کچھ تانبے کے برتن بھی شامل تھے جو اب بالکل سیاہ ہو چکے تھے اور فیضو نے انہیں کبھی استعمال میں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اماں کہتی تھیں کہ تانبے کے برتن ان کے جہیز کے ہیں اور بہت قیمتی ہیں لیکن فیضو کو ان بدشکل' بدرنگ اور بدوضع برتنوں میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی تھی۔

جھگی میں ایک ٹوٹا پھوٹا سا دروازہ بھی لگا ہوا تھا جو سارا دن کھلا رہتا تھا کیونکہ دادی تو زیادہ تر گھر میں ہی رہتی تھیں۔ البتہ دروازے پر ٹاٹ کا ایک پردہ ضرور پڑا رہتا تھا جو اس گھر کے مکینوں کو بے پردگی سے بچاتا تھا۔

فیضو گھر کے اندر داخل ہوا اور سیدھا اس کمرے کی طرف بڑھا جو اس کے ابا اماں کا تھا۔ وہ ابھی چھوٹے صحن میں ہی تھا کہ اس نے دادی کے کمرے سے کسی کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ کوئی عورت دادی سے باتیں کر رہی تھی۔ فیضو نے اس عورت کی آواز فوراً پہچان لی۔ وہ زمردی خالہ تھیں' بوڑھی' تقریباً دادی کی ہم عمر..... اور سب ہی لوگ خواہ زمردی خالہ کے ساتھ ان کی عمر کا تناسب کچھ ہی کیوں نہ ہو' انہیں زمردی خالہ ہی کہتے تھے۔ چنانچہ فیضو بھی انہیں زمردی خالہ کہتا تھا اور فیضو کی اماں ابا بھی انہیں زمردی خالہ کہتے تھے۔ البتہ دادی انہیں خلیل کی ماں کہتی تھیں اور وہ خود دادی کو کبھی تو ''فیضو کی دادی'' اور کبھی ''فخرن بہن'' کہتی تھیں۔

''اے میں کہتی ہوں فخرن بہن' فیضو ماشاءاللہ اب اتنا بڑا ہو گیا ہے۔'' زمردی خالہ کی آواز بلند سرگوشی کی طرح پھنسی پھنسی اور سنسناتی ہوئی سی تھی۔ ''اے افسری نے کیا بالکل مہر لگا کر رکھ دی ہے۔ لے دے کے ایک ہی بیٹا..... اے لوگوں کے گھروں میں دیکھو..... آنگن میں ڈھیروں بچے کھیلتے نظر آتے ہیں۔ بچے زیادہ ہوں تو گھر میں برکت بھی زیادہ ہوتی ہے۔''

''اے کیا کروں خلیل کی ماں۔'' دادی کی آواز بھی زمردی خالہ کی آواز کی طرح بلند نہیں تھی۔ ''سب قدرت کے کھیل ہیں۔ ایک بیٹا دینے کے بعد قدرت نے جیسے منہ پھیر لیا۔ اے ہم نے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ کہاں کہاں حاضریاں نہیں دیں۔ کیسے کیسے پہنچے ہوئے عالموں اور فقیروں کی جوتیاں سیدھی نہیں کیں۔ دوا علاج بھی کروا کے دیکھا' مگر کچھ نہیں ہوا۔ گنتی ایک سے آگے کی طرف بڑھی ہی نہیں..... اور اب بھلا کیا بڑھے گی۔ شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا..... پہلے بچے کی پیدائش کے بعد اتنے سال گزر گئے۔''

''یہ نہ کہو فیضو کی دادی۔'' زمردی خالہ نے کہا۔ ''اے اللہ بخشے ہماری چچیا ساس تھیں' سدو چچی' ان کے ایک بیٹا تو ان کی شادی کے دو سال بعد پیدا ہوا تھا اور پھر دوسرا بیٹا پورے پندرہ برس کے بعد پیدا ہوا۔ اس دوران سلطان چچا نے دوسری شادی کر لی تھی اور ہماری دوسری چچی جان کے پانچ بچے ہو چکے تھے۔ سدو چچی تو اپنے آپ کو سوکھا درخت سمجھ کر سچ مچ سوکھ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں لیکن پھر جانے کیسے خدا کی رحمت کو جوش آ گیا اور سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ اے وہ تو جیسے پھر سے جوان ہو گئیں۔''

''سچ پوچھو تو خلیل کی ماں ہماری بہو کو اس بات کی کوئی خاص فکر بھی نہیں ہے۔'' دادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''جب تک ہندوستان میں تھے تو افسری کئی کئی مہینوں کے لیے اپنے میکے چلی جاتی تھیں۔ ڈھیروں بہن بھائی تھے ان کے..... بس انہی لوگوں میں مگن رہتی تھیں اور امدو بے چارہ تو سدا کا اللہ میاں کی گائے رہا ہے۔ فیضو کی ساری دیکھ بھال ہم ہی کرتے رہے ہیں اور جب سے ہم یہاں آئے ہیں تو بھیا' یہاں تو دنیا ہی بدل گئی۔ یہاں تو آ کر لوگوں کے دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔ غضب خدا کا' جوان جہان لڑکیاں اسکول جا رہی ہیں۔ کالج جا رہی ہیں' نوکریاں کر رہی ہیں' فیکٹریوں میں جا رہی ہیں۔ اے پاکستان کیا بنا سب نے بے غیرتی پر کمر باندھ لی۔ مردوں نے عورتوں کو بے نتھے بیل کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ جو جی چاہے کرتی پھریں۔ اچھی آزادی ملی ہے..... واہ بھئی واہ.....''

دادی بولے جا رہی تھیں اور گھر میں داخل ہو جانے والے فیضو نے دونوں بڑھیوں کے

درمیان اب تک ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی۔ وہ دونوں ابھی تک فیضو کے گھر میں آ جانے سے بے خبر تھیں اور بڑی محویت کے ساتھ اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ فیضو کھلے ہوئے دروازے سے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر آ چکا تھا اور پھر وہ اماں کے کمرے میں گھس گیا۔ اسے اس اکنی کی تلاش تھی جو صبح اسکول جانے سے پہلے اماں نے اس کو دی تھی' لیکن پھر وہ اسے اپنی جیب میں نہیں ملی۔ وہ شاید اماں کے کمرے میں ہی کہیں گر گئی ہو..... فیضو اماں کے کمرے میں اکنی ڈھونڈ رہا تھا اور ساتھ ہی دونوں بڑھیوں کی باتیں سنتا جا رہا تھا۔ جن میں اس کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے اور اس کا کوئی بھائی بہن نہیں ہے اور دادی اس بات پر اماں سے ہمیشہ ناخوش رہتی تھیں کہ ان کے کوئی اور اولاد کیوں نہیں ہوئی۔ دادی کو اس بات کا ہمیشہ سخت ملال رہتا تھا کہ اوروں کے گھروں میں تو بچوں کی ریل پیل ہے لیکن ان کے گھر میں بس ایک ہی بچہ ہے اور وہ اور زمردی خالہ اس مسئلے پر آپس میں اکثر باتیں کرتی تھیں لیکن ہمیشہ اماں کی عدم موجودگی میں..... اماں کو تو اس قسم کی باتیں بالکل ہی پسند نہیں تھیں۔

اکنی نہیں ملی اور فیضو کو اس قیمتی خزانے کے گم ہو جانے کا بہت افسوس ہوا۔ اس نے اماں کے کمرے میں ان ساری جگہوں کو دیکھ لیا جہاں اکنی کے گرنے کا امکان ہو سکتا تھا' لیکن اکنی نہیں ملی۔ ناچار وہ اماں کے کمرے سے باہر نکل آیا اور دادی کے کمرے میں داخل ہوا۔ تب دادی کو اس کی آمد کو علم ہوا۔ وہ اور زمردی خالہ اس وقت پڑوس میں ہونے والے ایک معاشقے کے بارے میں بڑے رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھیں اور ان کی آوازیں اور بھی ہلکی ہو گئی تھیں۔

''سلام زمردی خالہ!'' فیضو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور اپنے کپڑے کے تھیلے والے بستے کو لوہے کے ایک پرانے ٹرنک کے اوپر رکھ دیا۔ یہ بستہ رکھنے کی مستقل جگہ تھی اور یہی جگہ فیضو کے پڑھنے لکھنے کی بھی تھی۔ وہ نیچے فرش پر بیٹھ جاتا اور کتاب یا کاپی کو ٹرنک کے اوپر رکھ لیتا یہ ٹرنک اس کے لیے میز کا کام دیتا تھا۔ اس طرح وہ گھنٹوں لکھنے پڑھنے کا کام کر سکتا تھا۔

''اے جیتے رہو بیٹا' جگ جگ جیو۔'' زمردی خالہ نے اس کے سلام کے جواب میں اسے ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں۔

''ہاتھ منہ دھو لو۔'' دادی نے اس سے کہا۔ ''ہم کھانا گرم کر دیتے ہیں۔''

''اچھا' بھئی اب ہم تو چلتے ہیں۔'' زمردی خالہ نے پلنگ سے پیر نیچے اتارتے ہوئے

کہا۔ ''اب تم فیضو کو کھانا دو..... خود بھی کھانا کھاؤ۔ ہم بھی ذرا جا کر کمر ٹکا لیں گے۔ یہ موت پیٹا کمر کا درد تو چین ہی نہیں لینے دیتا۔ زیادہ دیر تک بیٹھے رہو تو کمر جیسے تختہ ہو جاتی ہے۔''

زمردی خالہ چلی گئیں اور فیضو ہاتھ منہ دھو کر باورچی خانے میں آ بیٹھا۔ کپڑے بدلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گھر کے اور اسکول کے کپڑے کوئی الگ الگ نہیں تھے۔ بس ایک بار جو کپڑے پہن لیے تو پھر تقریباً ہفتے بھر تک وہی کپڑے چلتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل میلے ہو جاتے تھے' پھر انہیں اتار کر دوسرا جوڑا پہن لیا جاتا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران دادی نے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ بھوری کو جن پانچ انڈوں پر بٹھایا گیا تھا' ان میں سے دو میں سے آج صبح چوزے نکل آئے اور باقی تین میں سے دو انڈوں میں کھٹک لگ گئی ہے۔ شاید ان میں سے بھی کل تک چوزے نکل آئیں۔ گھر میں کئی مرغیاں پلی ہوئی تھیں اور ان کی وجہ سے گھر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں مرغیوں کی بیٹ نظر نہ آتی ہو' لیکن یہ سب کچھ اس قدر قدرتی اور اس قدر عام معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی زندگی کا ایک طے شدہ حصہ بنا ہوا تھا اور اس سے انہیں کسی طرح کی کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد فیضو نے بڑے شوق اور چاہت کے ساتھ ان چوزوں کو دیکھا جو انڈوں میں سے نکل آئے تھے اور انہیں دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ چوزوں کا مطلب تھا گھر میں مرغیوں کی تعداد میں اضافہ اور مرغیوں کی تعداد میں اضافے کا مطلب تھا مفت میں ملنے والے انڈوں کی تعداد میں اضافہ۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ اپنا بستہ اٹھا کر ماسٹر راشد زبیری کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ماسٹر راشد زبیری ایک بوڑھے آدمی تھے اور ہندوستان کے شہر کان پور کے کسی اسکول میں پڑھاتے رہے تھے۔ ان کے ریٹائرمنٹ کو ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ پھر وہ اپنے بڑے بیٹے اور اس کی بیوی بچوں کے ساتھ کراچی آ گئے۔ ان کی بہو تو ان کو ساتھ لانے کے حق میں نہیں تھی لیکن بیٹے نے اس کو سمجھایا کہ نئے شہر اور نئے ملک میں نہ جانے کیسے حالات ہوں۔ بچوں کا ساتھ ہے' دکھ' بیماری' اونچ نیچ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ابا ساتھ ہوں گے تو گھر کے باہر کے اور بہت سے کاموں میں ان کی مدد مل جائے گی۔ بیوی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور ماسٹر راشد زبیری ان لوگوں کے ساتھ کراچی آ گئے۔ ان کے بیٹے کو تو اس کے ایک سالے کے ساتھ' جو پہلے سے کراچی میں موجود تھا' اس کے فلیٹ میں رہنے کی جگہ مل گئی تھی لیکن یہ فلیٹ بہت چھوٹا تھا اور اس میں اتنے آدمیوں کی جگہ نہیں تھی۔ دوسرا فلیٹ لینے کی فی الحال گنجائش نہیں تھی۔ جلد ہی ماسٹر راشد کو بیٹے اور بہو کے بدلے ہوئے تیوروں کا احساس ہو گیا اور ان پر

پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ وہ تو محض ایک مدِ فاضل بن کر رہ گئے ہیں۔ بیٹے اور بہو کو ان کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ وہ اب زیادہ بھاگ دوڑ کے قابل نہیں رہے تھے۔ کراچی کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آتی تھی۔ تھوڑا سا چلتے تھے یا اٹھا دھری کا کام کرتے تھے تو سانس پھولنے لگتا تھا۔

ماسٹر راشد نے بہو کا گھر چھوڑ دیا۔ ان کے ایک پرانے شاگرد نے ان کی مدد کی اور انہیں گجر نالے میں دو کمروں کا ایک نیم پختہ مکان فراہم کر دیا جس کی چھتوں پر ٹین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ ماسٹر راشد یہاں آباد ہو گئے اور انہوں نے ایک کمرے میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھانے کا کام شروع کر دیا۔

بستی میں بچوں کی ریل پیل تھی۔ ایک ایک گھر میں جیسے بچے ابلے پڑے تھے' لیکن اسکول جانے والے بچوں کی تعداد بہت کم تھی۔ زیادہ تر لڑکوں کو ذرا بڑا ہوتے ہی ان کے گھر والے کسی نہ کسی کام پر بٹھا دیتے تھے تاکہ وہ کچھ ہنر بھی سیکھیں اور گھر کی آمدنی میں اضافہ بھی کر سکیں۔ اسکول جانے والی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے بھی کم تھی لیکن اس رجحان میں بتدریج تبدیلی نمودار ہو رہی تھی۔ غریب ترین' محنت کش خاندانوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ بچوں کو پڑھانا چاہیے۔

ماسٹر راشد کو تھوڑے بہت شاگرد مل ہی گئے تھے جنہیں وہ بہت معمولی فیس پر پڑھایا کرتے تھے۔ انہیں جو کچھ مل جاتا تھا وہی غنیمت تھا۔ دام نقد تھے۔ بس کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیتے تھے۔ وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو پڑھاتے تھے۔ پہلے لڑکیوں کی کلاس ہوتی تھی اور اس کے بعد لڑکوں کی۔

فیضو بہت ذہین لڑکا تھا۔ اس کو لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ سے بہت دلچسپی رہی تھی۔ ابا تو تقریباً اَن پڑھ تھے لیکن اماں نے سات جماعتوں تک پڑھا تھا اور وہ اُردو خوب اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ اماں کہا کرتی تھیں کہ انہیں تو آگے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن ان کے نانا نے ان کو اسکول سے اٹھا لیا کیونکہ وہ بڑی ہو گئی تھیں اور انہیں اسکول نہیں بھیجا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں خاندان کی رسوائی تھی۔

دادی کو اس بات کا بڑا شدید احساس تھا کہ ان کا بیٹا تو جاہل کا لٹھ ہے' جبکہ ان کی بہو پڑھی لکھی ہے اور اس لیے وہ دل و جان سے چاہتی تھیں کہ ان کا پوتا لکھ پڑھ لے تاکہ کل کو اسے اپنی بیوی کے آگے سر نہ جھکانا پڑے۔

اماں بھی چاہتی تھیں کہ وہ پڑھے لکھے اور اس کی تعلیم کا سلسلہ تو چھوٹی عمر سے ہی

ہندوستان میں شروع ہوگیا تھا۔ کراچی آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ دادی نے اسے ماسٹر راشد کے پاس بھی پڑھنے کے لیے بٹھا دیا تھا۔ ماسٹر صاحب اس سے بہت خوش تھے۔ فیضو لکھنے پڑھنے میں صرف تیز ہی نہیں تھا بلکہ اس کے اندر علم کی جستجو بھی تھی۔ وہ سیکھنا چاہتا تھا' نئی نئی باتیں جاننا چاہتا تھا۔

فیضو جب ماسٹر راشد کے گھر پہنچا تو اس وقت کچھ لڑکیاں وہاں سے اپنی پڑھائی ختم کر کے باہر نکل رہی تھیں۔ ان میں شوکت حسین سبزی فروش کی دونوں بڑی بیٹیاں شاکرہ اور مسعودہ بھی شامل تھیں۔ شوکت حسین کی یہ دونوں بیٹیاں اسکول بھی جاتی تھیں اور ماسٹر راشد کے پاس بھی پڑھنے کے لیے آتی تھیں۔

فیضو ان کو دیکھ کر رک گیا اور مسعودہ اور شاکرہ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے پاس ایک بہت اچھی اور اہم خبر تھی جسے وہ ان دونوں کو اور خاص طور سے شاکرہ کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کی زیادہ دوستی تو شاکرہ سے ہی تھی۔ اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں انہیں یہ اطلاع دی کہ اس کے گھر میں مرغی کے دو چوزے نکل آئے ہیں اور مزید انڈوں کو کھٹک لگ گئی ہے۔

''تو پھر آج ہی ان میں سے بھی بچے نکل آئیں گے۔'' شاکرہ نے اس کی خوشی میں شریک ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہم آئیں گے تمہارے گھر چوزے دیکھنے۔''

''کل آنا۔'' فیضو نے کہا۔ ''کل تک سارے چوزے نکل آئیں گے۔''

دونوں لڑکیاں چلی گئیں اور فیضو ماسٹر راشد کے گھر میں داخل ہوگیا۔ کچھ لڑکے اور بھی آگئے تھے اور پھر پڑھائی شروع ہوگئی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد فیضو واپس گھر پہنچا۔ اماں حسبِ معمول ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں اور ابا کا تو ہمیشہ کی طرح کوئی پتہ نہیں تھا۔ گھر میں دادی اکیلی تھیں۔ فیضو کچھ دیر تک گھر میں رہا پھر باہر نکل گیا اور لڑکوں کے ساتھ کھیل کود کر جب دوبارہ گھر واپس آیا تو اسی وقت اماں بھی گھر آگئیں۔

گھر میں داخل ہو کر انہوں نے برقع اتار کر ایک طرف پھینکا' جس کو پہننے کے باوجود وہ اپنا چہرہ ہمیشہ کھلا رکھتی تھیں' پرس کو ایک طرف اچھالا اور پھر اپنے پلنگ کے قریب پڑی ہوئی واحد کرسی پر دھم سے بیٹھ گئیں۔

''آج بڑی دیر کر دی افسری۔'' دادی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کیا کروں اماں.....'' اماں کے لہجے میں بیزاری اور جھلاہٹ تھی۔ ''نوکری تو نوکری

ہے اور پھر..... بسوں کی حالت تو دیکھو اماں..... دو' دو بسیں بدل کر جانا اور آنا پڑتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح لوگ بھرے ہوتے ہیں بسوں میں۔''

فیضو کے پاس دو اہم خبریں تھیں جن کے بارے میں وہ اماں سے فوری بات کرنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے تو وہ اماں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ صبح کو جو اکنی انہوں نے اسے دی تھی وہ کہیں گم ہوگئی تھی اور دوسری خبر اسے انڈوں سے چوزوں کے نکل آنے کے بارے میں دینی تھی۔

لیکن اماں نے مرغی کے چوزوں کے بارے میں خبر سن کر کسی خوشی یا گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ اکنی کے گم ہوجانے کے بارے میں انہوں نے فیضو سے کہا وہ کل صبح اسے ایک اور اکنی دے دیں گی اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کہ وہ اس کو سنبھال کر اپنے پاس رکھے اور اس بار اسے گم نہ کر دے۔

دادی نے چائے بنائی اور سب لوگوں نے چائے پی۔ چائے پینے کے بعد اماں لیٹ گئیں اور کافی دیر تک آرام کرتی رہیں۔ پھر وہ اٹھیں اور باورچی خانے میں جا کر دادی کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ بستی کی جھگیوں اور کچے پکے مکانوں میں مٹی کے تیل کی لالٹینیں' لیمپ اور کپیاں وغیرہ روشن ہو چکی تھیں۔ اس بستی کے در و دیوار بجلی سے ناآشنا تھے۔ شام ہوتے ہی یہاں چاروں طرف گھپ اندھیرا پھیل جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا کا وجود ہی ختم ہوگیا ہے۔ گلیاں گہری تاریکی میں ڈوب جاتی تھیں۔ البتہ مکانوں میں مٹی کے تیل کے چراغوں کی مریل اور نیم جاں روشنی مکینوں کو تھوڑی بہت راحت فراہم کر دیتی تھی۔ گھپ اندھیرے میں جگہ جگہ روشنی کی ننھی ننھی' خوفزدہ' تھرتھراتی ہوئی بوندیں سی نظر آتی تھیں اور ان کے ساتھ آوازوں کا ہلکا ہلکا شور' پھر جیسے جیسے رات ڈھلتی تھی ویسے ویسے روشنی کی سہمی ہوئی ناتواں بوندیں بھی ایک ایک کر کے غائب ہو جاتی تھیں اور ان کے ساتھ ہی آوازوں کا شور بھی کم ہو جاتا تھا' یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا تھا جب ساری بستی ایک ایسی غیر معمولی خاموشی اور ایسے پُراسرار اندھیرے میں ڈوب جاتی تھی جیسے زندگی سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا ہو..... لیکن پھر جب صبح کی پہلی کرن نمودار ہوتی تھی تو یہ ٹوٹا ہوا رشتہ ایک بار پھر جڑ جاتا تھا۔

اماں کچھ دیر تک دادی کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف رہنے کے بعد وہاں سے نکل کر باہر آگئی تھیں اور لالٹین کے قریب بیٹھ کر کوئی کپڑا سی رہی تھیں۔ اسی وقت ٹاٹ کے پردے کو جنبش ہوئی اور ابا گھر میں داخل ہوئے۔ میلے کچیلے کپڑوں میں بڑھی ہوئی داڑھی اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ روز کی طرح ایک اول جلول شے لگ رہے تھے۔ انہوں

نے گھر میں گھس کر نیم تاریک گھر میں چاروں طرف ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اماں نے ان کی طرف یا انہوں نے اماں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر کوئی جذبہ نہیں جاگا تھا۔ ایسا کم ہوتا تھا کہ ابا رات کو جلدی گھر آجائیں۔

تھوڑی دیر بعد کھانا نکال دیا گیا۔ انہوں نے پلنگ پر رکھے ہوئے کھانے پر ایک نظر ڈالی اور پھر قدرے ناگوار لہجے میں اماں سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''کیا ہے یہ؟ کیا پکا ہے؟''

''کدو کی ترکاری۔'' اماں نے سپاٹ اور خشک لہجے میں جواب دیا۔

''کدو کی ترکاری؟'' ابا نے برا سا منہ بناتے ہوئے سخت بیزاری اور برہمی کے عالم میں کہا۔ ''جب دیکھو کدو کی ترکاری..... جب دیکھو کدو کی ترکاری..... کیا اس گھر میں کدو کی ترکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں پک سکتا۔''

''ہم نے نہیں پکائی ہے۔'' اماں نے تڑخ کر بلند آواز سے جواب دیا۔ ''تمہاری اماں نے پکائی ہے' انہی سے پوچھو.....''

''اے بھیا تو ہم کیا کرتے؟'' دادی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''جتنے پیسے ہوں گے' اُنہی میں سے پکانا رینڈھنا ہوگا ہم اور پیسے کہاں سے لائیں؟''

''کتنے دن ہو گئے' گوشت تو پکا ہی نہیں اس گھر میں۔'' ابا نے ترش رُوئی کے ساتھ کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بازار میں گوشت ملنا ہی بند ہو گیا ہے۔''

''ارے اچھے کھانے کا ایسا ہی شوق ہے تو کچھ ہتھیا پیرا بھی ہلایا کرو۔'' اماں نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ''ہماری ہڈیوں میں اتنا بوتا نہیں کہ تمہاری فرمائشیں پوری کر سکیں۔ صبح سے شام تک اپنی جان پیلتے ہیں تو چار پیسے ہاتھ میں آتے ہیں اور پیٹ کو ٹکڑا ملتا ہے۔ ہماری طرف سے تم قورمے پکواؤ' پلاؤ پکواؤ..... مگر اس کے لیے پیسہ چاہئے۔''

''بس شروع کر دی تم نے اپنی بکواس.....'' ابا گرجے۔ ''آدمی کھانا بھی چین سے نہیں کھا سکتا اس گھر میں..... ایک زبان میں ستر باتیں کہتی ہو۔''

''ارے کیوں نہ کہیں بھیا۔'' دادی نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے اور قہر آلود نظروں سے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹکڑا دیتی ہیں پیٹ کو ان کا یہ احسان کیا کچھ کم ہے؟ اور تم جب تک کوئی کام دھندا نہیں کرو گے' اس وقت تک اسی طرح جورو کی جوتیاں کھاتے رہو گے۔''

''ہم کسی کو جوتیاں نہیں مار رہے ہیں اماں۔'' اماں نے آنکھیں نکال کر دادی کو گھورتے

ہوئے کہا۔ ''ہم سے نہیں سنے جاتے یہ وقت بے وقت کے طعنے۔ ہم تو اس گھڑی کو روتے ہیں جب ان کے ساتھ ہمارے دو بول پڑھوائے گئے تھے۔ کون سا سکھ مل گیا ہم کو شادی کے بعد۔ اب تک تو بس روتے جھینکتے ہی گزر رہی ہے۔ آگے کی خدا جانے.....''

اور پھر ایک زور دار جنگ شروع ہو گئی' جس کے تین فریق تھے۔ اماں' ابا اور دادی..... لیکن شاید بنیادی طور پر دو ہی فریق تھے۔ ابا اور دادی مل کر عام طور سے ایک ہی فریق بن جاتے تھے لیکن دادی کی مجبوری یہ تھی کہ وہ زیادہ کھل کر ابا کی حمایت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اماں اور ان کے کام میں دس طرح کے کیڑے تو نکال سکتی تھیں لیکن وہ ابا کی شان میں کوئی قصیدہ بھی نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ کیونکہ ابا کے اندر کوئی ایسی خوبی نہیں تھی کہ جو کسی کو ان کی قصیدہ خوانی کا معمولی سا بھی جواز فراہم کرتی ہو۔

فیضو نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' تب سے اس گھر کے معاملات کو ایسا ہی پایا تھا۔

ابا نکھٹو تھے..... اور صرف نکھٹو ہی نہیں تھے' بلکہ جوئے وغیرہ کا شوق بھی رکھتے تھے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتے تھے اور گھر چلانے کی پوری ذمہ داری اماں کی تھی جو سائٹ ایریا کی ایک فیکٹری میں کام کرتی تھیں۔ جب سب لوگ ہندوستان میں رہتے تھے' تب بھی ابا کچھ نہیں کرتے تھے لیکن تب اماں کچھ نہیں کرتی تھیں' کیونکہ حالات بہت مختلف تھے۔ لکھنؤ کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے بہرائچ میں ایک بہت بڑا سا گھر تھا' جس میں بہت سارے لوگ رہتے تھے۔ دادا' دادی تھے' دو چچا تھے' چچیاں تھیں' ان کے بچے تھے' خاندان کی زمینیں تھیں جن سے پیسہ آتا تھا۔ کچھ شہری جائیداد بھی تھی' جس کا کرایہ مل جاتا تھا' دادا اور دونوں چچا زمین اور جائیداد وغیرہ کے کاموں میں مصروف رہتے تھے لیکن ابا صرف عیش کرتے تھے۔ انہیں کسی بھی کام سے کوئی رغبت نہیں تھی دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا' تاش اور شطرنج کی بازیاں جمانا ان کے محبوب مشاغل تھے۔ گھر چل رہا تھا' کیونکہ مشترکہ خاندان تھا۔ ابا کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ پیسہ کس طرح آ رہا ہے۔ وہ تو اس بات میں مگن تھے کہ آرام سے گزر رہی تھی جوئے کا شوق بھی پورا ہو جاتا تھا۔ ان کا اکلوتا بیٹا فیضو اسکول جاتا تھا اور باقی ساری ضروریات بھی پوری ہو جاتی تھیں۔ انہیں کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔

پھر ایک دن اچانک دادا مر گئے۔ ان کی ناگہانی موت سے تو گھر کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا۔ دونوں چچاؤں نے پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا اور خاموشی سے جائیداد بیچنی شروع کر دی۔ ابا کو تو اس وقت ہوش آیا جب سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

بھائیوں نے کچھ تھوڑے سے پیسے ابا کو دے دیئے۔ بڑا سا آبائی مکان بھی خالی کرنا

پڑا.....سب کچھ بک چکا تھا۔

پھر سب لوگ پاکستان آ گئے۔ چچاؤں کے پاس پیسہ تھا انہوں نے جلد ہی اپنا اپنا کام دھندا شروع کر دیا۔ پھر ایک چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ دادی انہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ چچا کے انتقال کے بعد ان لوگوں نے دادی کو ساتھ رکھنے سے معذرت کر لی اور دادی ابا کے حصے میں آ گئیں' کیونکہ دوسرے چچا اپنے خاندان والوں کے ساتھ میر پور خاص میں جا بسے تھے۔ جہاں انہوں نے زمینوں کا کچھ کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مشترکہ خاندان ختم ہو گیا اور ابا کے پاس جو پیسہ تھا وہ بھی ختم ہو گیا' رہنے کا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ یہاں گجر نالے میں ایک جھگی ڈال کر اس میں مقیم ہو گئے ہزاروں دوسرے خاندانوں کی طرح۔

کام دھندا ابا نہ پہلے کرتے تھے اور نہ اب وہ کوئی کام کرنا چاہتے تھے۔ پڑھے لکھے تو تھے نہیں۔ کئی جگہوں پر کچھ چھوٹے موٹے کام کرنے کی کوشش کی' لیکن کہیں وہ جم کر کام نہیں کر سکے۔ دو چار دن کے بعد ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے کام تو بہت سارے تھے اور کام کرنے والوں کی ضرورت بھی تھی' لیکن مشکل یہ تھی کہ ابا تو کام کرنا ہی نہیں چاہتے تھے اور پھر اوپر سے جُوئے کی لت..... جب تک ہندوستان میں تھے تو کام کئے بغیر ہی سب کچھ مل جاتا تھا مگر اب ایسا کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔

لیکن ابا نے تو کچھ بھی نہ کیا۔ پھر جب فاقوں کی نوبت آ گئی تو اماں نے گھر کو سنبھالا اور سب لوگوں کے پیٹ کو ٹکڑا دینے کے لیے انہوں نے نوکری کر لی۔

اماں ساتویں جماعت تک پڑھی ہوئی تھیں۔ پڑوس میں رہنے والی نصیرہ خالہ بیوہ تھیں اور ان کے تین بچے تھے۔ ان کے میاں 1947ء کے فسادات میں مارے گئے تھے۔ نصیرہ خالہ سائٹ ایریا کی ایک فیکٹری میں کام کرتی تھیں۔ یہ فیکٹری نئی نئی قائم ہوئی تھی اور یہاں درآمد شدہ پُرزے جوڑ کر سلائی مشینیں بنائی جاتی تھیں۔ فیکٹری میں کام بڑھ رہا تھا اور مزید کارکنوں کی ضرورت تھی۔ فیکٹری میں زیادہ تر عورتیں ہی کام کرتی تھیں' اس کے لیے پڑھا لکھا ہونے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

ایک دو ہفتے کی ٹریننگ کے بعد کام کرنا آ جاتا تھا۔ اماں کو نصیرہ خالہ کی مدد سے فیکٹری میں کام مل گیا اور انہوں نے فیکٹری جانا شروع کر دیا۔

دادی کو اماں کا نوکری کرنا بالکل پسند نہیں تھا اور وہ اس صورتِ حال سے بہت کُڑھتی تھیں' لیکن اس کا کوئی تدارک ان کے پاس نہیں تھا۔ ان کا بیٹا تو بالکل نکھٹو تھا اور پیٹ کو تو روٹی چاہئے..... اگر اماں نوکری نہ کرتیں تو گھر میں فاقے ہی ہوتے۔

تاہم دادی کا یہ اصرار تھا کہ اماں فیکٹری میں غیر مردوں کے ساتھ کام کرنے کی بجائے گھر پر ہی کچھ سلائی کڑھائی وغیرہ کا کام کریں تو زیادہ اچھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کام میں وہ خود بھی اماں کی تھوڑی بہت مدد کر سکتی ہیں لیکن اماں نے اس خیال کو قطعی طور پر مسترد کر دیا تھا۔

''تم اگر اپنے طور پر یہ کام کرنا چاہتی ہو اماں تو تھوڑا بہت کر لو۔'' اماں نے دادی سے کہا تھا۔ ''ہم نہیں کریں گے یہ کام..... خواہ مخواہ تیری میری خوشامد کرتے پھرو۔ فیکٹری میں تو لگا بندھا کام ہے' لگے بندھے پیسے ملتے ہیں' پیسے بڑھنے کی امید ہوتی ہے۔ یہ سلائی کے کپڑے لینے کے لیے تیری میری خوشامد سے تو ہزار درجہ بہتر ہے۔''

چنانچہ دادی کی مخالفت کے باوجود اماں نے فیکٹری کی نوکری جاری رکھی اور اب سارا گھر اماں کی تنخواہ ہی سے چلتا تھا۔ اماں فیکٹری میں کام کرتی تھیں تو گھر کا چولہا جلتا تھا' مگر اماں کا فیکٹری میں کام کرنا ابا کو بھی پسند نہیں تھا۔ وہ بھی اس بارے میں اپنی اماں کے ہم نوا تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اماں فیکٹری میں کام کرنے کی بجائے گھر میں ہی بیٹھ کر کچھ سلائی کڑھائی وغیرہ کا کام کریں اور اسی سے گھر کا خرچہ چلائیں۔ اس معاملے میں دونوں اماں بیٹے ایک دوسرے کے ساتھ تھے لیکن اماں نے ان دونوں کو ہی مسترد کر دیا تھا۔

''ہمیں نصیحتیں کرنے اور مشورہ دینے کے بجائے کبھی اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کر دیکھو۔'' اماں نے ایک دن تنگ آ کر کہا۔ ''تم اگر کسی کام کے ہوتے تو ہمیں فیکٹری میں جا کر دھکے کھانے کا کیا شوق تھا..... مگر نہیں تمہیں تو ہمیشہ سے مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔''

جب تک سب لوگ ہندوستان میں رہتے تھے' تب تک گھر میں جھگڑے بھی نہیں ہوتے تھے' کیونکہ کھانے کو کافی تھا اور سب لوگ اپنی اپنی دھن میں مگن رہتے تھے۔ نہ تو اماں کو ابا کی کوئی فکر رہتی تھی اور نہ ابا اماں کی طرف سے کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے تھے۔ سب کی اپنی اپنی زندگی تھی' جو اپنے اپنے انداز میں بسر ہو رہی تھی۔

لیکن پاکستان آ کر سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔ اب پیسہ بھی نہیں تھا' کھانے کو بھی کم تھا اور زندہ رہنے کے لیے سخت جدوجہد کی ضرورت تھی۔ اس جدوجہد میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی ضرورت تھی لیکن وہ لوگ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے رہے تھے' بلکہ ان کے درمیان ایک مسلسل کشیدگی کی فضا قائم رہتی تھی جو برابر زیادہ سنگین ہوتی جا رہی تھی۔

فیضو نے کراچی آنے کے بعد اپنے گھر میں کشیدگی' کدورت اور لڑائی جھگڑے کی ہی

فضا پائی۔ اماں اور ابا میں مستقل جھگڑا رہتا تھا۔ اور دادی اور ابا کے درمیان بھی آئے دن تُو تُو مَیں مَیں اور بک بک' جھک جھک ہوتی رہتی تھی' گھر کی فضا میں مسرت کے لمحات تو کبھی آتے ہی نہیں تھے۔ صرف سکون کے لمحات بھی بہت مختصر ہوتے تھے۔

سوائے ابا کے صبح کو سب لوگ جلد ہی اٹھ جاتے تھے۔ اماں کو تیار ہو کر فیکٹری جانا ہوتا تھا فیضو کو اسکول جانا ہوتا تھا اور دادی کو ناشتے وغیرہ کی تیاری میں مدد دینی ہوتی تھی۔ صرف ابا ہی ایک ایسے شخص تھے جنہیں کوئی کام نہیں ہوتا تھا' چنانچہ انہیں صبح اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور وہ پڑے سوتے رہتے تھے۔ اماں فیکٹری چلی جاتیں' فیضو اسکول چلا جاتا اور ابا پڑے سوتے رہتے پھر وہ نہ جانے کب اٹھتے تھے۔ صرف چھٹی کے دن ہی اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت دن چڑھے سو کر اٹھتے تھے۔ دادی ان کو ناشتہ دیتیں اور وہ کھا پی کر گھر سے نکل جاتے۔ پھر رات گئے تک ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔

فیضو کے لیے گھر میں سکون کا سب سے زیادہ قیمتی وقت وہ ہوتا تھا جب وہ اسکول سے واپس آجاتا تھا اور دادی کے ساتھ گھر میں اکیلا ہوتا تھا۔ تب گھر میں کوئی جھگڑا نہیں ہو رہا ہوتا تھا پھر شام کو جب اماں آجاتیں تو کسی نہ کسی بات پر دادی اور اماں میں کوئی نہ کوئی لوٹ پوٹ ہوتی رہتی تھی۔ دادی کو اماں سے اس شکایت کے علاوہ کہ وہ مردوں کی طرح فیکٹری میں کام کرتی ہیں' یہ بھی شکایت تھی کہ انہوں نے بہت سے بچے کیوں نہیں جنے۔ ایک دن اماں نے غضب ناک ہو کر دادی سے کہا تھا۔ ''شکر کرو کہ ڈھیروں بچے نہیں ہیں' ورنہ تمہارا بیٹا تو سب کو بھیک منگواتا.....''

رات گئے جب ابا آجاتے تو گھر کی فضا اور بھی زیادہ مکدر ہو جاتی تھی' ایسا لگتا تھا کہ فضا میں تلخی کچھ اور زیادہ گھل گئی ہے اور مزاجوں میں برہمی اور بیزاری میں کچھ مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ فیضو سکون اور چاہت کی تلاش میں اس چھوٹے سے گھروندے کے کونوں کھدروں میں چھپتا پھرتا' لیکن اسے ایسا لگتا تھا جیسے یہاں ہر طرف ایک بے نام جھنجھلاہٹ اور کشیدگی کی حکمرانی ہے۔ اس گھر کے سب لوگ ایک دوسرے سے نامانوس اور اجنبی اجنبی لگتے تھے۔

ابا سے کوئی کچھ نہ پوچھتا کہ وہ سارا سارا دن کہاں واہی تباہی گھومتے پھرتے ہیں اور نہ وہ خود اس بارے میں کبھی کچھ بتانا ضروری سمجھتے تھے۔ بس سارا دن نہ جانے کہاں آوارہ گردی کرتے پھرتے تھے اور کبھی کوئی پیسہ دھیلا گھر میں لا کر نہیں دیتے تھے۔ الٹا دادی سے کچھ نہ کچھ جھٹک لیتے تھے۔

گھر کے ان تمام جھگڑوں میں فیضو کی حیثیت ایک خاموش تماشائی کی سی تھی' لیکن فی

الحقیقت وہ ایک خاموش تماشائی نہیں تھا۔ وہ اس فضا کا' اس ماحول کا ایک حصہ تھا اور یہ سب کچھ اس کے اندر ایک غیر محسوس تھکن اور لاشعوری شکستگی کو جنم دے رہا تھا جو آہستہ آہستہ اس کے وجود کے ایک ایک حصے میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ وہ جس گھر میں رہ رہا تھا وہاں محبت نہیں تھی۔ وہاں کے لوگ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ فیضو کے ساتھ ان میں سے کسی کا بھی رویہ نفرت پر مبنی نہیں تھا' لیکن گھر میں محبت کے عمومی فقدان کے باعث فیضو کو وہ محبت بے جان اور نیم مردہ معلوم ہوتی تھی جس کا اظہار ان لوگوں کی جانب سے اس کے لیے کیا جاتا تھا۔

فیضو کا نام فیضان علی تھا۔ اس کی عرفیت فیضو تھی۔ اس کے باپ کا نام احمد علی تھا اور اس کی عرفیت امدو تھی۔ اماں کا نام افسری خاتون تھا اور ان کی کوئی عرفیت نہیں تھی۔ دادی کا نام فخر النساء تھا اور ان کی عرفیت فخرن تھی لیکن ان کے نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ ان کی شناخت کے کئی دوسرے حوالے موجود تھے۔ کہیں وہ ''امدو کی ماں'' تھیں' کہیں وہ ''افسری کی ساس'' تھیں اور کہیں ''فیضو کی دادی'' تھیں۔

آنے جانے اور ملنے جلنے والوں میں زیادہ تر تو صرف بستی کے ہی گھروں کے لوگ تھے جن کو فیضو اچھی طرح سے جانتا تھا اور جو چند ایک رشتے دار بھولے بھٹکے کئی مہینوں میں چکر لگا لیتے تھے' انہیں بھی فیضو پہچانتا تھا۔

لیکن فیضو اس شخص کو بالکل نہیں پہچانتا تھا جسے اس نے اس روز اپنی ماں کے ساتھ دیکھا۔ اس نے اس خوبصورت اجنبی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس روز فیضو شام کے وقت گھوم کر اپنی بستی کی طرف آرہا تھا کہ اس نے بستی کے قریب ناظم آباد پٹرول پمپ کی طرف سے آنے والی بسوں کے اسٹاپ پر اماں کو بس سے اترتے دیکھا۔ وہ برقعے میں تھیں اور انہوں نے خلاف معمول اپنے چہرے کو آدھا چھپا رکھا تھا جبکہ وہ برقع اوڑھنے کے باوجود اپنے چہرے کو کبھی نہیں چھپاتی تھیں۔ ان کے ادھ کھلے چہرے سے فیضو نے ان کو فوراً پہچان لیا۔ اماں بس کے عورتوں والے حصے سے نیچے اتریں اور اسی وقت مردوں والے حصے میں سے اترنے والے آدمیوں میں سے ایک شخص ان کی طرف بڑھا۔ وہ اماں کے قریب آگیا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک ساتھ چل پڑے۔ اماں نے اب اپنے چہرے کو نقاب میں پوری طرح سے چھپا لیا تھا۔

فیضو نے اس شخص کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک دراز قد' گوری رنگت والا' خوبصورت جوان آدمی تھا۔ جس کے بال بہت گھنے اور سیاہ تھے۔ وہ اماں سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا اور

فیضو کو اس کی مسکراہٹ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ کوئی اجنبی تھا اور فیضو نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اماں کی نظر فیضو پر نہیں پڑی اور وہ اس آدمی کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ فیضو کو ابھی ایک اور دوست کے پاس جانا تھا' وہ وہاں سے دوسری طرف چلا گیا۔

کچھ دیر تک وہ اس آدمی کے بارے میں سوچتا رہا لیکن یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی' اماں تو فیکٹری میں کام کرتی تھیں' جہاں عورتوں کے علاوہ مرد بھی کام کرتے تھے۔ ایک بار نصیرہ خالہ فیکٹری کے سپروائزر کو لے کر اماں کے پاس آئی تھیں۔ اماں ان دنوں بیمار تھیں اور ان کا سپروائزر انہیں دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ دادی نے اس کے اور نصیرہ خالہ کے لیے چائے بنائی تھی۔

تقریباً آدھ پونے گھنٹے کے بعد جب فیضو واپس گھر آیا تو اس نے اماں کو گھر میں موجود پایا۔ وہ باورچی خانے میں دادی کے ساتھ کام کر رہی تھیں' جس کا مطلب تھا کہ انہیں آئے ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے اور اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہی تھیں۔ شاید اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی سیدھی گھر ہی آ گئی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد ابا بھی گھر آ گئے اور کھانا کھانے سے پہلے حسبِ معمول تناتنی کی کیفیت اور تھوڑی بہت تُو تُو' مَیں مَیں ہوتی رہی۔ اصل میں تو جھگڑے کے لیے کسی خاص اور ٹھوس وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ بس کسی چھوٹی موٹی بات پر کسی نہ کسی کی طرف سے جھگڑا شروع ہو جاتا تھا اور کچھ دیر کی بک بک' جھک جھک کے بعد خود ہی ختم ہو جاتا تھا لیکن ہر جھگڑے کے بعد فیضو کے اعصاب پر جو زخم لگ جاتے تھے۔ وہ اس کے وجود کا ایک حصہ بن جاتے تھے۔ فیضو اس خوبصورت اجنبی کو بالکل بھول گیا جسے اس نے اپنی ماں کے ساتھ دیکھا تھا۔ دوسری اور بہت سی باتیں تھیں جو اس کے دل و دماغ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا رہی تھیں۔ صبح تک اسے یہ بات یاد بھی نہیں رہی۔ نیا دن طلوع ہوا تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ابا اسی طرح پڑے سو رہے تھے' اماں فیکٹری جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ دادی ناشتہ تیار کر رہی تھیں اور وہ خود اپنا بستہ ٹھیک کر رہا تھا۔

''اماں۔'' اس نے اپنے کپڑے کے پرانے اور بوسیدہ تھیلے کو' جس پر روشنائی کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مجھے ایک بستہ لے دو اماں..... اسکول میں بہت سے بچوں کے پاس اچھے اچھے بستے ہیں۔ میرا یہ کپڑے کا تھیلا تو بہت ہی خراب لگتا ہے۔''

''لے دیں گے جب فالتو پیسے ہوں گے'' اماں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''اسکول میں جن بچوں کے پاس اچھے اچھے بستے ہیں' ان کے باپ کام کرتے ہیں' محنت کرتے ہیں تمہارے ابا کی طرح رات دن ڈنڈے نہیں بجایا کرتے۔''

فیضو کے دل پر ایک تازہ چوٹ لگی۔ کتنے ہی بچے اسکول میں پوچھتے تھے کہ اس کا باپ کیا کام کرتا ہے۔ اماں نے سچ ہی تو کہا تھا۔ ہر بچے کا باپ کوئی نہ کوئی کام کرتا تھا اور ہر بچے کو معلوم تھا کہ اس کا باپ کیا کام کرتا ہے لیکن فیضو کو اپنے باپ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

''اماں..... ابا اگر کوئی کام نہیں کرتے تو پھر وہ سارا دن کہاں غائب رہتے ہیں؟'' اس نے اپنی ماں سے پوچھا۔

''سارا دن؟ وہ سارا دن کب باہر رہتے ہیں؟'' اماں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''آدھے دن تک تو پڑے سوتے رہتے ہیں۔ پھر اٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں جو ان کی اماں اپنے لاڈلے کو دیتی ہیں اور پھر نہ جانے کہاں کہاں گھومنے پھرنے نکل جاتے ہیں۔ ساری عمر مفت کی روٹیاں توڑتے رہے ہیں اور اب بھی توڑ رہے ہیں۔''

''ارے چپ ہو جاؤ افسری چپ ہو جاؤ۔''

باورچی خانے کی طرف سے دادی کی احتجاجی آواز بلند ہوئی۔ ''صبح صبح خیر کا کلمہ منہ سے نکالا کرو۔ کیوں لونڈے کے دماغ میں باپ کے خلاف زہر بھرتی رہتی ہو؟''

''ہم تو نہ زہر بھر رہے ہیں نہ امرت اماں!'' اماں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''جو جیسا ہوگا ویسا ہی کہا جائے گا۔''

دادی آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑاتی رہیں اور فیضو ان کی آواز صاف طور پر نہیں سن سکا۔ اسے خود بھی تیار ہو کر اسکول جانے کی جلدی تھی۔ اسکول تو اس کے لیے گھر سے بھی بڑھ کر تھا۔

عام لڑکوں کے برعکس فیضو اسکول جانے سے جی نہیں چراتا تھا اور نہ اسے اسکول کی چھٹی سے غیر معمولی خوشی ہوتی تھی۔ اسے اسکول جانا اچھا لگتا تھا اور اسکول میں پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ اسکول میں وہ بہت کچھ سیکھتا تھا۔ نئی نئی باتیں' نئی نئی چیزیں۔

جب وہ کلاس روم میں بیٹھا ہوتا اور ماسٹر صاحب پڑھا رہے ہوتے تو اسے ایسا لگتا جیسے اس کے سامنے ایک بالکل نئی دنیا اپنے اسرار و رموز کو منکشف کر رہی ہے' وہ ایک نئے جہان کی اونچی اونچی دیواروں کو پھلانگ کر اس کے اندر داخل ہو رہا ہے اور ساری پابندیوں کو

توڑتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا گھر پر تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔وہی کڑوی کسیلی باتیں' وہی زہر میں بجھے ہوئے لہجے' وہی ٹیڑھی میڑھی اور بے مروت نظریں.....بھلا اس کے سوا کیا رکھا تھا گھر میں؟ اسے اسکول اچھا لگتا تھا۔ماسٹر راشد زبیری کے گھر جا کر ان سے پڑھنا اچھا لگتا تھا اور شوکت چچا کے گھر جانا اچھا لگتا تھا' جہاں شاکرہ تھی' جس سے باتیں کرنا اسے اچھا لگتا تھا.....گھر میں تو کسی سے بھی باتیں کرتے ہوئے اچھا نہیں لگتا تھا۔

اور پھر کسی کو اس سے دلچسپی بھی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے۔ابا کا ہونا نہ ہونا سب برابر تھا۔اماں شام کو تھکی ہاری آتیں تو دوسرے کاموں میں مصروف ہو جاتیں۔پھر اگلے دن کے لیے تیاری کرتیں اور جلدی لیٹ کر سو جاتیں۔فیضو کو سب سے زیادہ وقت دادی کے ساتھ گزارنے کا موقع ملتا تھا' مگر دادی کو عام طور سے کوئی نہ کوئی دوسری بڑھیا گھیرے رہتی تھی۔گھر سے اسے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔جبکہ اسکول سے اسے ایک نئی دنیا کا کھلتا ہوا دروازہ نظر آتا تھا۔وہ اس دروازے میں داخل ہو کر اس نئی دنیا میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔

ایک روز رات کے وقت گھر میں بڑے زور کا معرکہ ہوا۔چھوٹے موٹے معرکے تو ہوتے ہی رہتے تھے' لیکن اس دن کا معرکہ کچھ زیادہ ہی شدید ہو گیا۔ہوا یوں تھا کہ اماں نے دادی کو ابا کو کچھ پیسے دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اماں اس پر آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔وہ ابا کو کوئی پیسہ نہیں دیتی تھیں اور دادی کو بھی ان کی ہدایت تھی کہ گھر کے خرچے میں سے ابا کو کوئی پیسہ نہ دیا جائے لیکن ابا دادی سے کچھ نہ کچھ لے ہی لیتے تھے۔جس کی شاید اماں کو خبر نہیں ہوتی تھی یا اگر ہوتی بھی تھی تو وہ نظر انداز کر جاتی تھیں لیکن اس دن انہوں نے دادی کو ابا کو کچھ پیسے دیتے ہوئے دیکھ لیا اور دونوں ہی ماں بیٹوں کو خوب برا بھلا کہا۔دادی رونے لگیں۔

''ہاں ہاں' مار لو بھائی جوتے مار لو ہمیں۔'' دادی نے روتے ہوئے کہا۔''ہم تو ہیں ہی اسی قابل' ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ارے جب اپنا ہی سکہ کھوٹا ہو تو کسی دوسرے کو کیا دوش دیں؟ نہ یہ کم بخت نکما ہوتا اور نہ ہمیں اس کی خاطر ذلیل ہونا پڑتا۔''

''تمہیں کون ذلیل کر سکتا ہے اماں؟'' ابا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''آخر تم بھی تو اس گھر کے لیے اتنا کام کرتی ہو۔تمہارا بھی تو حق ہے اس پیسے پر.....اگر تم کام نہ کرو تو دیکھیں کیسے گھر چلتا ہے۔کون کرتا ہے سارے کام.....''

''ارے چپ رہو بے غیرت۔'' دادی نے روتے ہوئے کہا۔''میرا کلیجہ تو پک گیا ہے

طعنے سن سن کر.....اس سے تو مجھے موت ہی آ جائے تو اچھا ہے۔''

شور و غل کی آوازیں سن کر پڑوس کی کئی عورتیں گھر میں آ گئی تھیں اور انہوں نے مل جل کر معاملے کو رفع دفع کرایا۔اماں نے خاموشی اختیار کی۔دادی بھی روتے روتے چپ ہو گئیں اور ابا ذرا دیر کے لیے گھر سے باہر چلے گئے۔فیضو ایک عالمِ حیرت میں اس تماشے کو دیکھتا رہا۔اس کا جی چاہتا تھا کہ جس طرح ابا کہیں چلے گئے ہیں' اسی طرح وہ بھی نکل کر کہیں چلا جائے' لیکن وہ رات کے وقت کہاں جا سکتا تھا؟ اسکول تو بند تھا.....اور کسی دوست کے گھر یا شوکت چچا کے گھر بھی نہیں جا سکتا تھا۔وہاں تو سب لوگ سو چکے ہوں گے۔

شوکت چچا تو ایک پہر رات باقی ہوتی تھی تب ہی اٹھ جاتے تھے۔اسی عالم میں نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

آنے والے چند دنوں کے دوران گھر کی فضا بہت بوجھل رہی۔ابا نے اور بھی دیر سے آنا شروع کر دیا تھا۔وہ آنے کے بعد کھانا کھا کر سونے کے لیے چلے جاتے تھے اور کسی سے بہت کم بات چیت کرتے تھے۔دادی اور اماں میں بھی بس ضرورت بھر کی ہی بات چیت ہوتی تھی۔

اس واقعے کو کئی روز گزر چکے تھے۔اس روز جب فیضو حسب معمول صبح کے وقت بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ دادی گھر کے کھلے ہوئے دروازے کے پاس کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھیں۔فیضو عام طور سے اماں اور دادی کے اٹھنے کے ذرا دیر بعد ہی اٹھ جاتا تھا۔وہ سب جلدی اٹھ جاتے تھے صرف ابا تھے جو نہ جانے کب تک پڑے سوتے رہتے تھے۔

''یہ افسری صبح صبح کہاں نکل گئیں؟'' دادی نے فیضو کو اٹھ کر اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا۔''اتنی صبح کہاں گئیں؟''

''کیا اماں کہیں گئی ہیں؟'' فیضو نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''وہ گھر میں تو نہیں ہیں۔'' دادی نے جواب دیا۔''ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی کہیں نکل گئیں' مگر جائیں گی کہاں اتنی صبح؟ اور کس کام سے؟''

''شاید پڑوس میں کسی سے کچھ لینے گئی ہوں۔'' فیضو نے کہا۔پڑوسیوں کے ساتھ لین دین کا سلسلہ تو برابر چلتا ہی رہتا تھا۔

دادی کوئی جواب دیئے بغیر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور کام میں مصروف ہو گئیں۔فیضو بھی اپنی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

''ارے کہاں چلی گئیں؟'' اچانک باورچی خانے کی طرف سے دادی کی تیز آواز بلند ہوئی۔ ''اتنی دیر ہوگئی..... کیا آج فیکٹری نہیں جائیں گی؟'' اور اس کے ساتھ ہی دادی باورچی خانے سے نکل کر باہر آگئیں۔ ''میں ذرا دیکھوں تو..... کسی کے گھر میں تو نہیں رکی ہوئی ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی دادی نے اماں کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ جہاں ایک جھلنگے پلنگ پر میلے کچیلے بستر پر میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹے ہوئے ابا سوئے پڑے تھے۔

''اے ہے..... یہ کیا؟'' اچانک دادی کی زبان سے حیرت اور تشویش کے عالم میں یہ الفاظ ادا ہوئے اور وہ تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔

اس کمرے کے ایک کونے میں ایک لوہے کا ٹرنک رکھا رہتا تھا جس میں تالا پڑا رہتا تھا۔ اس کی چابی اماں کے پاس ہی ہوتی تھی۔ اس ٹرنک میں اماں کی چیزیں رہتی تھیں' ان کے کپڑے' تھوڑے بہت زیور جو ان کے پاس تھے اور پیسے' جو گھر میں موجود ہوتے تھے۔

اس ٹرنک کا ڈھکن اوپر اٹھا ہوا تھا اور ٹرنک کے آس پاس کچھ چیزیں بے ترتیبی کے عالم میں بکھری پڑی تھیں۔

دادی تیزی سے بھاگ کر ٹرنک کے پاس پہنچیں۔ فیضو بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

ٹرنک میں سے زیادہ تر کپڑے غائب تھے اور اس کا بڑا حصہ خالی نظر آرہا تھا۔ دادی اس میں ہاتھ ڈال کر جلدی جلدی کچھ ٹٹولنے لگیں اور جب ان کی مطلوبہ اشیاء ان کو نہیں ملیں تو وہ بری طرح چیخیں..... ''ارے لے گئی..... لے گئی..... سارے پیسے بھی لے گئی اور زیور بھی لے گئی..... ارے کچھ بھی نہیں چھوڑا منحوس ماری نے..... سارے اچھے اچھے کپڑے بھی لے گئی۔ خالی چیتھڑے چھوڑ گئی۔''

''کیا ہوا دادی؟'' فیضو نے سہم کر پوچھا۔

''چلی گئی تمہاری اماں۔'' دادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور ساتھ میں سارا سامان بھی لے گئی..... ارے کالک لگ گئی ہم سب کے منہ کو.....''

''کیا ہے؟'' بے خبر سوئے ابا نے نیند میں کسمساتے ہوئے کروٹ بدلی اور سخت ناگواری کے عالم میں آنکھیں کھول کر دادی کی طرف دیکھنے لگے جو ان کے بستر کے قریب کھڑی ہوئی شور مچا رہی تھیں۔ ''کیا صبح صبح شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے؟''

''ارے اٹھ جا بدنصیب اٹھ جا۔'' دادی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''کب تک موت کی نیند میں پڑا سوتا رہے گا ناس پیٹے؟ چلی گئی تیری جورو۔''

''کون چلی گئی؟'' ابا ہڑبڑا کر ایک دم اٹھ گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے

لگے۔ ان کی نظریں اماں کے کھلے ہوئے ٹرنک پر لگی ہوئی تھیں۔ ''کون چلی گئی؟ کہاں چلی گئی؟''

''ارے چلی گئی تمہاری جورو۔'' دادی نے زور زور سے روتے ہوئے کہا۔ ''اور جاتے جاتے سارے پیسے' زیور اور کپڑے بھی لیتی گئی' سارے گھر کا صفایا کر گئی منحوس..... ارے اسے ڈھائی گھڑی کی موت آئے..... بے غیرت بے حیا..... ارے یہ دن بھی دیکھنا لکھا تھا ہماری تقدیر میں.....''

''ارے' کچھ ٹھیک سے بتاؤ تو سہی اماں۔'' ابا نے پلنگ سے نیچے اترتے ہوئے ٹرنک کے پاس جا کر اس کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہوا؟ کس طرح ہوا؟'' ابا بے چینی کے عالم میں جلدی جلدی بول رہے تھے۔

''ارے بتانے کو کیا ہے کم بخت.....'' دادی نے زار زار روتے ہوئے کہا۔ ''ہم روز کی طرح اٹھے تو ہماری نظر دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا۔ ہم نے سمجھا کہ شاید افسری اٹھ کر کسی کام سے صبح صبح باہر گئی ہوں گی لیکن وہ اتنی صبح کہاں جاتیں؟ اتنی دیر ہوگئی اور وہ واپس نہیں آئیں۔ تب ہم نے اس کے کمرے میں آکر دیکھا تو یہاں یہ ماجرا نظر آیا کہ ٹرنک بھی کھلا پڑا ہے اور پیسے' زیور اور کپڑے بھی غائب ہیں' غضب ہوگیا.....''

''ہم خون پی جائیں گے اس کتیا کا.....'' ابا غضب ناک ہو کر دھاڑے۔ ''ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیں گے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔''

''ارے یہ سب تو تم تب کرو گے جب وہ تم کو ملے گی۔'' اماں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہارے سامنے آکر تو اپنی گردن تمہارے آگے نہیں کر دے گی کہ لو مجھے کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دو..... ارے پہلے اسے ڈھونڈو تو..... کیا وہ آسانی سے مل جائے گی..... اب تک تو نہ جانے کہاں ہوگی۔''

''جاتے ہیں۔'' ابا نے جلدی سے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی اپنی قمیص کو اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ صرف ایک پرانا پاجامہ اور بنیان پہن کر سو رہے تھے۔

اچانک وہ ٹھٹک گئے' جس کھونٹی پر ان کی قمیص ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کے برابر والی کھونٹی خالی تھی۔ اس کھونٹی پر اماں کا برقع ٹنگا رہتا تھا۔ فیکٹری سے واپس آنے کے بعد اگلی صبح کو فیکٹری جانے تک اماں کا سیاہ برقع' جس کا رنگ کئی جگہ سے اُڑ چکا تھا' اسی کھونٹی پر ٹنگا رہتا تھا۔ اماں فیکٹری سے واپس آنے کے بعد پڑوس میں اگر کہیں جاتی تھیں تو برقعے کے بغیر جاتی تھیں۔ بستی میں بے شمار عورتیں برقعے کے بغیر ہی گھومتی پھرتی تھیں۔ اماں بھی صرف

فیکٹری جاتے وقت برقع استعمال کرتی تھیں۔

''برقع بھی غائب ہے۔'' ابا نے خالی کھونٹی کو خالی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اپنی مرضی سے گئی ہیں۔ برقع اوڑھ کر.....''

''اے بھیا اپنی مرضی سے نہیں گئی ہیں تو کیا کوئی زبردستی اٹھا کر لے گیا ہے؟'' اماں نے تڑخ کر کہا۔ ''کوئی ننھا بچہ تو تھیں نہیں جو کوئی بغل میں دبا کر لے جاتا۔ ظاہر ہے اپنی مرضی سے گئی ہیں اور کپڑا لتا' زیور' پیسے ساتھ لے کر گئی ہیں۔ ہائے کم بخت نے معصوم بچے کا بھی خیال نہیں کیا ارے سارا کچھ بٹور کر لے گئی۔''

اسی اثناء میں ابا نے کھونٹی سے قمیص اتار کر گردن میں ڈال لی تھی اور وہ چپل پہن کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ فیضو بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ لیکن ابا نے پلٹ کر اسے ڈانٹا۔ ''تم کیوں آرہے ہو میری دُم کے پیچھے لگے لگے؟ جاؤ ادھر سے ..... گھر میں بیٹھو۔''

فیضو سہم کر رک گیا اور ابا باہر نکل گئے

اسی وقت گھر کے کھلے ہوئے دروازے میں سے زمردی خالہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں تجسس کی گہری چمک تھی اور چہرہ کسی سوالیہ نشان کی طرح ٹیڑھا ہو رہا تھا۔

''ارے کیا ہوا فخرن بہن؟'' انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''صبح ہی صبح تمہارے گھر میں اس قدر شور کیوں مچ رہا ہے؟ امد بھی اس قدر زور سے تیر کی طرح گھر سے نکل کر سنسناتے ہوئے گئے ہیں۔ افسری کہاں ہیں؟ کیا فیکٹری چلی گئیں؟''

''ارے آگ لگے افسری کو اور اس کی فیکٹری کو۔'' دادی نفرت کے عالم میں زور سے چلائیں۔ ''ارے گھر کا صفایا کر کے بھاگ گئی۔'' دادی زور زور سے رونے لگیں۔

''اے ہے خیر مانگو۔'' زمردی خالہ نے اپنی گہری دلچسپی اور تجسس کی مزہ لینے والی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے جلدی جانا ہو اور فیکٹری چلی گئی ہوں' تم لوگوں کو بتائے بغیر.....''

''ارے تو کیا زیور کپڑے اور پیسہ بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا؟'' دادی نے زور زور سے روتے ہوئے کہا۔ ''ارے وہ جھاڑو پھیر گئی گھر میں..... جو بھی جمع جتھا تھا' لے کر دفعان ہو گئی۔ ارے کتے کی آئی ہوا سے آجائے..... ارے سؤر کی آئی ہوا سے آجائے..... ارے ہیضہ بٹورے اسے.....''

''نا' نا..... فخرن بہن۔'' زمردی خالہ نے جلدی سے دادی کو روکتے ہوئے کہا۔ ''ایسی بری بری باتیں زبان سے نہ نکالو۔ اللہ جانے' اصل بات کیا ہے..... امد و باہر گئے ہیں۔ دیکھو کیا خبر لے کر آتے ہیں۔''

اسی وقت کچھ اور عورتیں بھی گھر میں آگئیں۔ دادی چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی تھیں۔ وہ اپنے سر کے بال نوچ رہی تھیں اور سر پر بھی دوہتڑ مار رہی تھیں' ساتھ ہی وہ اماں کو بے تحاشا گالیاں اور کوسنے دیئے جا رہی تھیں۔ ان کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز کسی دردناک نوحے کی طرح دور دور تک گونج رہی تھی۔

فیضو بری طرح سہما ہوا تھا۔ وہ کبھی اماں کے کمرے میں چلا جاتا اور ان کے خالی پلنگ پر بیٹھ کر اس ٹرنک کو دیکھتا جس کا منہ کھلا ہوا تھا اور کبھی اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا جہاں وہ دادی کے ساتھ رہتا تھا' لیکن اس پر سخت وحشت طاری تھی۔ اس کا ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لیے کسی طرح تیار ہی نہیں تھا کہ اماں گھر چھوڑ کر' اسے چھوڑ کر کہیں جا سکتی ہیں..... کیا واقعی وہ کہیں چلی گئی تھیں؟

کوئی دس بارہ دن پہلے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا جسے اس نے اس وقت بالکل غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اور اس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ آدمی..... وہ خوبصورت' دراز قد' گورا چٹا آدمی جس کے ساتھ اماں بس سے اتری تھیں اور اترنے کے بعد انہوں نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا لیا تھا وہ اجنبی کون تھا؟

جس بات پر فیضو نے اس وقت ٹھیک سے غور ہی نہیں کیا تھا اور اسے درخورِ اعتنا بھی نہیں سمجھا تھا' اس پر وہ اب گہرائی اور توجہ کے ساتھ غور کر رہا تھا۔ اماں نے بس سے اترنے کے بعد اس آدمی کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے چہرے پر نقاب کیوں ڈال لیا تھا؟ یقیناً وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی جاننے والا انہیں اس آدمی کے ساتھ چلتا ہوا دیکھ لے۔ وہ اس آدمی کے ساتھ اپنی واقفیت اور اپنی ملاقات کو پوشیدہ رکھنا چاہتی تھیں۔

فیضو اس وقت چھٹی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر کوئی گیارہ سال کی تھی اور یہ عمر ایسی نہیں تھی کہ وہ مرد عورت کی زندگی اور ان کے تعلقات کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو۔ وہ بہت کچھ جانتا تھا اور جس فضا میں' جس بستی میں وہ رہ رہا تھا' وہاں رات دن اس قسم کے درجنوں قصے سامنے آتے رہتے تھے۔ عورتیں آپس میں بیٹھ کر دوسری عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں بڑی بڑی رسوا کن باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایک دوسرے کے ایسے بگھان کرتی تھیں' کچھ ڈھکا چھپا چھوڑتی ہی نہیں تھیں۔ کس لڑکے کا کس لڑکی سے ''چکر'' چل

رہا ہے' کون سا مرد کس عورت کے پھیر میں ہے' یہ ساری باتیں کھل کر ہوتی تھیں جو بڑوں سے گزرتی ہوئی چھوٹوں کے کانوں میں بھی پڑتی تھیں۔ بستی میں کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں جو مشکوک چال چلن کی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی تھیں۔ بستی کے لوگوں کی گفتگو میں اور طور طریقوں میں بلا کی' بے ساختگی اور گستاخی کا عنصر غالب تھا اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی بڑوں کی باتیں سن کر وقت سے بہت پہلے ہی ان چیزوں سے واقف ہو جاتے تھے جو ان کی عمر کے ان دوسرے بچوں کو' جو کھاتے پیتے متوسط طبقے کی پکی بستیوں اور مکانوں میں رہتے تھے' اس عمر میں نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

دادی' اماں کو کوسنے اور بد دعائیں دینے کے علاوہ ننگی ننگی گالیاں بھی دے رہی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر گالیوں کے معانی و مفاہیم سے فیضو خوب واقف تھا۔ تاہم فیضو نے دادی کو بھی نہیں بتایا کہ اس نے اس روز اماں کو کسی اجنبی کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے اماں کے اس راز کی ہمیشہ حفاظت کی۔

فیضو کو اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے سال یامین مستری کی بڑی بیٹی نجو ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ محمود نامی وہ لڑکا نجو سے شادی کرنا چاہتا تھا اور نجو بھی اسے چاہتی تھی لیکن نجو کے دادا برادری کے عذاب میں مبتلا تھے۔ وہ اس بات پر اڑ گئے کہ ان کی پوتی کی شادی برادری سے باہر ہرگز نہیں ہوگی' تو پھر ہوا یوں کہ وہ بڑے میاں تو برادری کو کلیجے سے لگائے بیٹھے رہے اور نجو محمود کے ساتھ اُڑن چھو ہوگئی۔ ایک رات دونوں اپنے اپنے گھروں سے غائب ہوگئے۔ ساری بستی میں شور مچ گیا کہ نجو اور محمود بھاگ گئے ہیں۔ نجو کے ابا نے پولیس میں رپورٹ بھی نہیں لکھوائی۔ سب کو یقین تھا کہ نجو کو کوئی زبردستی بھگا کر نہیں لے گیا ہے بلکہ وہ اپنی مرضی سے ہی محمود کے ساتھ گئی ہوگی۔ نجو کے ابا پولیس میں رپورٹ لکھوا کر اور زیادہ بدنامی اور رسوائی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ جو کچھ ہوگیا تھا' وہی ان کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

کوئی پندرہ دن کے بعد نجو کے والدین کو اس کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اور محمود لاہور میں محمود کے چچا کے گھر مقیم ہیں اور انہوں نے شادی کر لی ہے۔ نجو عاقل و بالغ تھی اور اسے اپنی مرضی سے شادی کرنے کا حق حاصل تھا۔

پھر کوئی چھ مہینے کے بعد نجو کے دادا کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد نجو اپنے والدین سے ملنے اور دادا کی موت پر تعزیت کرنے کے لیے بستی میں آئی تھی۔ اس کی آمد پر بستی میں ایک دھوم مچ گئی تھی۔ نجو بڑی پُر اعتماد تھی اور خوش تھی وہ بڑے ٹھسے کے ساتھ

بستی میں آئی ہوئی تھی اور کھل کر یہ کہتی تھی کہ اس نے اپنے بارے میں صحیح فیصلہ کیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے نجو کو برا بھلا بھی کہا مگر اس نے کسی کی پرواہ نہیں کی تھی۔ محمود بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ وہ دونوں اب میاں بیوی تھے اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

تو اماں بھی اس طرح بھاگ گئی تھیں جس طرح نجو بھاگ گئی تھی۔ نجو تو محمود کے ساتھ بھاگی تھی اور اماں..... اماں..... شاید اس نامعلوم شخص کے ساتھ..... نجو نے تو محمود کے ساتھ شادی کر لی تھی اور یہ سارا معاملہ ختم ہوگیا تھا' لیکن اماں؟ اماں کیا کریں گی؟ اماں تو شادی شدہ تھیں۔ ان کا شوہر تو پہلے سے موجود تھا۔ وہ اس خوبصورت اجنبی سے شادی کس طرح کر سکتی تھیں؟ پھر وہ کیا کریں گی؟

فیضو کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے اور اسے زیادہ سے زیادہ الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ وہ نہ تو کسی سے یہ سوال پوچھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے طور پر ان کے جوابات حاصل کر سکتا تھا۔

بہت دیر کے بعد ابا گھر واپس آگئے۔ ان کے چہرے پر خاک اُڑ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں خاک گھلی ہوئی تھی اور ان کے بالوں میں خاک اٹی ہوئی تھی۔ وہ تباہی و شکستگی کی ایک عبرتناک علامت نظر آ رہے تھے۔

اس وقت تک زیادہ تر عورتیں دادی سے پوچھ گچھ کر کے جا چکی تھیں۔ گھروں میں یہ کام کا وقت تھا۔ البتہ زمردی خالہ ابھی تک بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی' کیونکہ انہیں اپنے گھر پر کوئی کام نہیں تھا۔ ان کے گھر میں کام کرنے والے اور بھی کئی لوگ موجود تھے اور زمردی خالہ پر کسی کام کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ اسی لیے ان کا زیادہ تر وقت محلے کے گھروں میں گھومتے ہوئے اور تیری میری ٹوہ لیتے ہوئے گزرتا تھا اور دادی کے پاس تو خاص طور سے ان کا آنا جانا بہت تھا۔ دادی کی زبان سے ان کی بہو کی برائیاں سننے میں زمردی خالہ کے نہ جانے کون کون سے جذبوں کی تسکین ہوتی تھیں۔

''ارے کچھ پتہ چلا؟'' ابا کی صورت دیکھتے ہی دادی نے جلدی سے پوچھا۔ ان کی آواز میں ہلکی سے کپکپاہٹ تھی۔

ابا جب بولے تو ایسا لگا جیسے وہ کسی اندھے کنویں کے اندر بہت گہرائی میں سے بول رہے ہوں ان کی آواز بھی بدل گئی تھی۔

''مولوی سعد اللہ بتا رہے تھے کہ انہوں نے بہت تڑکے افسری کوگلی میں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' ابا نے رک رک کر تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ اکیلی تھیں اور ان کے

ہاتھ میں ایک بڑی سی پوٹلی تھی' مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ افسری اتنے سویرے سویرے کہاں جا رہی ہیں۔ فیکٹری جانے میں تو ابھی کافی دیر تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ حرافہ پورے انتظام سے گئی ہے۔'' دادی نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ''سب مال اسباب سمیٹ کر گٹھڑی بنا کر لے گئی ہے۔ ارے خدا اس کو غارت کرے' کوڑھ پھوٹے اس کے جسم میں' ہاتھ پیر کٹ کٹ کر گریں' ارے کیڑے بجبجائیں.....''

فیضو تھرا گیا..... دادی کس قدر خوفناک باتیں کر رہی تھیں۔ خدا نہ کرے..... خدا نہ کرے کہ اماں کے ساتھ ایسا کچھ ہو۔

دادی' اماں کو کوڑھی ہونے کی بددعا دے رہی تھیں اور فیضو کو تیجا نامی وہ کوڑھی یاد آ رہا تھا جو ہندوستان میں بہرائچ میں شہر سے کچھ دور ایک پرانے اور ٹوٹے پھوٹے احاطے میں پڑا رہتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ کی آدھی سے زیادہ انگلیاں گل کر غائب ہو چکی تھیں۔ ناک بالکل پچکی ہوئی اور بیٹھی ہوئی تھی اور ہونٹ بہت ٹیڑھے میڑھے اور موٹے موٹے تھے۔ اس کے چہرے کی کھال کہیں سے پھولی ہوئی' کہیں لٹکی ہوئی اور کہیں سے پچکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور سر کے بال تقریباً بالکل غائب ہو چکے تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک جھلنگی چارپائی پر پڑا رہتا تھا اور لوگ اسے کھانے کے لیے کچھ دے دیا کرتے تھے۔ وہ خود چل کر کہیں نہیں جاتا تھا۔ فیضو اور دوسرے بچے اکثر دور سے اسے دیکھا کرتے تھے اور اس کے قریب نہیں جاتے تھے۔ پھر ایک دن تیجا مر گیا تھا۔ وہ کس وقت مر گیا' یہ کسی کو نہیں معلوم۔ اس روز شام کے وقت کوئی اس کے لیے پتوں پر رکھ کر کھانا لے گیا اور اس کی چارپائی پر کھانا رکھ کر اسے زور زور سے آوازیں دینے لگا کہ وہ کھانا کھا لے' لیکن تیجا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد ہی معلوم ہوا کہ تیجا مر چکا ہے۔ تیجا کی لاش کے ساتھ ہی اس کی چارپائی کو اور اس کی تمام چیزوں کو بھی جلا دیا گیا تھا۔ تو کیا اماں تیجا کی طرح..... نہیں نہیں..... اس نے جلدی سے اپنے سر کو جھٹک کر اس بھولے بسرے خوفناک منظر کو اپنے ذہن سے نکال پھینکنے کی کوشش کی جو کہ گزرے ہوئے ماہ و سال کی دُھند میں سے اپنا راستہ بناتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

اماں تو کتنی خوبصورت تھیں۔ ان کا بے داغ گورا چہرہ' بڑی بڑی سیاہ خوب چمک دار آنکھیں..... بھلا کہاں اماں کا یہ خوبصورت اور پیارا پیارا چہرہ اور کہاں کوڑھی تیجا کی بھیانک صورت۔

اس کا جی چاہا کہ وہ دادی کو یہ سب کچھ کہنے سے روک دے..... لیکن وہ اپنے اندر اتنی

ہمت پیدا نہ کر سکا۔ دادی نہ جانے کتنے مختلف طریقوں سے اماں کو کوس رہی تھیں۔ وہ بہت سے نئے نئے الفاظ استعمال کر رہی تھیں' جن کی تلخی اور شدت میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''ارے تھانے میں جا کر رپٹ لکھواؤ۔'' دادی نے فرطِ غضب سے نڈھال ہوتے ہوئے کہا۔ ''جہاں بھی گئی ہے' جس کے ساتھ بھی گئی ہے' پولس والے پکڑ کر جوتے مارتے ہوئے واپس لائیں گے۔''

''کوئی فائدہ نہیں اماں۔'' ابا نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''پولیس تھانے میں بھلا کیا رکھا ہے؟ اپنی مرضی سے گئی ہے.....''

''ارے ایسے کیسے گئی ہے؟'' دادی نے بھڑک کر کہا۔ ''مال لے کر گئی ہے۔ گھر کا سارا سامان اور پیسے لے کر گئی ہے' چوری کی ہے اس نے..... ارے اس کو چوری کے الزام میں تو ہتھکڑی لگواؤ۔''

ابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئے تھے اور خالی نظروں سے خلا میں گھور رہے تھے۔

''اے کچھ پتہ ہے کس کے ساتھ گئی ہے؟'' زمردی خالہ کی سرگوشی اتنی ہلکی تھی کہ قریب بیٹھا ہوا فیضو بھی اس کو بمشکل سن سکا۔ وہ دادی سے مخاطب تھیں۔ ''کیا کسی سے کچھ میل جول تھا اس کا؟''

''ارے خدا جانے.....'' دادی نے سخت بیزاری اور ناگواری کے ساتھ جواب دیا۔ ''ہم کیا اس کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے؟ سارا دن گھر سے باہر رہتی تھی۔ کیا معلوم کیا کرتی پھرتی تھی۔ ارے ہم تو اس کی نوکری کے حق میں نہیں تھے۔ کتنا چاہا ہم نے کہ گھر میں بیٹھ کر کچھ سینے سلانے کا کام دھندا کر لے' مگر اس کو تو شوق تھا گھر سے باہر نکل کر ہڑدنگے لگانے کا..... اور بھیا سچ پوچھو تو عورت اسی وقت بے قابو ہوتی ہے جب اسے اپنے مرد کی طرف سے ڈھیل ملتی ہے۔ یہ میاں اس کا.....'' دادی نے انگلی سے ابا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے اگر یہ ڈھنگ ٹھکانے کا ہوتا اور چار پیسے کما کر لاتا تو کاہے کو اسے پَر پُرزے نکالنے کا موقع ملتا؟ مرد جب پیٹ کو روٹی دیتا ہے تو پیٹھ پر لات مارنے کا حق بھی رکھتا ہے۔''

ابا خاموش بیٹھے رہے۔ انہوں نے ان دونوں بوڑھی عورتوں میں سے کسی کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر انہوں نے ایک بیڑی سلگائی اور کش لگانے لگے۔

ابا کچھ دیر کے بعد اٹھ کر باہر چلے گئے۔ انہوں نے دادی کو نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ دادی نے بھی ان سے کچھ نہیں پوچھا۔

فیضو کافی دیر تک تو گھر میں ہی رہا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ برابر اماں کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں ہوں گی اور اب واپس آئیں گی بھی یا نہیں..... کیا اب اس کو اماں کے بغیر ہی زندہ رہنا ہوگا؟

وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ دادی منہ پر دوپٹہ لپیٹے ہوئے اپنے پلنگ پر پڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ فیضو نے ان سے کچھ نہیں کہا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا خالی میدان تھا۔ یہاں پانی کا نل لگا ہوا تھا اور بستی کے لوگ یہیں سے پانی بھرتے تھے۔ اس میدان میں بستی کے بچے کھیلا کرتے تھے اور یہاں ہر وقت کچھ نہ کچھ بچے ضرور موجود ہوتے تھے۔ یہ وہ بچے ہوتے تھے جو نہ تو اسکول جاتے تھے اور نہ کوئی کام دھندا کرتے تھے۔ بس سارا دن بستی کی گلیوں میں اور میدانوں میں ہڑدنگے لگاتے رہتے تھے۔ فیضو انہیں کی طرف چلا گیا۔

''ارے فیضو..... آج تم اسکول نہیں گئے؟'' ایک لڑکے نے فیضو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اسکول کی تو چھٹی نہیں ہے۔''

''اسکول کی چھٹی نہیں ہے۔'' ایک دوسرا لڑکا بولا' جو فیضو سے عمر میں کچھ بڑا تھا۔ ''اسکول تو کھلا ہے ہوا ہے' مگر فیضو اسکول نہیں گیا ہے' وہ آج کیسے اسکول جا سکتا تھا؟''

''کیوں؟'' ایک تیسرا لڑکا کچی زمین پر پتھر سے لکیریں کھینچتے ہوئے بولا۔ ''کیوں نہیں جا سکتا تھا؟ کیا روز نہیں جاتا ہے؟''

''ابے روز کوئی اس کی ماں تھوڑی بھاگ جاتی تھی۔'' دوسرا لڑکا بولا۔ ''تمہیں معلوم نہیں' فیضو کی اماں بھاگ گئی ہے.....''

''فیضو کی ماں بھاگ گئی ہے؟'' تیسرا لڑکا حیرت سے بولا۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''سب کو معلوم ہے۔'' دوسرے لڑکے نے جواب دیا۔ ''میری نانی صبح کو گئی تھیں فیضو کے گھر۔ اس کی دادی اور ابا سے مل کر آئی ہیں۔ فیضو کی اماں اپنے ساتھ پیسے' زیور اور کپڑے وغیرہ بھی لے گئی ہے۔''

''یار' یہ عورتیں گھروں سے بھاگ کیوں جاتی ہیں؟'' پہلے لڑکے نے بڑی سادگی کے ساتھ سوال کیا۔ ''اور بھاگ کر جاتی کہاں ہیں؟''

''ابے اکیلی تھوڑی بھاگتی ہیں۔'' دوسرے لڑکے نے جواب دیا۔ ''یاروں کے ساتھ بھاگتی ہیں اور پھر انہی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔''

''تو پھر فیضو کی ماں بھی کسی یار کے ساتھ بھاگی ہوگی؟'' تیسرے لڑکے نے کہا۔ ''اور

یہ یار..... یار ہوتے کیا ہیں؟''

''ابے یار یار ہوتے ہیں۔'' دوسرے لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آدمی ہوتے ہیں جن کے ساتھ عورتیں بھاگتی ہیں..... فیضو کی ماں کا بھی ضرور کوئی یار ہوگا جس کے ساتھ وہ بھاگ گئی۔''

فیضو وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ تینوں لڑکے اس کی ماں کے بارے میں جو باتیں کر رہے تھے' وہاں موجود کچھ دوسرے لڑکے بھی ان کو شوق اور دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے اور فیضو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم میں سے جان نکال کر اسے مُردہ کر دیا ہو۔

وہ بستی سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گیا اور بس اسٹاپ کے پاس کھڑا ہو گیا جہاں بسیں آ جا رہی تھیں' کئی ٹھیلے والے اور خوانچے والے بھی موجود تھے جو اپنی چیزیں بیچنے کی کوشش میں طرح طرح کی آوازیں لگا رہے تھے۔ فیضو کچھ لینا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ اس کی جیب خالی تھی۔ اگر اماں گھر پر موجود ہوتیں تو اسے اسکول جانے سے پہلے ایک اکنی دے دیتیں مگر اماں تو بھاگ گئی تھیں۔

وہ بہت دیر تک بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا' آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا' کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔

اسے بڑے زور کی بھوک لگنے لگی اور تب اسے یہ یاد آیا کہ اس نے تو صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔ ناشتہ کرنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی لیکن اب بھوک ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ وہ وہاں سے واپس بستی کی طرف چل پڑا۔

راستے میں اسے منظور ملا۔ منظور اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اماں کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھا کرتا تھا اور اکثر شام کو اماں کی فیکٹری سے واپسی کے وقت گلی میں اور مکان کے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا۔ وہ اماں سے بات کرنے کے لیے بیتاب رہتا تھا لیکن اماں اسے کبھی منہ نہیں لگاتی تھیں۔

منظور کے ساتھ اس کا دوست قدیر بھی تھا۔ وہ دونوں گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے بیڑی پی رہے تھے۔

''ارے کچھ پتہ چلا تمہاری اماں کا؟'' منظور نے فیضو کو آتا دیکھ کر اس سے پوچھا۔ ''کچھ معلوم ہوا کس کے ساتھ نکل گئیں؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' فیضو نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

''ہائے۔'' منظور نے لمبی سانس بھرتے ہوئے اپنے دوست قدیر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ارے ہم ایسے کون سے برے تھے..... ایک دفعہ اشارہ تو کیا ہوتا..... جنت کی سیر کرا دیتے.....'' اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ قدیر بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ ان دونوں کے بے ہنگم قہقہے بھاری بھرکم پتھر بن بن کر فیضو کے دماغ پر برس رہے تھے۔ وہ ذرا دیر کے لیے یہ بھول گیا کہ اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے دادی کو دروازے کے قریب ہی کھڑا ہوا پایا۔ شمسن چچی بھی ان کے ساتھ تھیں۔

''ارے کہاں چلا گیا تھا تُو؟'' دادی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''ہم کب سے تیری راہ دیکھ رہے ہیں۔ صبح سے یہ وقت ہو گیا' ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ گئی بچے کے منہ میں..... بھوکا پیاسا حق حیران پریشان پھر رہا ہے۔ آؤ آ کر کھانا کھا لو.....''

فیضو کو اس وقت اسی چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ کھانا دادی نے نہیں پکایا تھا۔ وہ شمسن چچی اپنے گھر سے پکا کر لائی تھیں۔ ابا ابھی تک گھر واپس نہیں آئے تھے۔

''آ جاؤ بیٹا' آ جاؤ۔'' شمسن چچی نے پُرمحبت لہجے میں اس سے کہا۔ ''کھانا کھا لو..... صبح سے بھوکے ہو۔''

صبح سے پہلی بار فیضو نے کسی کی زبان سے محبت' ہمدردی اور چاہت کے کچھ بول سنے تھے' ورنہ ابھی تک تو اس کے کان جو کچھ بھی سنتے رہے تھے وہ اس کے دل کا خون کیے ڈال رہا تھا۔

شمسن چچی شوکت حسین سبزی فروش کی بیوی اور شاکرہ اور مسعودہ کی ماں تھیں۔ وہ ہمیشہ سے فیضو کو بہت پسند کرتی تھیں اور اپنے دوسرے بچوں کی طرح اس کا بھی خیال رکھتی تھیں۔ شمسن چچی اور شوکت چچا کو فیضو میں جو سب سے بڑی خوبی نظر آتی تھی اور جس کا وہ دونوں ہمیشہ کھلے دل کے ساتھ اعتراف کرتے تھے' وہ یہ تھی کہ فیضو لکھنے پڑھنے میں بہت تیز تھا اور اس کے ٹیچروں کو یقین تھا کہ وہ کافی آگے تک کامیابی کے ساتھ پڑھائی کر سکے گا۔ فیضو کی اس خوبی کو سراہنے والے صرف شوکت حسین سبزی فروش اور اس کی بیوی شمس النساء عرف شمسن ہی نہیں تھے' بستی کے اور بھی کئی خاندان اس کے معترف تھے۔

شمسن چچی آلو گوبھی کی ترکاری بنا کر لائی تھیں اور ساتھ میں روٹیاں بھی..... فیضو تو فوراً ہی کھانے کے لیے تیار ہو گیا تھا' لیکن دادی کھانے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں بھوک نہیں ہے' حالانکہ انہوں نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دادی پر بھوک سے

زیادہ غم و غصے کا غلبہ تھا۔ وہ سخت غم زدہ نظر آ رہی تھیں' مگر شمسن چچی نے زبردستی کر کے تھوڑا بہت کھانا انہیں بھی کھلا دیا۔

''اتنا زیادہ پریشان مت ہو فخرن خالہ.....'' شمسن چچی نے دادی سے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے' کون جانے' افسری واپس ہی آ جائیں.....''

''ارے اب وہ مال زادی یہاں آ کر کیا کرے گی۔'' دادی نے کہا۔ ''وہ تو ہمارے منہ پر ہمیشہ کے لیے کالک پوت کر چلی گئی۔ اب اگر واپس آئے گی بھی تو ہمارے کس کام کی؟''

فیضو کی سمجھ میں یہ بات پوری طرح نہ آ سکی۔ اماں اگر واپس آ جائیں تو وہ ''ہمارے کسی کام کی'' کیوں نہیں تھیں؟ اگر وہ واپس آ جائیں تو پہلے کی طرح اپنے گھر میں کیوں نہیں رہ سکتی تھیں؟

شمسن چچی تھوڑی دیر بعد چلی گئیں جانے سے پہلے وہ فیضو سے مخاطب ہو کر بولیں۔

''دیکھو شام کو ہمارے گھر چلے آنا اور کھانا ہم لوگوں کے ساتھ ہی کھا لینا..... اور اپنے ابا اور دادی کے لیے بھی ہمارے گھر سے کھانا لیتے آنا۔ تمہاری دادی بے چاری بہت پریشان اور تھکی ہوئی ہیں ان کو آرام کرنے دینا۔ آج انہیں کچھ پکانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں نہیں شمسن۔'' دادی نے شمسن چچی کو روکتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔ ارے اب یہ کوئی ایک دن کا رونا تھوڑی ہے جو آدمی رو لے۔ یہ تو اب زندگی بھر کا رونا ہے۔ جب تک جینا ہے۔ تب تک یہ غم جھیلنا ہے۔''

''صبر کرو فخرن خالہ.....'' شمسن نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا تم تو اس بچے کی ہمت بندھاؤ خالہ..... تم نے اپنی تو گزار لی لیکن اس نے تو ابھی زندگی ٹھیک سے شروع بھی نہیں کی ہے۔ اس کو تمہارے سہارے کی اور اپنے باپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔''

''ارے اسی کو تو دیکھ کر جیتی ہوں شمسن۔'' دادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''اس منحوس نے تو ایک دوسرا بچہ بھی نہیں جنا۔ جانے کب سے اس کے دل میں میاں کو چھوڑ دینے کا خیال بیٹھا ہوا ہو گا۔ تبھی تو حرام خورنی نے اولاد کو بھی دنیا میں آنے سے روک دیا۔''

''ارے یہ کوئی انسان کے اپنے بس کی بات تھوڑی ہے فخرن خالہ.....'' شمسن چچی نے کہا۔ ''خدا کی مرضی میں کسی کا کیا دخل؟ وہ جس کو چاہے' جتنی چاہے اولاد دے یا بالکل نہ دے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے شمسن' مگر اس حرافہ نے بھی ضرور کچھ جتن کیے ہوں گے۔'' دادی نے کہا۔ ''دیکھ لو..... ایک تھا' تو اس کی پرواہ نہ کی اور چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ارے کم بخت ماری نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اس معصوم کا کیا ہوگا۔ ہم بڑھیا' قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ آج مرے کل دوسرا دن..... کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟''

''ارے خدا تمہیں جیتا رکھے فخرن خالہ۔'' شمسن چچی نے کہا۔ ''اور اب میں تم سے کہتی ہوں' فیضو کو تو میں اور شاکرہ کے ابا اپنی اولاد کی طرح سمجھتے ہیں۔ جب تک ہم لوگ زندہ ہیں' اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ اور ہاں' شام کو فیضو کو ضرور ہمارے گھر بھیج دینا۔ آ کر کھانا کھالے اور تمہارے لیے اور امدو بھائی کے لیے بھی کھانا میں بھیج دوں گی۔ تم کچھ نہ پکانا۔''

شمسن چچی کے جانے کے بعد فیضو شام تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ دادی کے پاس کوئی نہ کوئی آتا رہا اور ان سے حال پوچھتا رہا۔ ابا شام تک نہیں آئے۔

''اب تم شمسن کے گھر چلے جاؤ اور کھانا کھا کر آجاؤ۔'' دادی نے کہا۔ ''ہم نے تو کچھ نہیں پکایا ہے' اور آج پکایا بھی نہیں جائے گا۔''

فیضو تھوڑی دیر بعد گھر سے نکل کر شوکت حسین سبزی فروش کے گھر چلا گیا جو اس کی جھگی سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اسے سامنے مسعودہ نظر آئی۔ اس نے فیضو کو دیکھ کر خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا اور خاصے خشک اور بیزار بیزار لہجے میں اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''کچھ پتہ چلا تمہاری اماں کا؟''

''نہیں۔'' فیضو نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''ویسے ابا گئے ہوئے ہیں' باہر ہیں وہ ابھی تک۔''

''پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی؟'' مسعودہ جرح پر آمادہ تھی۔

''پتہ نہیں۔'' فیضو نے کہا۔ ''شاید ابا لکھوا دیں۔'' اسے معلوم تھا کہ ابا پولیس میں رپورٹ لکھوانے سے انکار کر چکے ہیں' لیکن وہ مسعودہ کے سوالوں سے بچنا چاہتا تھا۔ مسعودہ اور شاکرہ تھیں تو دونوں سگی بہنیں' مگر فیضو کو مسعودہ بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ ہر بات میں کیڑے نکالنا اور عیب جوئی کرنا اس کی عادت تھی۔ عجیب طرح کی کھری طبیعت پائی تھی اس نے' جبکہ اس کے مقابلے میں شاکرہ بہت اچھی تھی۔ بڑی ہنس مکھ' زندہ دل اور خوش مزاج' اس سے باتیں کر کے فیضو کو بہت اچھا لگتا تھا اور وہ چاہے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہے اور باتیں کرتا رہے' اس کا جی نہیں اکتاتا تھا لیکن مسعودہ کے ساتھ تو تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہی

جیسے دم الجھنے لگتا تھا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہونے کو جی چاہتا تھا۔

فیضو مسعودہ کو کوئی اگلا سوال کرنے کا موقع دیے بغیر ہی آگے بڑھ گیا اور اسی وقت شاکرہ سامنے نظر آئی۔

''اچھا' تو تم آگئے۔'' شاکرہ نے اس کو دیکھ کر نرمی سے کہا۔ ''اب ایسا کرو کہ پہلے تم خود کھانا کھالو۔ پھر اپنی دادی اور ابا کے لیے بھی لیتے جانا' زیادہ رات نہ کرنا۔''

شاکرہ کے لب و لہجے میں نرمی اور رسانیت تھی اور اپنائیت کا ایک ایسا انداز تھا کہ جس کے آگے انسان موم کی طرح پگھل جاتا تھا۔

کمرے میں شوکت چچا اور شمسن چچی موجود تھے۔ شوکت چچا خالی ایک تہبند باندھے ہوئے چارپائی پر لیٹے بیڑی پی رہے تھے۔ فیضو کو دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے چارپائی پر بیٹھنے کی جگہ دے دی۔

''تمہارے ابا واپس آئے یا ابھی نہیں؟'' شوکت چچا نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' فیضو نے مختصر سا جواب دیا۔ اسی وقت اسے قریبی باورچی خانے سے شاکرہ کی آواز سنائی دی۔ ''یہاں آ کر کھانا کھالو فیضو۔'' اور فیضو اٹھ کر اس چھوٹے سے باورچی خانے میں چلا گیا جو ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔

شاکرہ نے ایک رکابی میں سالن اور ڈلیا میں روٹیاں اس کے سامنے رکھ دیں۔

''خدا کرے افسری چچی جہاں کہیں بھی ہوں' خیریت سے ہوں۔'' چھوٹی سی شاکرہ نے بڑے بزرگانہ انداز میں گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''خدا کرے وہ جلدی گھر واپس آجائیں۔ تم تو ان کے بغیر بہت پریشان ہو رہے ہوگے۔''

وہ پہلی ہستی تھی جس نے اس قدر اپنائیت اور چاہت کے ساتھ فیضو سے اظہارِ ہمدردی کیا تھا۔ صبح سے اب تک طرح طرح کی دل دُکھانے والی باتیں سنتے سنتے اور آڑی ترچھی اور سلگتی ہوئی نظروں کو دیکھتے دیکھتے اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ شاکرہ وہ پہلی ہستی تھی جس نے اماں کے بارے میں کوئی بات کرتے وقت پریشان کن سوالیہ انداز کے بجائے تسلی آمیز دعائیہ انداز اختیار کیا تھا۔

''ہاں' میں تو پریشان ہوں۔'' فیضو نے آہستہ سے کہا۔ ''مگر دادی جان تو انہیں گالیاں اور کوسنے دے رہی ہیں۔ ابا بھی گالیاں دے رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں دادی کے کوسنے سے اماں سچ مچ مر نہ جائیں۔''

''نہیں فیضو۔'' شاکرہ نے کہا۔ ''کوئی کسی کے کوسنے سے نہیں مرتا۔ موت اور زندگی خدا

کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔انسانوں کے کوسنے سے کیا ہوتا ہے۔''

فیضو خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔شاکرہ اس وقت تک اس کے پاس باورچی خانے میں ہی بیٹھی رہی جب تک کہ اس نے کھانا ختم نہیں کرلیا۔اس دوران شمسن چچی نے دادی اور ابا کے لیے کھانا نکال کر المونیم کے ایک پرانے سے ناشتے دان میں رکھ دیا تھا۔

فیضو گھر واپس آیا تو رات ہوچکی تھی۔چاروں طرح گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔بستی کی چھوٹی چھوٹی جھگیوں اور نیم پختہ گھروندوں سے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ذرا ہی دیر کے بعد گہرا سناٹا طاری ہوجانے والا تھا۔سناٹا ہونے کے ساتھ ساتھ گھروں میں چراغ بھی ایک ایک کر کے بجھنے لگتے تھے اور زندگی جیسے ساکت ہوجاتی تھی۔

فیضو گھر میں داخل ہوا تو اندر گہرا سناٹا تھا دادی اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ایک کونے میں لالٹین جل رہی تھی جس کی بیمار اور پژمردہ روشنی گھر کی ویرانی اور اداسی میں اور بھی زیادہ اضافہ کررہی تھی۔

دادی نے شمسن چچی کے بھیجے ہوئے کھانے میں سے تھوڑا سا کھانا کھالیا اور باقی ابا کے لیے رکھ لیا۔ابا رات کو بہت دیر سے آئے۔فیضو ان کے آنے تک جاگتا رہا۔اس سے پہلے وہ کبھی بھی ابا کے انتظار میں نہیں جاگا تھا۔ابا زیادہ تر اتنی دیر سے گھر آتے تھے کہ وہ سوچکا ہوتا تھا اور اس نے اس بات کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی' لیکن آج وہ اس امید میں جاگ رہا تھا کہ شاید ابا' اماں کے بارے میں کوئی خبر لے کر آئے ہوں.....شاید اماں کا کچھ پتہ چل گیا ہو .....شاید اماں کے گھر واپس آنے کی کوئی سبیل نکل آئے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

ابا بہت رات کو واپس آئے اور انہوں نے آتے ہی دادی سے کھانا مانگا۔

''ارے کچھ پتہ چلا افسری کا؟'' دادی نے ان سے سوال کیا۔''کہاں کہاں ڈھونڈا تم نے اسے؟''

''میں کہاں کہاں ڈھونڈوں گا اماں۔'' ابا نے بیزاری کے ساتھ جواب دیا۔''اتنا بڑا شہر پڑا ہوا ہے۔انسانوں کے اس جنگل میں بھلا ایک آدمی کو کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے' اور تلاش تو اسے کیا جاتا ہے اماں جو کھو گیا ہو۔جو اپنی مرضی سے چلا جائے اسے بھلا کس طرح تلاش کیا جاسکتا ہے؟''

فیضو کا دل کٹ کر رہ گیا۔تو.....تو.....اب اماں کو کوئی تلاش نہیں کرے گا؟ اماں واپس نہیں آئیں گی؟

ابا نے کھانا کھالیا اور اپنے پلنگ پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گئے۔دادی نے انہیں بتادیا تھا

کہ کھانا شوکت چچا کے ہاں سے آیا تھا اور انہوں نے خود آج کچھ نہیں پکایا تھا۔ابا نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔دادی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہیں اور اماں کو گالیاں اور کوسنے دیتی رہیں۔

اس وقت تک فیضو کے دل میں اپنی ماں کی طرف سے نفرت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ وہ اپنی دادی کی طرح ان کی موت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔اسے تو شاکرہ کی باتیں بہت اچھی لگی تھیں' جو باقی تمام لوگوں کی کہی ہوئی باتوں سے بہت مختلف تھیں۔

میدان میں لڑکوں نے اس کی اماں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا۔اسے سن کر اس کا دل ہل گیا تھا' لیکن پھر بھی' اس نے ابھی اماں سے نفرت شروع نہیں کی تھی۔اس کو ابھی تک صورتِ حال کی حقیقی سنگینی کا اندازہ بھی نہیں تھا۔حقیقتِ حال کی خوفناک پرتیں آہستہ آہستہ کھلنی شروع ہوئیں اور جیسے جیسے وہ کھلتی گئیں ویسے ویسے فیضو کی زندگی کے عذابوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

☆======☆======☆

اماں کے بھاگنے کے بعد وہ دو دن تک تو اسکول ہی نہیں گیا اور ماسٹر راشد زبیری کے گھر بھی پڑھنے کے لیے نہیں گیا۔ دوسرے دن جب وہ نہیں آیا تو ماسٹر راشد زبیری نے ایک لڑکے کے ذریعے اس کو بلوا بھیجا۔ انہوں نے اس سے اس کی ماں کے بارے میں بالکل کوئی بات چیت نہیں کی۔ بس اس کو سختی کے ساتھ اس بات کی تاکید کی کہ وہ پڑھائی کا ناغہ نہ کرے اور اسکول بھی جائے اور ان کے پاس پڑھنے کے لیے آئے۔

''زندگی میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے بیٹے۔'' ماسٹر راشد زبیری نے اسے سمجھایا۔ ''آدمی یوں ہاتھ پیر چھوڑ کر تو نہیں بیٹھ رہتا۔ حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔''

چنانچہ اگلے دن سے فیضو نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ اس اسکول میں بستی کے چند اور بھی لڑکے پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ سرکاری اسکول تھا۔ ان لڑکوں کے ذریعے فیضو کی کلاس کے لڑکوں کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ فیضو کی ماں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور گھر سے نقدی' زیور اور کپڑے بھی لے گئی ہے۔

فیضو جب اسکول گیا تو وہ اپنی کلاس میں جیسے تماشا بن گیا۔ اس سے پہلے تو کلاس کے تمام لڑکے اس سے ذرا دبے دبے رہتے تھے' کیونکہ وہ بالکل غریب خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود کلاس کا سب سے زیادہ تیز لڑکا تھا اور پڑھائی میں سب سے آگے تھا' دوسرے لڑکے اس سے مدد مانگتے تھے لیکن اب اچانک سب کچھ جیسے بدل گیا تھا۔ لڑکے اسے عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے حقارت اور استہزا کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کھلم کھلا باتیں بھی کر رہے تھے۔

''سنا ہے تمہاری اماں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہیں۔'' حامد نامی ایک لڑکے نے نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارے ابا نے پکڑا

نہیں ان دونوں کو؟''

''اور اب تم کیا کرو گے؟'' ہاشم نامی ایک اور لڑکے نے سوال کیا۔ ''جن لڑکوں کی مائیں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ ان کے باپ شاید دوسری شادی کر لیتے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' فیضو نے چوطرفہ حملوں سے گھبرا کر بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا اور جلدی سے وہاں سے الگ ہٹ گیا۔

صرف اسکول کے لڑکے ہی نہیں' بعض ٹیچرز بھی اس کو بدلی بدلی نظروں سے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس لڑکے کی شکل خاص طور سے دیکھنا چاہتے ہوں جس کی ماں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔

اسکول میں لڑکے جو کچھ کہہ رہے تھے' ویسی باتیں فیضو پہلے ہی دن اپنی بستی میں کچھ لڑکوں کی زبانی سن چکا تھا' لیکن جب تک اس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا' کیونکہ ابھی تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ کیا ہو رہا ہے..... لیکن اب تو سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ اسکول میں جہاں اسے آدھا دن گزارنا ہوتا تھا اور جو اس کی پسندیدہ جگہ بھی تھی' اس کا تماشا بنایا جا رہا تھا۔ اور اس کی وجہ اماں تھیں..... ابھی تک تو اماں اسے بہت کچھ دیتی رہی تھیں' لیکن اچانک انہوں نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔

اماں کو گھر سے گئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ زندگی نے اپنے نئے معمولات خود بخود مقرر کر لئے تھے۔ دادی صبح اٹھ کر ناشتہ تیار کرتی تھیں اور فیضو ناشتہ کر کے اسکول چلا جاتا تھا۔ ابا اس وقت بھی' پہلے کی طرح پڑے سوتے رہتے تھے۔ دوپہر اور رات کا کھانا دادی پکا لیتی تھیں۔ ابا اب پہلے سے زیادہ دیر سے گھر واپس آتے تھے اور کھانا کھا کر سو جاتے تھے۔ پھر دن چڑھے تک سوتے رہتے تھے۔

اس روز رات کو ابا کو کھانا دینے کے بعد' دادی نے کہا۔ ''گھر میں بس چند دن کا سامان اور موجود ہے کھانے پینے کا۔ ہمارے پاس جو تھوڑے سے پیسے پڑے ہوئے تھے' وہ سب خرچ ہو چکے ہیں۔ فوراً ہی کوئی کام دھندا شروع کر دو اور کچھ کما کر لاؤ' ورنہ گھر میں فاقے ہونے لگیں گے۔ وہ کمانے والی تو اُڑ گئی..... ہم سب کے منہ کو جھلسا لگا کہ غائب ہو گئی۔ ارے منحوس نے اپنے بچے کا بھی خیال نہیں کیا۔ اس کے لیے بھی کچھ نہیں چھوڑا۔ سب لے گئی۔ دفعان ہو گئی غارت گئی۔''

''تو..... تو..... تھوڑے بہت تو پیسے ہوں گے تمہارے پاس؟'' ابا نے پُر امید لہجے میں

دادی سے پوچھا۔

''ارے کہاں سے آئیں گے میرے پاس پیسے؟'' دادی نے بگڑ کر کہا۔ ''تم کمائی کر کے لاتے ہو کیا؟ کبھی دیتے ہو مجھے پیسے؟ وہ جو دیتی تھی' وہ تو اب نہیں ہے۔ تو کہاں سے آئیں گے پیسے؟ جلدی سے کہیں کام ڈھونڈو۔''

''ٹھیک ہے۔'' ابا نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''دیکھتے ہیں.....''

لیکن ابا نے کچھ نہیں ''دیکھا'' ان کے وہی لچھن رہے' وہ آدھا دن تو گھر میں سو کر گزار دیتے اور پھر رات تک نہ جانے کیا کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے ایک پیسہ بھی لا کر دادی کو نہیں دیا۔ کوئی کمائی نہیں کی۔ جب تک اماں موجود تھیں' تب تک تو دادی کو ابا کے مشاغل اور مصروفیات کے بارے میں بہت زیادہ تجسس نہیں رہتا تھا' کیونکہ ابا کمائیں نہ کمائیں' اماں تو کما رہی تھیں' کم از کم اتنا تو تھا کہ گھر کی دال روٹی چل رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا تھا اور دادی اکثر کہا کرتی تھیں کہ ''پانچ سال کی بات ہے' پھر تو ہمارا فیضو میٹرک کر لے گا ہمارے دلدر دور ہو جائیں گے۔''

لیکن فیضو کو دادی کی اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں تھا۔ وہ میٹرک پاس کرنے کے بعد پڑھائی ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو آگے پڑھنا چاہتا تھا اور ماسٹر راشد زبیری بھی اس سے یہی کہتے تھے کہ وہ آگے ضرور پڑھے۔

اب اماں کے چلے جانے کے بعد سے دادی کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ابا کے معمولات اور مصروفیات کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانیں۔

آخر وہ اپنا وقت کہاں ضائع کرتے ہیں؟ کوئی کام دھندہ کیوں نہیں کرتے تھے؟

ابا کے بارے میں جب تفتیش کرائی گئی تو معلوم ہوا کہ ان کے دوستوں کے کئی اڈے تھے جہاں وہ جا کر حاضریاں لگایا کرتے تھے۔ وہاں جوئے وغیرہ کا سلسلہ بھی چلتا تھا۔ دادی سے وہ جو تھوڑے بہت پیسے جھٹک لیتے تھے وہ جوئے کی نذر ہو جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کچھ جیت بھی لیتے تھے' مگر وہ اگلی دفعہ کی ہار میں برابر ہو جاتا تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی برابر ہو جاتا تھا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ فیضو گھر پر ہی تھا اور اسکول کا کام کر رہا تھا حساب اور سائنس کی کاپیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اسے دو نئی کاپیوں کی ضرورت تھی۔ اس نے دادی کو بتایا کہ اسے نئی کاپیاں چاہئیں ورنہ وہ اسکول کا کام نہیں کر سکے گا۔

''اور بھی بہت کچھ چاہئے ہے بیٹا۔'' دادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''خدا امدو کو نیکی دے..... یہ کچھ کریں تو گھر کی گاڑی چلے۔''

ابا کوئی دن کے گیارہ بجے سو کر اٹھے تو دادی نے ان کو چائے وغیرہ دینے کے بعد ان کو بتایا کہ ''آٹا ختم ہو چکا ہے۔ چاول اور دال بھی نہیں ہیں اور ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں بچا ہے۔ فیضو کو کاپیوں کی ضرورت ہے ورنہ اسکول کا کام نہیں کر سکے گا۔''

''کوشش تو کر رہے ہیں کہ کوئی ہماری مرضی کا کام مل جائے۔'' ابا نے کہا۔

''مرضی کی شرط چھوڑو۔'' دادی نے بگڑ کر کہا۔ ''کچھ بھی کرو' پیسے لاؤ' اب تمہاری جورو نہیں بیٹھی ہے جو کما کر لائے اور تم گھر میں پڑے اینڈتے رہو۔ اب اگر کام کرو گے تو گھر میں چولہا جلے گا۔ کل کے لیے کوئی بندوبست کرو۔''

''تم ایسا کرو اماں' کہیں سے کچھ پیسے ادھار لے کر کام چلاؤ۔'' ابا نے کہا۔ ''ہم دیکھتے ہیں کچھ نہ کچھ کریں گے۔''

''ارے ادھار کس برتے پر لیں؟'' دادی نے ناراضگی اور الجھن کے ساتھ کہا۔ ''واپس کرنے کی کوئی سبیل ہو تو ادھار مانگیں بھی کسی سے.....''

''سبیل بھی نکالیں گے اماں۔'' ابا نے کہا۔ ''تم کہیں سے بندوبست کر لو۔''

دادی نے کچھ عارضی بندوبست کر لیا۔ گھر میں کھانے کی تھوڑی بہت چیزیں بھی آ گئیں اور فیضو کے لیے کاپیاں بھی آ گئیں' لیکن ابا نے گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں لا کر دی۔

اور پھر یوں ہوا کہ ابا نے راتوں کو گھر سے غائب ہونا شروع کر دیا۔ وہ کئی کئی دن کے لیے گھر سے غائب ہو جاتے اور ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ کسی بڑے کام کا بندوبست کر رہے ہیں۔

دادی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں اور اپنی بھاگ جانے والی بہو کو کلپ کلپ کر کوسنے اور گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ ابا کو بھی خوب برا بھلا کہتیں۔

''ارے اگر اور کسی کا نہیں تو اپنے اس معصوم بیٹے کا ہی خیال کر لے بدنصیب۔'' انہوں نے ایک دن ابا سے کہا جو پورے تین دن غائب رہنے کے بعد ذرا دیر کے لیے گھر آئے تھے۔ ''اس ایک بیٹے کے علاوہ تیرا اور ہے ہی کون؟ یہ پڑھ لکھ لے گا تو کل یہی تیری لاٹھی بنے گا۔''

''اس کو کہیں کام پر بٹھا دو اماں۔'' ابا نے فیضو کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی عمر کے سینکڑوں لڑکے سینکڑوں طرح کے کام کرتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کا خرچہ چلاتے ہیں۔''

دادی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابا کو دیکھنے لگیں۔ ان کو اپنے کانوں پر جیسے اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

''کیا؟ کیا کہہ رہے ہو امدو؟'' دادی نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ..... یہ کام کرے گا؟ اور تم کو روٹیاں کھلائے گا؟ اور تم؟ تم بے غیرت..... جورو کی روٹیاں توڑتے رہنے کے بعد اب معصوم بچے کی روٹیاں توڑو گے؟ اے تف ہے تمہاری اوقات پر..... نہ جانے کون سی مٹی کے بنے ہوئے ہو۔''

''ارے میں نے کون سا بھس ملو دیا اماں؟'' ابا نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''اس کراچی شہر میں ہزاروں لڑکے کام کرتے ہیں۔ خود ہماری بستی کے بہت سے لڑکے کام کرتے ہیں اور بڑے آرام سے روپیہ دھیلا روز کما لیتے ہیں۔ اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو یہ کام نہیں کر سکتا؟''

''اور تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو تم کام نہیں کر سکتے؟'' دادی نے غصے میں کہا۔

''ہم کوشش میں لگے ہوئے ہیں اماں.....'' ابا نے وہی گھسا پٹا جملہ دہرایا۔ ''جلد ہی ہمیں ہماری مرضی کا کام مل جائے گا۔ اب تم ذرا جلدی سے روٹی دے دو..... مجھے جانا ہے۔''

ابا زیادہ سے زیادہ گھر سے غائب رہنے لگے۔ اماں تو پہلے ہی غائب ہو چکی تھیں۔ اتنے دن گزر گئے تھے اور اماں کے بارے میں کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ فیضو کی زندگی میں ماں اور باپ دونوں ہی محض اذیت اور عذاب کی علامت بن کر رہ گئے تھے۔

دادی نے کچھ دن تک کسی نہ کسی طرح گزارہ کیا۔ گھر کی کچھ چیزیں' کچھ پرانے برتن وغیرہ فروخت کیے کچھ قرض لیا لیکن اس طرح کام نہیں چل سکتا تھا۔ آمدنی کی کوئی مستقل صورت ہونی چاہیے تھی۔

غربت تھی کہ چاروں طرف سے ابلی پڑی تھی۔ فیضو کو کچھ کتابوں اور کاپیوں کی ضرورت تھی۔ اس کی قمیصیں پھٹ رہی تھیں۔ اسکول جانے کے لیے کم از کم ایک تو ثابت اور اچھی قمیص ہونی چاہیے تھی۔ گھر میں تو کھانے تک کو کچھ نہیں تھا خاک اُڑ رہی تھی۔

اس روز صبح کو دادی نے صرف فیضو کو ناشتا دیا۔ ناشتا بھی کیا ہوتا تھا؟ ایک پیالی چائے اور رات کی بچی ہوئی گرم کی ہوئی باسی روٹی' جسے چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا لیا جاتا تھا۔ دادی نے اپنے لیے تو چائے بھی نہیں بنائی تھی۔

فیضو چائے میں ڈبو ڈبو کر روٹی کھا رہا تھا کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ دادی کے آگے نہ تو چائے کی پیالی ہے نہ روٹی..... وہ ایک پٹرے پر اس کے سامنے خاموش بیٹھی تھیں۔

''ارے؟'' فیضو نے چونک کر کہا۔ ''تم..... تم ناشتا کیوں نہیں کر رہی ہو دادی؟''

''تم کر لو۔'' دادی نے آہستہ سے کہا۔ ''ہم بعد میں کر لیں گے۔''

''بعد میں؟'' فیضو نے روٹی کی خالی ڈلیا میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اسے ٹٹول کر کہا۔ ''مگر اس میں تو کوئی روٹی نہیں ہے دادی؟ ہاں' مجھے یاد آیا' رات کو تو روٹی بس ایک ہی بچی تھی۔''

''ہم پکا لیں گے۔'' دادی نے کہا۔ ''تم جلدی سے کھا کر اسکول جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔''

فیضو کو معلوم تھا کہ گھر میں آٹا نہیں ہے۔ رات کو بھی دادی نے روٹی کم پکائی تھی اور اب دوپہر کو کھانے کے لیے وہ نہ جانے کہاں سے آٹے کا بندوبست کریں گی۔

وہ جب اپنا میلا کچیلا تھیلا کندھے پر ڈال کر اسکول کے لیے گھر سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس نے اپنی ماں اور باپ دونوں کے لیے اپنے دل میں شدید نفرت محسوس کی۔

فیضو کو بستی کے باہر بس اسٹاپ کے قریب انیس کھڑا ہوا ملا۔ انیس اسی بستی میں رہتا تھا۔ کسی درزی کی دکان پر کام کرتا تھا۔ انیس کے بارے میں بستی میں کچھ عجیب عجیب سی باتیں مشہور تھیں والدین اپنے لڑکوں کو انیس سے ملنے جلنے سے روکتے تھے۔

فیضو کو دیکھ کر انیس جلدی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ ''امدو تمہیں اور تمہاری دادی کو فاقوں مار دے گا۔'' انیس نے فیضو سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''وہ کوئی کام دھندا نہیں کرے گا۔ وہ تو سارا دن جوئے خانے کی چاکری کرتا ہے جہاں اس پر جوئے میں ہاری ہوئی رقم کا بہت بڑا قرضہ چڑھا ہوا ہے وہ مر بھی جائے گا تو یہ قرضہ نہیں اتار سکے گا اور تمہاری اماں.....'' انیس نے عجیب انداز میں آنکھیں مٹکائیں۔ ''وہ تو نہ جانے کہاں عیش کر رہی ہو گی۔ بھئی' تو پھر تم بھی عیش کیوں نہیں کرتے؟ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی ہو گی۔ تم ایسا کرو' شام کو کچھ دیر کے لیے میرے پاس آ جایا کرو میں تمہیں کچھ نہ کچھ پیسے دے دیا کروں گا۔ کم از کم روٹی تو پک جائے گی تمہارے گھر میں۔''

یہ سب کچھ کہتے وقت انیس کی گدلی گدلی آنکھوں میں ایک ایسی مُردار سی چمک نمودار ہوئی جسے دیکھ کر فیضو لرز گیا۔ اسے انیس کی صورت بھی اس وقت بہت گھناؤنی لگی۔

''اگر ابھی روٹی کھانی ہو تو چلو میرے ساتھ۔'' انیس نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''کل تمہاری دادی رفیق کی دکان سے آٹا ادھار مانگ رہی تھیں۔ رفیق نے انکار کر دیا تھا۔ وہ پچھلے پیسے مانگ رہا تھا۔ روٹی تو تمہارے گھر میں پکی نہیں ہو گی۔ چلو میرے ساتھ..... تمہیں حلوہ پوری کھلاؤں گا۔''

''میں روٹی کھا چکا ہوں۔'' فیضو نے جلدی سے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ انیس کے ہونٹوں پر ایک بڑی پُراسراری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ جاتے ہوئے فیضو کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس دن فیضو کا دل سکول میں پڑھائی میں بالکل نہیں لگا۔ اسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ گھر میں آٹا نہیں ہے' دوپہر کو روٹی کہاں سے پکے گی۔ وہ مسلسل یہ سوچے جا رہا تھا کہ دادی کو صبح باسی روٹی کا ٹکڑا بھی کھانے کو نہیں مل سکا تھا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد فیضو سیدھا گھر نہیں آیا۔ آج وہ اپنے بارے میں ایک دم فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اسکول سے واپسی پر بس اسٹاپ کے پاس گاڑیوں کے پنکچر بنانے والی ایک دکان پر رک گیا۔

اس دکان میں گاڑیوں کے ٹائروں کی مرمت کی جاتی تھی۔ پنکچر لگائے جاتے تھے۔ ٹائروں میں ہوا بھری جاتی تھی۔ چند روز پیشتر اس نے اس طرف سے گزرتے ہوئے دکان کے مالک کو کسی سے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ اسے دکان پر کام کرنے کے لیے ایک ایسے لڑکے کی ضرورت ہے جو گاڑیوں کے انگریزی میں لکھے ہوئے نمبروں کو بھی پڑھ سکتا ہو۔ اکثر لوگ بنوانے کے لیے ٹائر چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور ٹائر پر چاک سے گاڑی کا نمبر ڈال دیا جاتا تھا۔

فیضو پھٹی قمیص پہنے اور بوسیدہ تھیلا کاندھے پر لٹکائے ٹائر والے کی دکان پر رکا اور اس نے مالک سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ اس کے ہاں کام کرنا چاہتا ہے۔

دکان کے مالک نے سر سے پاؤں تک فیضو کو بغور دیکھا۔ وہ صاف طور سے ایک مفلوک الحال' غریب طالب علم معلوم ہوتا تھا۔

''تم تو پڑھتے ہو؟'' مالک نے اس کے کتابوں کے تھیلے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں' میں پڑھتا ہوں۔'' فیضو نے جواب دیا۔

''تو پھر کام کیسے کرو گے؟'' مالک نے پوچھا۔

''میں اسکول سے واپس آنے کے بعد کام کروں گا۔'' فیضو نے کہا۔ ''ابھی میں اسکول سے ہی آ رہا ہوں۔ اس وقت چھٹی ہو جاتی ہے۔''

دکان کے مالک کے سوالوں کے جواب میں فیضو نے اسے بتایا کہ اس کا باپ ایک عرصے سے بیروزگار ہے اور اس لیے وہ خود کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ ماں کے بارے میں بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

دکان کے مالک کے ساتھ سارے معاملات طے ہو گئے اور دکان کے مالک نے فیضو

سے کہا کہ وہ اگلے دن سے کام پر آ جائے اور یہ کہ اسے دوپہر سے لے کر مغرب کے بعد تک کام کرنا ہوگا۔

مغرب کے بعد تک کام کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ماسٹر راشد زبیری کے ہاں پڑھائی ختم۔ ویسے بھی یہ پڑھائی اب جاری نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ ماسٹر صاحب کی فیس دینے کے لیے پیسے موجود نہ تھے۔ تاہم وہ خوش تھا۔ وہ خوش تھا کہ اب اس کو اور دادی کو بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔ آج دادی بھوکی تھیں اور گھر میں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی موجود نہ تھا۔ کل وہ وخود اسی طرح بھوکا ہوگا اور گھر میں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی موجود نہ ہوگا۔ پھر کیا ہوگا؟ کیا وہ پیالہ ہاتھ میں لے کر گھروں گھروں بھیک مانگتا پھرے گا؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... یہ کس قدر خوفناک قسم کا غم تھا۔

مگر اس کے ساتھ ہی وہ خوش تھا..... اسے کام مل گیا تھا۔ اس نے ماں اور باپ دونوں کے ناموں پر باری باری لعنت بھیجی اور انہیں اپنے دماغ کی دہلیز سے دھکا دے کر بہت دور پھینک دیا۔

''اب ہم دادی کو خوشخبری دیں گے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''انہیں جب معلوم ہوگا کہ کل سے ہم کام پر جائیں گے تو انہیں کس قدر خوشی ہوگی''

وہ فوری طور پر دادی کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا کھانا وغیرہ کھانے کے بعد اطمینان سے دادی کو خوش دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ دادی سے بات ہی نہ کر سکا۔

کچھ عورتیں دادی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ کپڑوں وغیرہ کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ فیضو کو ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دادی نے اس کو کھانا دیا۔ فیضو کو یہ دیکھ کر بڑی غم انگیز خوشی ہوئی کہ گھر میں کھانا موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دادی نے کہیں نہ کہیں سے کچھ بندوبست کر لیا تھا' عورتیں دادی کے پاس سے رخصت ہو کر جا چکی تھیں۔ دادی نے بھی اس کے ساتھ ہی کھانا کھا لیا۔ فیضو نے دادی سے یہ نہیں پوچھا کہ انہوں نے یہ بندوبست کس طرح کیا تھا۔ وہ کھانا ختم کرنے کے بعد دادی کو خوشخبری سنانا چاہتا تھا کہ اب وہ کمائی کرے گا اور انہیں کسی اماں یا ابا کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کھانا کھانے کے بعد جب فیضو نے دادی کو اپنے بارے میں بتایا تو وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

''ارے..... تم نے ہم سے پوچھا بھی نہیں اور خود ہی دکان پر بات بھی کر آئے.....''

''ہم کیا کرتے دادی؟'' فیضو نے آہستہ سے کہا۔ ''صبح تمہارے کھانے کے لیے روٹی

کا ایک نوالہ بھی نہیں تھا۔اس وقت تم نے کسی سے ادھار لے کر ہی کچھ بندوبست کیا ہو گا۔نہیں دادی.....اس طرح بھلا کیسے گزارہ ہوسکتا ہے؟کل رفیق دکاندار نے بھی تمہیں ادھار دینے سے انکار کردیا تھا۔''

''لیکن تمہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔'' دادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''تم ماسٹر راشد زبیری کے پاس بھی پڑھنے کے لیے جاتے رہو۔کام کا بندوبست ہم نے کرلیا ہے۔ہم کام کریں گے۔اب ہمارے گھر میں پیسے آئیں گے۔''

''تمہارے کام کرنے سے؟'' فیضو نے انتہائی حیرت کے عالم میں کہا۔''تم کیا کام کروگی دادی؟''

''ہم کپڑے سیئں گے بیٹا۔'' دادی نے کہا۔''ابھی جو عورتیں ہمارے پاس بیٹھی تھیں' ان سے یہی بات طے ہوئی ہے۔زبیدہ اور شہناز کسی دکاندار کے لیے کام کرتی ہیں اور وہاں ایک عورت کی ضرورت ہے۔کیونکہ کام بڑھ رہا ہے۔ہم نے دو تین دن پہلے ہی زبیدہ سے کہا تھا۔انہوں نے کہا تھا کہ وہ دکاندار سے معلوم کرکے بتائیں گی۔اب ہم بھی زبیدہ اور شہناز کے ساتھ کام کیا کریں گے۔خدا کا شکر ہے کہ گزارے کی صورت نکل آئے گی۔تم تو بس اپنی پڑھائی کرتے رہو.....''

''مگر دادی.....تم.....''

''ارے ہم زبیدہ اور شہناز سے زیادہ کام کرسکتے ہیں اس عمر میں بھی۔'' دادی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔''مشکل تو یہ ہے کہ ہمارے پاس سلائی مشین نہیں ہے۔اس لیے ہم صرف ہاتھ کا کام کرسکتے ہیں' جس میں وقت بھی زیادہ لگے گا۔اگر مشین ہوتی ہمارے پاس تو ہم کام کرکر کے ڈھیر لگادیتے۔خیر۔اب بھی بہت کام کرلیں گے اور تم صرف پڑھائی کرو۔''

فیضو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔دادی اتنی بوڑھی ہوکر کام کرنے کے لیے تیار تھیں کیونکہ انہیں اس چھوٹے سے گھر کو فاقوں سے بچانا تھا۔

''ایسا کرتے ہیں دادی.....'' اس نے ایک مفاہمانہ راہ نکالتے ہوئے کہا۔''تم بھی کام کرو اور ہم بھی کام کرتے ہیں' دونوں مل کر پیسے کمائیں گے اور.....''

''نہیں بیٹا۔'' دادی نے اس کی بات کو فوراً کاٹ دیا۔''صرف ہم کام کریں گے اور تم صرف پڑھو گے۔جب تک ہمارے ہاتھ پیر چل رہے ہیں' کچھ نہ کچھ کرلیں گے اور جب آنکھ بند ہوگئی تو اللہ مالک ہے۔خدا تمہارے باپ کو نیک توفیق دے' مگر دیکھو.....اپنے باپ

سے ہرگز نہ کہنا کہ ہم نے کپڑے سینے کا کام شروع کردیا ہے' ورنہ وہ پھر سر پر آکھڑا ہوجائے گا کہ لاؤ پیسے.....سب کچھ جوئے میں بہادے گا۔''

فیضو تو پہلے ہی ابا کو ہمیشہ کے لیے دھتکار چکا تھا۔دادی کی بات سن کر اس نے برا سا منہ بنایا۔''ابا کو کبھی ایک پیسہ بھی مت دینا دادی.....وہ بہت ہی برے ہیں۔''

کچھ دیر کے بعد وہ ماسٹر راشد زبیری کے پاس پڑھنے کے لیے چلا گیا۔وہاں سے پڑھائی ختم کرکے جب گھر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں شوکت چچا' شمسن چچی اور شاکرہ موجود ہیں۔

''لو یہ آگیا ہے۔'' دادی نے شوکت چچا سے مخاطب ہوکر' فیضو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''تم خود ہی پوچھ لو.....ویسے ہم نے اس کو منع کردیا ہے۔''

''تم بشیر ٹائر والے کی دکان پر گئے تھے وہاں کام کرنے کے لیے؟'' شوکت چچا نے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' فیضو نے جواب دیا۔''ہم تو اس سے پوری بات کرکے آگئے تھے۔یہ طے ہوا تھا کہ اسکول سے واپسی کے بعد ہم اس کی دکان پر آجایا کریں گے۔''

''اگر تم دکان پر کام کرنے لگو گے تو تمہاری پڑھائی کا سخت نقصان ہوگا۔'' شوکت چچا نے کہا۔

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا چچا۔'' فیضو نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔''اماں تو ہیں نہیں' ابا کچھ کرتے نہیں' تو پھر ہم لوگ کہاں سے کھائیں؟''

''بڑی ہمت والے لڑکے ہو۔'' شمسن چچی نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔''خود اپنی مرضی سے کام کرنے کو تیار ہو' ورنہ ماں باپ تو لڑکوں کو زبردستی کام پر بھیجتے ہیں اور لڑکے کام سے بھاگتے ہیں۔''

''تمہیں ٹائر کی دکان پر کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شوکت چچا نے کہا۔''مجھے رحمت نے بتایا تھا کہ تم بشیر کی دکان پر کام کی تلاش میں گئے تھے اور ہم لوگ اسی وقت یہاں آئے ہیں۔فخرن خالہ بتارہی ہیں کہ زبیدہ کی مدد سے انہیں کپڑے سینے کا کام مل رہا ہے۔''

''ہاتھ کا جو بھی کام ہوگا وہ ہم بہت آسانی سے کرلیں گے۔'' دادی نے شمسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''اگر ہمارے پاس مشین ہوتی تو ہم اور بھی زیادہ کام کرسکتے تھے۔''

''فخرن خالہ میں تمہارے لیے مشین کا بھی بندوبست کردوں گا۔'' شوکت چچا نے کہا۔''ایک جاننے والے ہیں۔وہ سلائی مشینوں کی مرمت کا کام کرتے ہیں۔ان کے پاس

پرانی مشینیں بکنے کے لیے آتی ہیں۔ میں کوئی لے کر تمہیں دے دوں گا۔"

"ارے نہ بھیا! ابھی تو یہاں روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم مشین کے لیے پیسے کہاں سے لائیں گے؟"

"تم سے پیسے کون مانگ رہا ہے فخرن خالہ؟" شوکت چچا نے کہا۔ "ابھی تم اپنا کام چلاؤ..... بعد میں دیکھی جائے گی۔"

"ارے اللہ تم کو جیتا رکھے بھیا۔" دادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کتنا بڑا احسان کرو گے تم ہم پر اور اس بے سہارا بچے پر....."

"اور ایک بات اور۔" شوکت چچا نے کہا۔ "بس تم دو ہی تو آدمی ہو گھر میں..... میں کوئی نہ کوئی سبزی روزانہ تمہارے گھر بھجوا دیا کروں گا' پکا لینا۔ تمہیں سبزی ترکاری کے لیے پیسے نہیں خرچ کرنے پڑیں گے۔"

"اے شوکت حسین' اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ ہماری گردن ہی ٹوٹ جائے۔" دادی نے کہا۔ "اتنا زیادہ....."

"نہیں فخرن خالہ۔" شمسن چچی نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "فیضو ہمارے بچوں کی طرح ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس کی پڑھائی چھوٹ جائے۔ یہی تو عمر ہوتی ہے لکھنے پڑھنے کی۔ اگر یہ عمر نکل جائے تو پھر پچھتاووں کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے؟"

"ہم تو بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں تم لوگوں کے لیے فخرن خالہ....." شوکت چچا نے کہا۔ "لیکن تم تو جانتی ہو..... ہم خود کتنے غریب ہیں۔ ماشاء اللہ سے چار بچے ہیں ہمارے بھی..... اور دو ہم میاں بیوی۔ چھ کھانے والے ہیں اور میں اکیلا کمانے والا ہوں۔ وہ تو سبزی ترکاری کے علاوہ کچھ اور چھوٹے موٹے دھندے بھی کر لیتا ہوں تو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر گزارہ ہو جاتا ہے۔"

"اللہ تمہاری روزی میں برکت دے شوکت حسین!" دادی کی آواز بھرا رہی تھی۔ "تم انسان نہیں فرشتے ہو۔ خدا تمہیں اور تمہاری آل اولاد کو ہمیشہ خوش رکھے۔"

"بس فخرن خالہ' آدمی سب کچھ اولاد کے لیے ہی تو کرتا ہے۔" شوکت چچا نے کہا۔ "ہم اپنی تو کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیں گے۔ اولاد کی زندگی بنا دینا چاہتے ہیں۔ ہم کوئی خاندانی رئیس تو ہیں نہیں جو اولاد کے لیے دولت اور جائیداد چھوڑ جائیں۔ جو ہم ان کے لیے کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ ہم ان کو پڑھا لکھا دیں۔ اگر ان کے پاس تعلیم ہو گی تو یہ لوگ ضرور اچھی زندگی گزار سکیں گے۔ تعلیم ہے تو سب کچھ ہے۔ بہت سے لوگ اس بات کو ابھی نہیں سمجھ

رہے ہیں۔ مگر ہم سمجھ رہے ہیں فخرن خالہ اور اسی لیے ہم اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔ ارے آج وہ جھگی میں رہ رہے ہیں تو ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔ خدا کبھی ہمارے دن بھی پھیرے گا۔"

"ضرور پھیرے گا۔" دادی نے پُر زور انداز میں کہا۔ "کیوں نہیں پھیرے گا..... یہ پڑھ لکھ کر بڑے ہو جائیں گے تو ان کو نوکریاں بھی ملیں گی' عزت بھی ملے گی' پیسہ بھی ملے گا' سب کچھ ملے گا۔"

"اور ہم فیضو کو بھی اپنے بچوں میں شامل سمجھتے ہیں فخرن خالہ۔" شمسن چچی نے کہا۔ "ماسٹر راشد زبیری تو اس کی اتنی تعریف کرتے ہیں کہ کچھ پوچھو مت۔ وہ تو کہتے ہیں کہ یہ بہت ذہین بچہ ہے اور بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔"

"خدا اس کی قسمت اچھی کرے۔" دادی نے ایک لمبی اور گہری سانس بھر کر کہا۔ "اماں باوا نے تو اس کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ پڑھائی کہاں سے جاری رہتی۔ خدا نے تم لوگوں کے دل میں نیکی ڈالی جو تم نے ہمارے حال پر ترس کھایا۔"

"فخرن خالہ' تم نے تو خود ہمت کی۔" شوکت چچا نے کہا۔ "اور اس لڑکے کی ہمت دیکھو..... یہ بھی تو کسی کے کہے بغیر خود ہی کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا ورنہ اس عمر میں لڑکوں میں کہاں اتنی سمجھ ہوتی ہے۔"

"پیٹ کی مار ساری سمجھ پیدا کر دیتی ہے بھیا۔" دادی نے کہا۔ "وہ بے چارہ یہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟"

"ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں کہ فیضو جیسے ذہین بچے کم ہی ہوتے ہیں۔" شاکرہ نے جو اب تک بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی' فیضو کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ لوگ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں ابھی شاکرہ کے ہاتھ کچھ سبزیاں بھجوا دیتا ہوں۔" شوکت چچا نے دادی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "پکا لینا..... کل اور بھجوا دوں گا اور تمہارے لیے مشین کا بندوبست بھی اللہ نے چاہا تو دو چار روز میں کر دوں گا۔"

ان لوگوں کے جانے کے بعد ایک دم دادی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ "ہائے یہ ناس پیٹی تقدیر۔" انہوں نے فیضو کو کلیجے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ارے ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ہم بھیک خیرات پر گزارہ کریں گے..... لوگ ہم پر رحم کھا کر ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر کچھ نہ کچھ رکھ دیں۔"

''مگر دادی.....ہم نے تو کسی سے بھیک نہیں مانگی۔'' فیضو نے سہم کر کہا۔ وہ دادی کے دکھ کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ہم تو خود کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کسی سے کچھ مانگ تھوڑی رہے ہیں۔''

''ارے مرجائے خدا کرے یہ افسری۔'' دادی نے ایک بار پھر اماں کو کوسنا شروع کر دیا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جس دادی اماں کو یاد نہ کرتی ہوں' لیکن یہ یاد ہمیشہ گالیوں اور کوسنوں میں لپٹی ہوئی اور نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی ہوتی تھی۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی شدو مد کے ساتھ اماں کو یاد کر رہی تھیں۔ ''خدا کرے مرتے وقت کلمہ بھی نصیب نہ ہو بد ذات کو.....حلق میں کوئی دو بوند پانی ٹپکانے والا بھی نہ ہو.....ایسی ماں بھی کوئی ہوتی ہوگی۔ ظالم کے دل میں اولاد کے لیے ذرا سی بھی محبت نہیں.....ارے کھڑے قد سے بجلی گرے اس پر.....کسی کی آئی ہو اس کو آجائے۔''

دادی کچھ دیر تک تو رو رو کر اماں کو کوستی رہیں اور اس کے بعد انہوں نے ابا کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ''اس مرنے جوگے کو دیکھو.....بے حیا ہڈی.....جورو کی کمائی کھا کھا کر اینڈتا رہا۔ ارے اس سے تو اچھا تھا کہ ہم سب کو زہر دے دیتا بد نصیب۔ ایک ساتھ ہی مرجاتے ہم سب لوگ اور زندگی کے عذاب سے چھوٹ جاتے۔ اب جوئے خانے میں جھاڑو دیتا پھرتا ہے اور ہمیں چھوڑ دیا ہے اللہ کی راہ میں.....ارے یہ تو پیدا ہوتے ہی مرجاتا تو اچھا تھا۔''

دادی بڑی دیر تک ابا کو برا بھلا کہتی رہیں۔ فیضو نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے اب اماں ابا کے ذکر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ان دونوں کو مُردوں میں شامل کر دیا تھا۔ ہاں' زندہ لوگوں میں دادی تھیں اور شوکت چچا اور شمسن چچی تھیں اور شاکرہ تھی۔ ان لوگوں کی زندگی اس کے لیے کوئی معنی رکھتی تھی۔

دادی بک جھک کر خاموش ہوگئیں اور اس کے بعد وہ سوئی تاگا لے کر ایک قمیص کے دامن کی ترپائی کرنے بیٹھ گئیں۔

''ذرا دیر میں اندھیرا ہوجائے گا۔'' انہوں نے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ''اب آنکھوں میں بھی تو جان نہیں رہی ہے۔ رات میں کم نظر آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کام دن کی روشنی میں ہی کرنا ہوگا۔''

دادی قمیص سینے لگیں اور فیضو جنرل سائنس کی کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ اماں کے جانے کے بعد سے اس نے فالتو وقت میں باہر نکل کر بستی کے لڑکوں کے ساتھ گلیوں اور میدان میں کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ تنہائی پسند ہوتا جا رہا تھا اور زیادہ تر وقت پڑھنے میں

صرف کرتا تھا۔ کورس کی کتابیں پڑھنے کے علاوہ وہ دوسری اور قصے کہانیوں کی کتابیں بھی پڑھا کرتا تھا جو اسے ماسٹر راشد زبیری کے پاس سے مل جاتی تھیں۔ جنہیں طرح طرح کی کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے ہی والا تھا کہ دروازے سے شاکرہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک میلا کچیلا سا تھیلا تھا۔

''ابا نے ترکاری بھجوائی ہے۔'' اس نے وہ تھیلا دادی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تھیلا خالی کر کے دے دو.....کل اس میں پھر ترکاری لاؤں گی۔''

''اچھا.....ابھی دیتے ہیں۔'' دادی نے کہا اور تھیلے میں سے ترکاری نکال کر خالی تھیلا واپس شاکرہ کو دے دیا۔

''تم کیا پڑھ رہے ہو فیضو؟'' شاکرہ نے فیضو سے کہا' جس نے شاکرہ کو دیکھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دی تھی۔

''ہم.....ہم یہ منشی پریم چند کی کہانیوں کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔'' فیضو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ماسٹر صاحب کے پاس سے لائے تھے بڑے مزے کی کہانیاں ہیں۔''

''تمہاری سمجھ میں آتی ہیں؟'' شاکرہ نے پوچھا۔

''لو بھلا' سمجھ میں کیوں نہیں آئیں گی؟'' فیضو نے ہنس کر کہا۔ ''ہم تو ساری سمجھ لیتے ہیں اور ہمیں اچھی بھی بہت لگتی ہیں۔''

''تم اتنا زیادہ پڑھتے ہو تبھی تو تمہیں ماسٹر صاحب اتنا پسند کرتے ہیں۔'' شاکرہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور خالی تھیلا لے کر چلی گئی۔

شاکرہ کو نہیں معلوم تھا کہ یہی تو وہ خوبی تھی جس کی وجہ سے اس کے والدین فیضو کی اتنی زیادہ مدد کرنا چاہتے تھے۔ شاکرہ اور مسعودہ.....دونوں اسکول جاتی تھیں۔ دونوں کو تعلیم دلوانی اور پھر ان کے لیے تعلیم یافتہ شوہر چاہئے تھے.....تو کم از کم ایک کو تو ابھی تلاش کر ہی لیا گیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ ایک دن پڑھ لکھ کر کچھ حیثیت حاصل کر لے گا اور تب وہ ان کی مہربانیوں اور حسنِ سلوک کو فراموش نہیں کرے گا۔

اگلے دن فیضو نے بشیر ٹائر والے سے کہہ دیا کہ وہ فی الحال اس کی دکان پر کام نہیں کرے گا' کیونکہ اس کی پڑھائی کا نقصان ہوگا۔

☆======☆======☆

اس روز سے فیضو کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا۔ اب دادی نے کمانا شروع

کر دیا تھا۔ پہلے اماں کماتی تھیں اور گھر میں چار افراد کی کفالت کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر تھی۔ اب اماں چلی گئیں تو کچھ ہی دنوں بعد کفالت کی ذمہ داری بوڑھی دادی کے کاندھوں پر آپڑی۔ شوکت چچا نے گھر کی ہانڈی کی ذمہ داری قبول کر لی تھی اور وہ روز ترکاری بھجوا دیتے تھے۔

اب گھر باقاعدگی سے کھانا پکتا تھا۔ صبح کو ناشتے میں چائے کے ساتھ باسی روٹی دادی کے لیے بھی موجود ہوتی تھی۔ دوپہر کو جب فیضو اسکول سے گھر واپس آتا تو دادی اسے کوئی نہ کوئی کپڑا سیتی ہوئی نظر آتیں۔ نظر کی کمزوری کی وجہ سے انہیں کافی جھک کر سلائی کرنی پڑتی تھی لیکن وہ بڑی محنت کے ساتھ اپنے کام میں لگی رہتی تھیں۔

ایک ہفتے کے بعد شوکت چچا نے ایک پرانی سی سلائی مشین دادی کو لا کر دے دی اور اس دن دادی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انہیں ساری دنیا کا خزانہ مل گیا ہو۔ انہوں نے شوکت چچا کو ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔

اس دن سے دادی کی روزی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اب مشین پر کام کرتی تھیں اور کم وقت میں زیادہ کام کر لیتی تھیں۔ وہ اس پرانی مشین کا کسی ننھے منے پیارے سے بچے کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ دن میں کئی بار اس کی جھاڑ پونچھ کرتیں۔ زبیدہ اور شہناز بھی دادی سے خوش تھیں۔ کام بڑھتا جا رہا تھا اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت تھی۔

اگرچہ اب نیم فاقہ کشی کا زمانہ گزر چکا تھا' لیکن غریبی کی یورش جوں کی توں تھی۔ معمولی معمولی چیزوں کے لیے ترس ترس کے زندہ رہنا پڑتا تھا۔ فیضو کے پاس صرف تین جوڑے تھے' جنہیں دھو کر کام چلایا جاتا تھا اور دادی کے پاس تو پھٹے پرانے کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ کتنا زمانہ گزر گیا تھا کہ ان کے لیے کوئی نیا کپڑا نہیں بنا تھا۔ مگر یہی کیا کم تھا کہ روٹی تو مل رہی تھی اور فیضو کی پڑھائی چل رہی تھی۔ اور اب تو فیضو کے گھر کے خراب حالات کے پیشِ نظر ماسٹر راشد زبیری نے اس کی فیس بالکل معاف کر دی تھی..... شوکت چچا کے گھر سے روز ترکاری آتی تھی اور کبھی کبھی تو شمسن چچی پکا کر بھی بھیج دیتی تھیں..... بعض اوقات فیضو کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک ایسا بھکاری ہے جس پر ساری دنیا ہنس رہی ہے..... خاص طور سے اس وقت جب شاکرہ ترکاری کا تھیلا لے کر اس کے گھر آتی تھی۔

ابا اس دن بہت دنوں کے بعد آئے۔ وہ شام کے وقت آئے تھے۔ فیضو گھر پر ہی موجود تھا۔ ابا بہت ہی برے حلیے میں تھے۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال بری طرح بڑھے ہوئے تھے اور کپڑے میلے تھے۔ آنکھیں گدلی گدلی ہو رہی تھیں اور چہرے پر جیسے خاک اُڑ

رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر فیضو کے دل میں کراہیت اور بیزاری کے علاوہ اور کوئی جذبہ بیدار نہ ہوا۔

''آج تم کو ہم لوگوں کی یاد کیسے آ گئی؟'' دادی نے ان سے کڑوے کسیلے لہجے میں سوال کیا۔

''میں..... دراصل باہر گیا ہوا تھا۔'' ابا نے رک رک کر کہا۔ ''اب آ گیا ہوں۔ بس' اب میں یہیں رہوں گا' اب کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''اور کھاؤ گے کہاں سے؟'' اماں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ کروں گا اماں۔'' ابا نے کہا۔ ''آخر تم نے بھی تو کپڑے سینے کا کام شروع کر دیا ہے۔''

''اگر نہ کرتے تو کیا کرتے؟'' دادی نے کہا۔ ''تم نے تو ہم لوگوں کو فاقوں سے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا اماں۔'' ابا نے کہا۔ ''میں اب کام کروں گا۔''

''سیدھی اور صاف بات یہ ہے امدو کہ اگر کام کرو گے تو یہاں رہو گے۔'' دادی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور اگر کچھ کمائی نہیں کرتے تو اپنا راستہ پکڑو۔ ہم تمہارے بغیر جیسے تیسے جی لیں گے۔ ہماری بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم نہیں ہے کہ تم کو بھی کھلائیں اور تمہاری اولاد کو بھی پالیں۔ اس عمر میں ہمیں اپنی آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر سلائی کرنی پڑتی ہے۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''ارے تم فکر مت کرو اماں۔'' ابا نے کہا۔ ''میں اب کام کروں گا..... خالی نہیں بیٹھوں گا۔''

ابا اور بھی بہت کچھ کہتے رہے' لیکن دادی نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور جہاں تک فیضو کا تعلق تھا تو اس نے تو ابا کی آمد کے واقعے کو قطعی طور سے نظر انداز کر دیا تھا۔

دادی باورچی خانے میں کام کرنے چلی گئیں اور ابا گھر کا جائزہ لینے لگے جہاں وہ اتنے دنوں کے بعد آئے تھے۔ گھر میں انہیں ایک نئی چیز نظر آئی..... اور وہ تھی سلائی مشین۔

''یہ مشین کہاں سے آئی ہے؟'' انہوں نے فیضو سے پوچھا۔

''شوکت چچا نے دادی کو دلوائی ہے کپڑے سینے کے لیے۔'' فیضو نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ وہ کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔

''اچھی ہے۔'' ابا نے مشین کے قریب جا کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم

ہوا تھا کہ اماں نے کپڑے سینے شروع کر دیئے ہیں۔"

"تم بھی کوئی کام کیوں نہیں کرتے ابا؟" فیضو نے سخت ناگوار لہجے میں کہا۔ "آخر سارے لوگ کام کرتے ہیں۔"

"کرتے تو ہیں بھئی۔" ابا نے کہا۔ "تھوڑا بہت تو کرتے ہیں' اب ذرا جم کر کریں گے۔"

ابا نے رات کا کھانا کھایا اور اس کے بعد لیٹ کر سو گئے۔ اگلی صبح کو جب فیضو اسکول جا رہا تھا تو ابا پڑے سو رہے تھے۔ دوپہر کو جب وہ گھر واپس آیا تو ابا جا چکے تھے۔ گھر کو ان کے وجود سے خالی دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے ابا کا آنا ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

ابا رات گئے گھر واپس آئے۔ آنے کے بعد انہوں نے کھانا مانگا۔ دادی نے ان کو کھانا دے دیا۔ اس کے بعد ابا نے دادی سے کچھ پیسے مانگے۔

"ایک ضروری کام پڑ گیا ہے اماں۔" انہوں نے کہا۔ "پیسے تو مجھے ملنے والے ہیں' دو چار روز میں مل جائیں گے۔ پھر میں تمہارے پیسے لوٹا دوں گا۔ ابھی تم میری ضرورت پوری کر دو۔"

"ہمارے پاس پیسے کہاں رکھے ہیں بھائی؟" دادی نے سرد اور خشک لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارا تو خود مانگے تانگے پر گزارہ ہو رہا ہے۔"

"بس دو چار دن کی بات ہے اماں۔" ابا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تو میرے پاس پیسے آ جائیں گے۔ میں تمہارے پیسے لوٹا دوں گا۔"

"نہ بھیا نہ۔" دادی نے کہا۔ "ہمارے پاس ہیں ہی نہیں' تم کو کہاں سے دیں گے؟"

ابا کافی دیر تک اصرار کرتے رہے' لیکن دادی نے انہیں پیسے دینے سے صاف انکار کر دیا۔

"ٹھیک ہے' پھر کل میں کوئی اور بندوبست کر لوں گا۔" ابا نے مایوسی اور بیزاری کے ساتھ کہا۔

"وہی ٹھیک ہو گا۔" دادی نے بے رخی کے ساتھ کہا۔ "کہیں اور سے بندوبست کر لو۔ ہمارے پاس تو بھیا گنی بوٹی اور نپا شوربہ ہوتا ہے۔ ہم تمہیں کیا دے سکتے ہیں؟ تمہاری اولاد کو پال رہے ہیں۔ یہ کیا کچھ کم ہے؟ تمہاری جورو سب کے منہ پر کالک پوت کر دفعان ہو گئی اور تم سے ایک پیسہ بھی نہیں کمایا جاتا..... تو آخر یہ بچہ کہاں جائے؟ ہے کوئی اس کے سر پر ہاتھ رکھنے والا؟ وہ تو خدا بھلا کرے زبیدہ کا کہ انہوں نے ہمیں کام دلوا دیا اور اللہ جیتا

رکھے شوکت حسین کو کہ انہوں نے ہمارے لیے مشین کا بندوبست کر دیا اور روز ترکاری بھجواتے ہیں' بغیر کوئی پیسہ کوڑی لیے ہوئے۔ سچ ہے بھیا کہ ایسے ہی لوگوں کے دم سے دنیا قائم ہے۔"

ابا کو دادی اس کی تقریر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دادی کی باتیں سن بھی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے پلنگ پر لیٹ کر اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے تھے اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

دادی لالٹین کی روشنی میں آنکھیں گڑو گڑو کر سلائی کا کام کرتی رہیں اور فیضو کتاب پڑھتا رہا۔ بستی میں گہرا سناٹا پھیل چکا تھا اور ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ زیادہ تر مکانوں میں چراغ گل ہو چکے تھے اور فضا میں سیاہی گھلتی جا رہی تھی۔

"بس بیٹا' اب سو جاؤ۔" دادی نے سلائی کا کام سمیٹتے ہوئے کہا۔ "ہم بھی اب کام بند کر رہے ہیں۔ رات کو لالٹین کی اتنی ہلکی روشنی میں ہم سے کام نہیں ہو پاتا۔ آنکھیں تھک جاتی ہیں۔"

"اگر ہمارا گھر اس بستی کے باہر کہیں ہوتا تو اس میں بجلی ہوتی۔" فیضو نے کہا۔ "اسکول میں زیادہ تر لڑکے تو بستی سے باہر کے ہیں۔ وہ پکے مکانوں میں رہتے ہیں اور ان کے گھروں میں بجلی ہے۔"

"خوب دل لگا کر پڑھتے رہو۔" دادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "چند سال کی بات اور ہے۔ دسویں کر لو تو پھر کہیں نہ کہیں نوکری مل جائے گی۔ ہاتھ میں دو پیسے آئیں گے تو پھر کہیں پکا کوارٹر بھی لے لینا۔ ہم اس دنیا میں رہیں یا نہ رہیں بیٹا' لیکن اگر تمہارے پاس تعلیم ہو گی تو تم ضرور اچھی زندگی بسر کر سکو گے۔ تمہارے ماں باپ نے تو تم کو کچھ نہیں دیا بیٹا' مگر تم اپنے آپ کو بہت کچھ دے سکتے ہو۔ بس دل لگا کر پڑھو اور جلدی جلدی امتحان پاس کرتے جاؤ۔"

"میں کبھی بھی فیل نہیں ہوں گا دادی۔" فیضو نے کہا۔ "مجھے تو ساری پڑھائی بہت آسان لگتی ہے۔ راشد ماسٹر صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ مجھے کبھی فیل نہیں ہونا چاہئے۔"

"خدا نہ کرے کہ تم کبھی فیل ہو۔" دادی نے کہا۔ "اور دیکھ..... اپنے شوکت چچا اور شمسن چچی کے احسان کو زندگی بھر نہ بھولنا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں فاقوں سے بچایا ہے۔ اگر یہ لوگ ہماری مدد نہ کرتے تو شاید ہم بھوکوں مر جاتے۔ تمہارے اماں باوا نے تو ہمیں کہیں زندہ درگور کر دیا تھا اور خدا بھلا کرے زبیدہ اور شہناز کا..... انہوں نے بھی ہمارا

بہت خیال کیا۔ یہ سب وہ لوگ ہیں بیٹا جن کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ انہیں کبھی نہ بھول جانا۔ ہمارے لیے یہ سگے رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔ رشتے داروں نے تو کبھی پلٹ کر ہماری خبر بھی نہ لی۔ ارے لعنت ہو ان سب پر..... ہمیں تو ایسے بھول گئے جیسے ہم اس دنیا میں اب ہیں ہی نہیں۔''

فیضو دادی کی باتیں خاموشی اور توجہ کے ساتھ سن رہا تھا۔ ابا کچھ نہیں سن رہے تھے۔ وہ تو گہری نیند میں سو رہے تھے۔

دادی نے سامان سمیٹ کر رکھا۔ مشین کو دھول مٹی سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر ایک کپڑا ڈالا اور پھر لالٹین بجھا دی۔ فیضو اور دادی اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔

صبح کو دادی نے فیضو کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ دادی کو اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ وہ اسے جگاتیں۔ وہ تو خود ہی مقررہ وقت پر جاگ جاتا تھا لیکن آج دادی اسے وقت سے پہلے ہی جھنجھوڑ کر جگا رہی تھیں۔

فیضو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس نے دادی کے چہرے کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ دادی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ سخت پریشان اور وحشت زدہ نظر آ رہی تھیں۔

''کیا ہوا دادی؟'' فیضو نے گھبرا کر پوچھا۔

''ارے وہ موت پیٹا امدو غائب ہے اور مشین بھی غائب ہے اور دروازہ اندر سے کھلا ہوا ہے ارے وہ مشین لے گیا۔''

فیضو جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مشین جس جگہ رکھی رہتی تھی۔ وہ جگہ اب خالی تھی۔ مشین پر ڈھانکنے والا کپڑا نیچے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے میں ابا کا پلنگ بھی خالی تھا اور دروازے کی کنڈی اندر سے کھلی ہوئی تھی۔

''ابا..... ابا..... مشین چرا کر لے گئے۔'' فیضو کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''وہ تم سے پیسے مانگ رہے تھے' پیسے نہیں ملے تو مشین چرا کر لے گئے۔''

''ہاں.....'' دادی نے بدحواسی کے عالم میں چلا کر کہا اور رونے لگیں۔ ''ارے خدا غارت کرے اسے..... اب ہم کیا کریں گے؟ وہ تو ہماری تھی بھی نہیں..... شوکت حسین کی تھی..... نہ جانے دکھیا نے کیا کیا جتن کر کے ہمارے لیے لی تھی اور ہم اب اس چوٹے کو کہاں ڈھونڈیں؟ ہمارا روزی کا سہارا بھی لے گیا بدنصیب.....'' دادی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

فیضو غم و غصے کے عالم میں نڈھال سا ہونے لگا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں ایک

مریضانہ سنسنی دوڑنے لگی۔ اس وقت اس کا بے ساختہ جی چاہا کہ ابا اگر سامنے آ جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں سے ان کا گلا دبا دے۔ ان کی مڑیا مروڑ کے پھینک دے۔ وہ مشین چرا کر بھاگ گئے تھے۔ اب دادی کپڑے کس طرح سئیں گی؟

''جلدی سے بھاگ کر شوکت حسین کے گھر جاؤ۔'' دادی نے فیضو سے کہا۔ ''شوکت تو گھر پر نہیں ہوں گے۔ شمسن چچی سے کہنا جیسے ہی وہ آئیں' انہیں بتا دیں۔ ارے کوئی اس منحوس کو پکڑ کر لائے۔ اس غارت گئے نے تو حد کر دی۔ ارے رات کو مٹا مجھ سے پیسے مانگ رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جھاڑو پھرا مشین ہی اٹھا کر لے جائے گا۔''

فیضو اٹھ کر تیزی سے شوکت چچا کے گھر کی طرف بھاگا۔ شمسن چچی سامنے ہی موجود تھیں۔ فیضو کو انہیں بتاتے ہوئے شرم آ رہی تھی لیکن بتانا تو ضروری تھا۔ دادی نے بھیجا ہی اس لیے تھا۔

''شمسن چچی۔'' اس نے رک رک کر سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ ''کل شام کو ابا گھر پر آئے تھے۔ وہ رات کو مشین چرا کر لے گئے۔''

''کیا؟'' شمسن چچی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کہا۔ ''مشین چرا کر لے گئے؟ امدو مشین چرا کر لے گئے؟''

''ہاں شمسن چچی۔'' فیضو نے کہا۔ ''وہ رات کو دادی سے پیسے مانگ رہے تھے۔ دادی نے کہا کہ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہی تو کہا انہوں نے۔'' شمسن چچی نے فیضو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ بے چاری اس بڑھاپے میں اس قدر محنت کرتی ہیں اور انہیں شرم نہیں آئی ان سے پیسے مانگتے ہوئے..... اچھا تم چلو میں آ رہی ہوں۔ تمہارے چچا تو ابھی ہیں نہیں گھر میں۔''

''تم وہاں جا کر کیا کر لو گی اماں؟'' مسعودہ نے پیچھے سے آ کر کہا' جس نے ساری بات سن لی تھی۔ ''کیا امدو چچا کو ڈھونڈ لو گی؟ چوروں کا کیا بھروسا؟ وہ تو اپنا کام کر کے چلتے بنے۔'' اس کے لہجے میں بڑی حقارت تھی۔ فیضو نے تھکی ہوئی نظروں سے مسعودہ کی طرف دیکھا۔

''نہیں نہیں۔ اماں کو جانے دو۔'' شاکرہ نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ''دادی بے چاری کس قدر پریشان ہو رہی ہوں گی۔ تم جاؤ فیضو' اماں ابھی آتی ہیں۔'' اس نے فیضو سے مخاطب ہو کر کہا۔ فیضو خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔

ذرا دیر بعد ہی شمسن چچی آ گئیں۔ دادی نے رو رو کر انہیں مشین کی چوری کے بارے میں بتایا اور اس کے ساتھ ہی وہ ابا کو گالیاں اور کوسنے بھی دیتی رہیں۔ گالیاں زیادہ اور کوسنے

بہت کم۔

فیضو اس فرق کو واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ جب اماں گھر سے بھاگی تھیں تو دادی نے ان کو گالیوں کے ساتھ کس قدر کوسنے دیئے تھے..... کس کس طرح ان کو بد دعائیں دی تھیں لیکن ابا کو بد دعائیں نہیں دے رہی تھیں۔ زیادہ تر برا بھلا ہی کہہ رہی تھیں۔

''اب شاکرہ کے ابا دوپہر کے بعد آئیں گے۔'' شمسن چچی نے کہا۔ ''دیکھو شاید وہ کچھ پتہ لگا سکیں۔''

دوپہر کے بعد شوکت چچا بھی آئے۔ دادی زار و قطار رو رہی تھیں۔ شوکت چچا نے ان کو تسلی دی اور یہ کہا کہ وہ ابا کو اور مشین کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

لیکن نہ تو ابا ملے اور نہ مشین ملی۔ دو ہفتے سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ شوکت چچا نے ابا کو بہت تلاش کیا' بہت سے جوئے کے اڈوں اور اسی قسم کے ٹھکانوں پر جا کر معلوم کیا لیکن ابا کا کچھ پتہ نہ چلا۔ شوکت چچا نے سلائی کی پرانی مشین کا کاروبار کرنے والے کئی لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن مشین کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

دادی آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں۔ اب انہیں مشین کے بغیر ہاتھ سے ہی سارا کام کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح کم کام ہوتا تھا۔ پیسے بھی کم ہو گئے تھے۔ مشین کی چوری سے دہرا نقصان ہو گیا تھا۔

زبیدہ نے دادی کو یہ سہولت فراہم کر دی کہ وہ دن میں اس وقت اس کے گھر آ کر اس کی مشین پر کچھ کام کر لیا کریں جبکہ مشین خالی ہو۔ وہ خود ہی آ کر دادی کو بتا دیتی تھی کہ اس وقت مشین خالی ہے اور وہ آ کر اس پر کام کر لیں۔

چاروں طرف سے غربت کی یورش جاری تھی۔ دادی کو کام سے جو پیسے ملتے تھے' ان سے گھر کے کھانے پینے اور فیضو کی پڑھائی کا خرچ لشتم پشتم پورا ہو رہا تھا' لیکن زندگی کا ایک ایک لمحہ ترس ترس کر گزر رہا تھا۔ گزرتے ہوئے موسموں کی نامہربانیاں فیضو کے لیے بڑھتی جا رہی تھیں۔ مہنگائی بڑھ رہی تھی۔ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا' لیکن آمدنی تو وہی لگی بندھی تھی۔ وسائل گھٹتے جا رہے تھے۔ زندگی زیادہ سے زیادہ دشوار ہوتی جا رہی تھی۔

زندگی کی ایک ایسی ہی ترسی ہوئی' بوجھل اور اداس شام کو فیضو ماسٹر راشد زبیری کے پاس سے پڑھ کر واپس آ رہا تھا۔ آج اسے زیادہ دیر تک رکنا پڑا تھا کیونکہ امتحان نزدیک تھا اور ماسٹر صاحب اسے خاص طور سے زیادہ تیاری کرا رہے تھے۔ اس نے پڑھائی کا سلسلہ کچھ زیادہ ہی دیر تک جاری رکھا تھا۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچا تو ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ سنسان گلی کے نکڑ پر اسے انیس کھڑا ہوا ملا۔

''بہت پڑھائی کر رہے ہو؟'' انیس اسے دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرایا۔ ''اتنی محنت کرنے کے لیے اچھا کھانا بھی بہت ضروری ہے۔ آؤ چلو میرے ساتھ..... آج تمہیں بہت ہی اچھی چیزیں کھلاؤں گا۔ اس سے دماغ میں طاقت آئے گی۔''

''میرے دماغ میں بہت طاقت ہے۔'' فیضو نے جواب دیا۔ ''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھنے لگا۔ اچانک انیس نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے روک لیا۔

''تم ایک بار چلو تو میرے ساتھ۔'' انیس نے اسے زبردستی کھینچتے ہوئے کہا۔ ''ایک بار چل کر تو دیکھو تمہیں کیسی کیسی عمدہ چیزیں کھلاتا ہوں جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں کھائی ہوں گی۔''

''چھوڑو میرا ہاتھ۔'' فیضو نے زور سے جھٹکا دیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے دادی سے تو اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ البتہ اگلے دن شوکت چچا کو اس بارے میں بتا دیا۔

شوکت چچا نے شبن اور لالو کو ساتھ لیا' جو اسی گلی میں رہتے تھے اور فیضو کو ساتھ لے کر انیس کے گھر پہنچے۔ انیس انہیں گھر پر ہی مل گیا۔ انیس کی بیوی ایک زمانہ ہوا' اس سے طلاق لے چکی تھی اور انیس اپنی رشتے کی ایک پھوپھی کے ساتھ رہتا تھا۔ گھر میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''کیوں بے کمینے۔'' شوکت چچا نے انیس کے سامنے آتے ہی گالیوں سے اس کی تواضع شروع کر دی۔ ''تیرے اوپر بہت مستی چڑھی ہے؟ پریشان کرتا ہے بچوں کو؟ ابے اتنے جوتے ماروں گا کہ چاند گنجی ہو جائے گی کتے کے بچے.....''

''اور لات مار کر یہاں سے نکال باہر کریں گے۔'' شبن نے اس کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ یہاں رہنا ہے تو انسانوں کی طرح رہنا' ورنہ کھٹیا پر ڈال کر تجھے یہاں سے باہر بھجوائیں گے۔''

انیس سہم کر خاموش ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے فیضو کو پھر کبھی پریشان نہیں کیا بلکہ کوئی مہینہ بھر کے بعد وہ اپنی پھوپھی کے ساتھ یہ بستی چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔

پھر دو سال کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ فیضو نے چھٹی اور ساتویں کلاس کے امتحانات اس طرح پاس کیے کہ وہ اپنی کلاس میں اول آیا۔ اس کی اس کامیابی کی خوشی میں

دادی کے علاوہ شوکت چچا اور ان کے گھر والے بھی شامل تھے۔ خاص طور سے شاکرہ.....اور ماسٹر راشد زبیری تو اپنے تمام شاگردوں کے آگے اسے مثال کے طور پر پیش کرتے تھے۔

فیضو اب آٹھویں میں آ گیا تھا۔ دو سال کے اس عرصے کے دوران دنیا کی ہر شے کی عمر میں دو سال کا اضافہ ہو گیا تھا۔ شاکرہ کی عمر بھی دو سال بڑھ گئی تھی اور مسعودہ کی بھی.....شاکرہ اب ساتویں میں آ گئی تھی اور مسعودہ چھٹی میں.....ان کے دونوں چھوٹے بھائی بھی پڑھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستی کی بہت سی جھونپڑیوں میں علم کے ننھے ننھے دیے ٹمٹمانے لگے۔ اسکول جانے والے لڑکے لڑکیوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ زندگی کے تقاضے بدل رہے تھے' فضائیں بدل رہی تھیں' ترجیحات بدل رہی تھیں' شہر بڑھ رہا تھا' پھیل رہا تھا' کاروبار بڑھ رہے تھے' طرح طرح کے نئے کاروبار وجود میں آ رہے تھے۔

اماں یا ابا کی اس عرصے کے دوران کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ فیضو تو اب ان کے بارے میں سوچتا بھی نہیں تھا' لیکن دادی برابر ان کو یاد کرتی تھیں۔ اپنی بہو کو یاد کر کے وہ اسے کوسنے اور بددعائیں دیتی تھیں اور بیٹے کو یاد کر کے صرف گالیاں دیتی تھیں۔

فیضو نے اپنی ماں کو کبھی بددعا نہیں دی تھی اور باپ کو تو اس نے گالیوں کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا۔ دادی کے بوڑھے ہاتھوں میں سلائی کا ایسا شاندار ہنر موجود تھا کہ جس کی دکانداروں نے بہت قدر کی' کیونکہ انہیں اپنے مال کی قیمت اچھی ملی۔ دادی کے پاس کام زیادہ آنے لگا۔ ایک دکاندار نے ان کو سلائی مشین بھی عاریتاً فراہم کر دی تھی۔ جس کے حصول کے بعد انہوں نے واضح اعلان کر دیا تھا کہ اگر کبھی امدو گھر میں آئے گا تو وہ اسے ہرگز گھر میں رکنے نہیں دیں گی اور نکال باہر کریں گی۔ وہ دوسری بار مشین سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ دادی اپنی پیرانہ سالی کے باوجود کام کر رہی تھیں۔ اب ان کی آنکھوں پر ایک چشمہ بھی آ گیا تھا جس کے بعد انہیں سینے پرونے میں آسانی ہونے لگی تھی۔

جو زندہ رہنے کی جدوجہد کرتے ہیں' وہ حالات کی سنگین' بے مہر اور سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر ان میں سے اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ بنا لیتے ہیں۔ مقدر کے ٹھکرائے ہوئے یہ دو افراد جن کی عمروں میں دو نسلوں کا فرق تھا' ایسی ہی ایک صبر آزما اور پُر امید جدوجہد میں مصروف تھے۔ ایک بچہ جس کے سامنے ابھی پوری عمر پڑی تھی اور جس نے ابھی زندگی کی شاہراہ پر قدم اٹھانا ہی سیکھا تھا' پے در پے ٹھوکریں کھاتا ہوا اپنے سفر کو جاری رکھنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت جو عمر کی اس منزل میں تھی جہاں اسے ایک

کونے میں بیٹھ کر خاموشی سے اللہ اللہ کرنا چاہئے تھا' گرتی پڑتی' ہانپتی کانپتی' محنت و مشقت کے خشک اور بے آب و گیاہ راستے پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ یہ مشقت اسے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے کرنی تھی اور اپنے اس معصوم بچے کو زندہ رکھنے کے لیے بھی' جو والدین کے ہوتے ہوئے بھی یتیم و یسیر تھا۔

زندگی کا ایک ڈھرا بن گیا تھا اور وقت کے سفر کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

اکثر لوگ بستی سے جا رہے تھے۔ آنے والے برسوں کے دوران کافی خاندان بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ یہاں سے جانے کی خواہشمند لوگوں کو دور دور کے علاقوں میں چھوٹے چھوٹے رہائشی پلاٹ کم قیمت پر حکومت کی جانب سے الاٹ ہوتے جا رہے تھے۔ بعض جگہوں پر کوارٹر بھی بن رہے تھے' لیکن یہ ساری جگہیں شہری آبادی سے اس قدر دور مضافاتی علاقوں میں واقع تھیں کہ محنت مزدوری اور چھوٹے موٹے دھندے کرنے والوں کے لیے یہاں رہنا بہت دشوار تھا۔ ٹرانسپورٹ کی تکلیف کے علاوہ پانی وغیرہ کی سہولتیں بھی موجود نہیں تھیں' لیکن پھر بھی تھوڑے بہت لوگ وہاں جا رہے تھے۔ دور دراز کے مضافاتی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے مکانات بن رہے تھے' کوارٹر بن رہے تھے اور بستیاں آباد ہو رہی تھیں' گجر نالے کے کنارے کی بدبودار اور سیاہ کیچڑ بھری ہوئی رہائش کو چھوڑ کر مضافاتی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے پکے مکانوں اور کوارٹروں میں رہائش اختیار کرنی شروع کر دی تھی اور شہر سے دوری کی مشکلات نیز دیگر مشکلات کے باوجود وہاں خوش تھے کیونکہ وہ کھلی فضا میں رہ رہے تھے اور موسم کی سختیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے سروں پر ایک پختہ چھت موجود تھی۔

ایسی ہی ایک پختہ چھت کی بہت عرصے سے شوکت حسین کو بھی تلاش تھی۔ اس کا کنبہ چھ افراد پر مشتمل تھا۔ دو میاں بیوی اور چار بچے جن میں دو بڑی بیٹیاں تھیں اور ان سے چھوٹے دو بیٹے تھے۔ گجر نالے کی اس گندی اور بدبودار بستی میں زندگی طرح طرح کے ہزاروں عذابوں سے بھری ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ عذاب تو بارش کے زمانے میں نازل ہوتا تھا' جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ جھگی میں صرف ایک چھوٹا سا کمرہ ایسا تھا جس کی دیواریں پکی تھیں اور ان پر ٹین کی پرانی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ بارش کے وقت گھر کے سب لوگ اس کمرے میں جمع ہو جاتے تھے اور ''قیمتی'' ساز و سامان کو بھی یہیں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ شوکت حسین اور شمسن اپنے بیٹوں کے علاوہ اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی پڑھا رہے تھے اور ان کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ ان کی پڑھی لکھی بیٹیوں کے لیے پڑھے لکھے لڑکوں کے رشتے

ملنے چاہئیں۔ جہاں تک بڑی بیٹی شاکرہ کا تعلق تھا تو اس کے لیے انہوں نے فیضو کو نظر میں رکھا ہوا تھا' جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ غربت اور نیم فاقہ کشی کے عذاب جھیلنے والا یہ بچہ جس کے والدین اسے دغا دے گئے تھے پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا' چنانچہ وہ شروع سے ہی اس کا دل جیتنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ مسعودہ کا رشتہ بھی کسی پڑھے لکھے لڑکے کے ساتھ ہی ہونا چاہئے تھا' لیکن گجر نالہ کی اس بستی میں رہنے والی لڑکیوں کے لیے کوئی اچھا رشتہ کس طرح آ سکتا تھا؟

شوکت حسین اس بستی کو چھوڑ دینا چاہتا تھا' لیکن یہاں سے جانے کی کوئی سبیل نہیں بن پائی تھی۔ وہ سبزی فروشی کے علاوہ کچھ اور چھوٹے موٹے دھندے بھی کرتا تھا' لیکن چھ جانوں کا پیٹ بھرنے اور چار بچوں کی پڑھائی کا خرچہ برداشت کرنے کے بعد بمشکل ہی کچھ بچت ہو پاتی تھی۔ پھر بھی وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارتا رہتا تھا کہ کہیں کوئی پکی چھت میسر آ جائے۔

پھر اس کی قسمت نے یاوری کی۔ اسے شہر سے بہت دور' ریت کے تودوں اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرے ہوئے ایک علاقے میں ایک کوارٹر الاٹ ہو گیا۔ اس علاقے کا نام سعود آباد رکھا گیا تھا اور یہ ملیر کی طرف واقع تھا۔ یہاں ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے لیے چھوٹے چھوٹے کوارٹر سعودی عرب کے اس وقت کے بادشاہ' شاہ سعود کے عطیے سے تعمیر کیے گئے تھے اور بے گھر لوگوں کو الاٹ کیے جا رہے تھے' لیکن الاٹمنٹ کی شرط یہ تھی کہ الاٹی خود اس کوارٹر میں جا کر رہے۔ انہیں خالی چھوڑنے' کرائے پر اٹھانے یا فروخت کرنے کی ممانعت تھی۔ چنانچہ جن لوگوں کو یہ کوارٹر الاٹ ہو رہے تھے ان کے لئے لازمی تھا کہ وہ ان کا قبضہ لے کر فوراً ان میں رہنا شروع کر دیں اور انہیں خالی نہ چھوڑیں۔

شوکت حسین ایک ہوٹل والے کی مدد سے' جسے وہ روزانہ سبزیاں فراہم کیا کرتا تھا اپنے نام پر ایک کوارٹر الاٹ کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس ہوٹل والے کے سرکاری حلقوں میں وسیع تعلقات تھے اور وہ شوکت حسین پر مہربان بھی رہتا تھا' کیونکہ شوکت حسین اسے مناسب ترین قیمت پر اچھی سبزیاں منڈی سے لا کر دیتا تھا۔

سعود آباد میں کوارٹر کا الاٹ ہو جانا اس پورے خاندان کے لیے زندگی میں ایک زبردست انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا اور اس انقلاب کا تعلق صرف اس خاندان سے نہیں تھا بلکہ فیضو اور اس کی دادی سے بھی تھا۔ فیضو اس وقت میٹرک میں آ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی زندگی کچھ نئی کروٹیں بھی لے چکی تھی۔ ان نئی کروٹوں میں شدید محنت اور جدوجہد سے بھرپور شب و روز لپٹے ہوئے تھے جن کا ایک ایک لمحہ ہزار ہا امیدوں اور آرزوؤں سے عبارت تھا۔

میٹرک میں آنے سے پہلے ہی فیضو نے بھی کام کرنا شروع کر دیا تھا اور گھر کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا' لیکن فیضو کا کام اپنی دادی کے کام سے بہت مختلف تھا' فیضو نے چھوٹے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

یہ مشورہ اسے ماسٹر راشد زبیری نے دیا تھا جنہوں نے ہمیشہ اس کا بھلا چاہا تھا اور ہر موقع پر اس کی مدد کی تھی۔ اس کے گھریلو حالات کے پیشِ نظر انہوں نے اس کی ٹیوشن فیس معاف کر دی تھی اور وہ اسے مفت پڑھاتے تھے اور اس کی کامیابیوں سے خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ اگر وہ چھوٹی جماعتوں کے کچھ بچوں کو پڑھانا شروع کر دے تو اس طرح اس کو کچھ نہ کچھ پیسے ملنے لگیں گے۔ انہوں نے اس کے اندر اعتماد پیدا کیا کہ وہ چھوٹے بچوں کو بآسانی پڑھا سکتا ہے۔

ماسٹر راشد زبیری کے مشورے اور اصرار کے بعد جب اس نے یہ کام شروع کیا تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نہایت درجہ غربت اور تنگ دستی کے باوجود بستی کے اکثر لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو اس کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجنے پر تیار ہو گئے۔ وہ ایک لائق اور پڑھاکو لڑکے کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ اپنی کلاس میں ہمیشہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتا ہے اور پکے مکانوں میں رہنے والے خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لڑکے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ فیضو کے پاس شاگردوں کی آمد شروع ہو گئی جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ اب اس کے شب و روز بڑے ہی نپے تلے انداز میں گزر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گزرنے والے ہر ہر لمحہ پر کسی نہ کسی مصروفیت کی چھاپ لگ چکی ہے۔ جب وہ ماسٹر راشد زبیری کے پاس سے پڑھ کر واپس آتا تھا' تب چھوٹے بچوں کو پڑھاتا تھا جو خود اس کے گھر آ جاتے تھے۔ تب وہ ایک مکتب سے شاگرد کے طور پر اٹھ کر آتا تھا اور دوسرے مکتب میں استاد کے طور پر بیٹھتا تھا۔ دادی اس صورتِ حال سے بہت خوش تھیں۔ انہیں خوشی صرف اس بات کی نہیں تھی کہ فیضو نے چار پیسے کمانا شروع کر دیئے تھے' بلکہ اصل خوشی تو اس بات کی تھی کہ فیضو وقت سے بہت پہلے ہی اپنی ذمہ داریوں کا عملی احساس کر رہا تھا اور اس پر اپنے نکمے اور نابکار باپ کا سایہ تک نہیں پڑا تھا۔ وہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر اپنی زندگی کی تعمیر کے راستے پر چل پڑا تھا۔ گھر میں جب بچے پڑھنے کے لیے جمع ہوتے تو دادی کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اس گھر میں تو ہمیشہ خاک ہی اُڑتی رہی تھی۔ جب بہو بھی تھی اور بیٹا بھی تھا تو ہر وقت کی دانتا کِل کِل اور ہائے ہتیا کے سوا گھر میں کیا تھا؟ پھر ایک ایک کر کے دونوں دفعان ہو گئے اور ساتھ ہی اس گھر کی

بچی کھچی، ٹوٹی پھوٹی خوشیاں بھی لے گئے جن کا کبھی کبھار پھیرا ہو جاتا تھا اور پھر دکھوں کے بوجھل سناٹوں کو اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ اب ان سناٹوں میں گونجنے والی چھوٹے چھوٹے بچوں کی آوازوں سے فضا کا رنگ بدل رہا تھا۔

کچھ اضافی پیسے آنے لگے تو غربت کے بڑھتے ہوئے تابڑ توڑ اور جان لیوا حملے ایک جگہ رک گئے تھے۔ اب ان میں مسلسل اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔

خود فیضو پر اس تبدیلی کا بہت خوشگوار اثر پڑا تھا۔ وہ اب تک تو اپنے آپ کو نیم دریوزہ گری کی زندگی گزارتے ہوئے محسوس کرتا تھا، لیکن اب یہ احساس تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا تھا۔ دادی تو بہت عرصے سے کما رہی تھیں اور اب وہ خود بھی کام کرنے لگا تھا۔ پیسے کما کر لا رہا تھا..... پیسے..... ہاں..... وہ پیسے کما سکتا تھا۔ اس کے اندر اتنی قوت تھی کہ اس عمر میں بھی پیسے کما سکتا تھا، جس دن اسے اپنی کمائی کے پہلے پیسے ملے، اس دن اس نے اپنے آپ کو ایک نیا، بالکل بدلا ہوا انسان پایا۔ اس کے اندر پہلی خود اعتمادی کی ایک بہت مضبوط لہر پیدا ہوئی۔ بہت کچھ کر سکتا تھا اور اس یقین و اعتماد نے اس کے اندر ایک نئی روشنی پیدا کر دی تھی۔

شوکت حسین اور شمسن کو اپنے خواب بالکل صحیح سمت میں سفر کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ انہوں نے فیضو کو مکمل طور پر اپنا لیا ہے اور فیضو اور اس کی دادی ان کے خاندان کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ شاکرہ خود بھی اب ساتویں کلاس میں پڑھ رہی تھی اور اس کی بھی خواب دیکھنے کی اور شوخ و شنگ جذبات کے تانے بانے بُننے کی عمر کا آغاز ہو رہا تھا۔ فیضو اسے اب سے نہیں، ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا اور اس نے اپنے اس جذبے کو کبھی چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اس نے فیضو کو یہ احساس دلانے میں بھی کبھی بخل یا تکلف سے کام نہیں لیا تھا کہ وہ اس کو بہت پسند کرتی ہے، لیکن اب عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ پسندیدگی آہستہ آہستہ لیکن قطعیت کے ساتھ ایک خاص شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ فیضو اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ شوکت چچا اور ان کے خاندان والوں کے اس کے اوپر بہت احسانات ہیں۔ اگر وہ لوگ نہ ہوتے تو شاید وہ اور دادی فاقے کرنے لگتے۔ پھر اسے پنکچر والے کی دکان پر دن بھر کے لیے نوکری کرنی پڑتی اور اس کی پڑھائی جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ تب زندگی کتنی مختلف ہوتی اور کس قدر قابلِ نفرت..... وہ شوکت چچا اور ان کے گھر والوں کی عنایات کے تحت تشکیل پانے والی اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو سنبھال کر خرچ کرنا چاہتا تھا۔ یہ وقت بہت غنیمت تھا۔ یہ لوگ بہت غنیمت تھے۔

شوکت حسین نے اپنے لیے سعود آباد میں ایک کوارٹر الاٹ کروا لیا اور کچھ دنوں بعد وہ سب لوگ سعود آباد منتقل ہو گئے، لیکن شوکت حسین فیضو کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔

''وہاں ابھی بہت سے کوارٹر خالی پڑے ہیں فخرن خالہ۔'' اس نے فیضو کی دادی سے کہا۔ ''میں نے شکور ہوٹل والے سے بات کی ہے۔ میں وہاں پہنچ جاؤں تو پھر تمہارے لیے بھی وہیں ایک کوارٹر کا بندوبست کرا دوں گا۔ تم اور فیضو بھی وہیں آ جانا۔''

''اے اللہ تمہیں نیکی دے بیٹا شوکت۔'' دادی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''تم لوگوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ہم تو بالکل لاوارث ہو جائیں گے۔ تمہارے علاوہ یہاں ہمارا ہے ہی کون۔''

''فکر نہ کرو فخرن خالہ۔'' شمسن نے کہا۔ ''شاکرہ کے ابا پوری کوشش کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی وہاں کوارٹر ضرور مل جائے گا۔''

''ارے بیٹا ہمارا کیا ہے۔'' دادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''ہم تو اپنی زندگی گزار چکے۔ آج مرے کل دوسرا دن..... ہمیں تو کچھ بھی نہیں چاہیے، لیکن اگر اس بن ماں باپ کے بچے کے لیے کچھ سہارا ہو جائے تو ہمارا رواں رواں تم کو دعا دے گا۔ ہمارے پاس دعاؤں کے علاوہ اور ہے ہی کیا جو ہم تم کو دے سکیں۔''

''بڑوں کی دعا سے بڑھ کر بھلا اور کیا نعمت ہوتی ہے؟'' شمسن نے کہا۔ ''فیضو تو ہمارے لیے ہماری اپنی اولاد کی طرح ہے فخرن خالہ..... جیسے ہمارے اور بچے ویسے ہی فیضو۔ اس کی زندگی بنانے کے لیے تو ہم سب کچھ کریں گے۔''

فیضو خود بھی دل و جان سے یہ چاہتا تھا کہ اسے بھی رہنے کے لیے کوئی اچھی جگہ مل جائے۔ شہر کے مضافات میں بہت سے نئی پکی بستیاں تعمیر ہو رہی تھیں۔ کوارٹرز بن رہے تھے۔ لوگ جھگیوں کی رہائش چھوڑ چھوڑ کر پکے کوارٹروں کی بستیوں میں آباد ہو رہے تھے اور شہر سے دور ہو جانے کی مشکلات کے باوجود اس نئی زندگی سے خوش تھے۔ کم از کم اپنا گھر تھا۔ پکی چھت والا گھر۔

فیضو نے شوکت چچا کے ساتھ جا کر ان کا وہ کوارٹر دیکھا جو انہیں الاٹ ہوا تھا۔ بڑی ویران وحشت ناک اور دور افتادہ جگہ تھی۔ دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ بس تھوڑی سی دکانیں تھیں جہاں ضرورت کی کچھ چیزیں مل جاتی تھیں۔ نیچی نیچی چھتوں والے کوارٹروں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں جو کافی دور تک پھیلی چلی گئی تھیں اور وہاں سناٹے کا راج تھا۔ بہت

سے کوارٹر خالی پڑے ہوئے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

پہلی بار سعود آباد کے علاقے کو دیکھ کر فیضو کا دل دہل گیا۔ وہ جہاں رہ رہا تھا وہاں زندگی جیسے ابلی پڑی تھی۔ گجر نالے کی بستی کے ایک ایک چپے سے انسان جیسے اُگ رہے تھے لیکن یہاں تو زندگی جیسے ناراض ہو کر ریت میں منہ چھپائے پڑی تھی۔ کس قدر ویرانی تھی ہر طرف..... بھلا اس جگہ کیونکر رہا جا سکتا تھا؟ لیکن پھر بھی وہ لوگ رہ رہے تھے۔ بہت سے کوارٹروں میں آبادی تھی اور فیضو کی نظروں کے سامنے ہی ایک کوارٹر میں رہنے کے لیے لوگ آ گئے۔ ان کا سامان ایک اونٹ گاڑی پر لد کر آیا تھا۔

''آنے جانے کی مشکل تو ہے۔'' شوکت چچا نے فیضو کے تھکے تھکے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جلد ہی کچھ اور بسیں چلنے لگیں گی۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی جائے گی' ویسے ویسے سہولتیں بھی بڑھتی جائیں گی۔''

''ہمارے لیے بھی کوشش کرو شوکت چچا۔'' فیضو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر ایک کوارٹر ہمیں بھی الاٹ ہو جائے' ہم بھی یہیں رہیں گے۔ جو مشکلیں ہیں وہ تو سبھی کے لیے ہیں' جس طرح سب لوگ رہیں گے ہم بھی رہ لیں گے۔''

شوکت حسین نے بھاگ دوڑ کر کے فخر النساء بیگم کے نام سے بھی سعود آباد میں ایک کوارٹر الاٹ کروا لیا' جو اس کے اپنے کوارٹر سے ملا ہوا تھا۔ اسے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ فیضو کو بھی اس کے گھر کے بالکل برابر ہی گھر مل گیا۔

سعود آباد کے کوارٹر کی زندگی ان سب لوگوں کے لیے بہت ساری خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیاں لے کر آئی تھی' کچھ آسانیاں میسر تھیں تو بہت سی مشکلات بھی بڑھ گئی تھیں جن کا مقابلہ کرتے ہوئے زندگی کی راہوں کو تلاش کرنا تھا۔

شوکت حسین نے اپنا سبزی فروشی کا پرانا اور آزمودہ کاروبار کسی نہ کسی طرح جاری رکھا اور آس پاس کے علاقے میں بہت سے نئے گاہک پیدا کر لیے۔ تھوڑے دنوں تک دشواری رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کے دوسرے چھوٹے موٹے دھندے بھی شروع ہو گئے جن سے وہ تھوڑی بہت رقم کما لیتا تھا۔

دادی کے کام میں بھی کوئی بہت زیادہ فرق نہیں پڑا۔ دادی کے کام کی مانگ تھی دکاندار ایک ہی بار لا کر بہت سارا کام انہیں دے جاتے تھے اور وہ کرتی رہتی تھیں۔ کام مکمل ہو جانے پر دکاندار وہ کام لے جاتے تھے اور مزید کام دے جاتے تھے۔ البتہ فیضو کی مشکلات میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔

اسے اسکول جانے کے علاوہ ماسٹر راشد زبیری سے پڑھنے کے لیے بھی اسی علاقے میں جانا پڑتا تھا۔ وہ اسکول تو بدل سکتا تھا لیکن ماسٹر راشد زبیری کو نئی جگہ نہیں بلا سکتا تھا وہ بھی اس علاقے کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتے تھے۔ اور فیضو نہ راشد زبیری سے پڑھنا چھوڑ سکتا تھا نہ بچوں کو پڑھانا۔ چنانچہ ان ساری چیزوں کو سمیٹنے' انہیں یکجا کرنے اور انہیں وقت کے ایک رواں دھارے میں سمونے کے لیے اسے غیر معمولی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اب وہ صبح اسکول کے لیے روانہ ہوتا تو دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر جاتا تھا جو دادی اسے پکا کر دیتی تھیں۔ اسکول کی چھٹی کے بعد وہ سیدھا ماسٹر راشد زبیری کے گھر چلا جاتا تھا۔ وہاں کھانا کھاتا تھا اور کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ پھر پڑھائی کا وقت شروع ہو جاتا تھا۔ ماسٹر صاحب سے ٹیوشن پڑھنے کے بعد وہ انہی کے گھر میں اپنے چھوٹے چھوٹے شاگردوں کو جمع کر کے انہیں ٹیوشن پڑھاتا تھا۔

جب یہ کام ختم ہو جاتا تو پھر اس کے بعد وہ گھر جانے کے لیے روانہ ہوتا تھا۔ انسانوں سے ٹھسا ٹھس بھری ہوئی بسوں میں دھکے کھاتا کھاتا وہ چراغ جلنے کے بعد ہی گھر پہنچ پاتا تھا' جہاں دادی کی آنکھیں بڑی بے چینی کے ساتھ دروازے کا طواف کر رہی ہوتی تھیں۔

سارا دن باہر گزار کر جب فیضو شام کو گھر پہنچتا تو دادی کے چہرے پر زندگی کی تازہ روشنی نمودار ہو جاتی۔ وہ سارا دن اکیلی رہتی تھیں۔ تاہم ان کے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے اور ان کی خبر گیری کرنے کے لیے شاکرہ دوپہر کے بعد ان کے گھر کا ایک آدھ چکر ضرور لگا لیتی تھی۔ شاکرہ اور مسعودہ نے اسی علاقے کے ایک قریبی اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ شمسن کو بھی دن میں جب موقع ملتا وہ دادی کے پاس ذرا دیر کے لیے ضرور آ جاتی تھی۔ اس طرح دادی کو تنہائی کے عذاب سے کافی حد تک نجات مل جاتی تھی۔ اس مختصر سی آبادی میں اور دوسرے پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات کی استواری کا عمل ابھی پوری طرح سے شروع نہیں ہو پایا تھا۔ دادی کو شوکت حسین اور اس کے گھر والوں کا بہت سہارا تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے زندگی میں کافی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔

سعود آباد کا موسم گجر نالہ کے علاقے کے موسم سے بالکل مختلف کسی دوسرے شہر کے موسم کی طرح تھا۔ یہاں سخت گرمی پڑتی تھی۔ دور تک چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان پھیلے ہوئے تھے' جن کے وسط میں کوارٹروں کی چھوٹی چھوٹی قطاریں وسیع صحرا میں کسی نخلستان کی طرح نظر آتی تھیں۔ میدان ریت سے بھرے ہوئے تھے اور جا بجا ریت کے تودے اور ٹیلے نظر آتے تھے۔ جن میں تیز ہوا کے ساتھ اُڑنے والی گرم گرم ریت کے ذرات شراروں کی طرح جسم

سے ٹکراتے تھے اور کھال کو جلا دیتے تھے۔ بنجر اور غیر آباد میدانوں میں کیکر کی کانٹے دار اور نامہربان جھاڑیوں کے علاوہ اور کوئی سبزہ نظر نہیں آتا تھا اور یہ جھاڑیاں بھی بہت کم تھیں۔ دن بھر تیز اور گرم ہواؤں کے قہر آلود جھکڑ چلتے رہتے تھے اور ناک' منہ اور کانوں میں ریت درانہ گھستی چلی جاتی تھی۔ گھروں میں پانی کی شدید قلت تھی اور بڑی مشکل سے کھینچ تان کر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔

بسیں بہت کم تھیں اور بہت دیر کے بعد آتی تھیں۔ اس لیے کام پر جانے والوں کو صبح بہت جلدی نکلنا پڑتا تھا اور پھر دیر تک بس کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ بجلی ابھی نہیں آئی تھی۔ گجر نالے کی بستی کی طرح یہاں رات کو لالٹین ہی جلانی پڑتی تھی۔

ایک بہتر زندگی کی تلاش میں یہاں آکر آباد ہونے والے لوگوں نے اس ساری مشکلات کو دل سے قبول کر لیا تھا اور وہ ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔ فیضو بھی ان میں شامل تھا۔ ان سب لوگوں کے لیے یہ کیا کم بڑی بات تھی کہ ان کے پاس ان کا اپنا ایک پکا مکان تھا' جس کی پکی چھت انہیں گرمی' سردی اور بارش کی بے رحمانہ مار سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ گجر نالے کی بستی میں تو جب خوب بارش ہوتی تھی تو زندگی کا عذاب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا تھا۔ پانی جس طرح باہر برستا تھا اسی طرح گھروں کے اندر برستا تھا۔

چٹائیوں' پھونس اور گتے وغیرہ کی بنی ہوئی چھتیں اپنے مکینوں کو بارش سے بچانے سے معذرت کر لیتی تھیں۔ گھروں کے اندر تباہی کا سماں ہوتا..... اور گھروں کے باہر کچی گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں کیچڑ اور گاد ہوتی جس میں سے گزرنا خاص طور سے عورتوں اور بچوں کے لیے کسی سزا سے کم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں سعود آباد کے ریگستان میں کم از کم یہ سب کچھ نہیں تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہاں استحکام تھا' استواری تھی اور بہتری کی امید تھی۔ سننے میں آرہا تھا کہ جلد ہی بجلی بھی آنے والی ہے۔ وہاں گجر نالہ میں تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہاں تو برسوں گزر جاتے' کوئی بہتری پیدا نہیں ہو سکتی تھی سب کچھ ویسے کا ویسے ہی رہتا اور اکثر تو یہ سننے میں بھی آتا تھا کہ حکومت اس بستی کو یہاں سے ختم کرنے والی ہے اور ساری جھگیاں اور مکانات وغیرہ گرا دیئے جائیں گے۔ گجر نالہ کی بستی ماضی کا دلدر تھی تو سعود آباد کا علاقہ مستقبل کی امید..... اور مستقبل کی اس امید کے سہارے فیضو زندگی کے یہ نہایت کٹھن دن گزار رہا تھا۔

گجر نالہ وہ روزانہ ہی جاتا تھا' جہاں ماسٹر راشد زبیری رہتے تھے اور جہاں وہ اپنے ننھے منے شاگردوں کو پڑھایا کرتا تھا اور اب اسے اکثر اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ اس نے

کیسے اس بستی میں اپنی زندگی کے اتنے سال گزار دیئے۔ یہ تو بڑی ہی اذیت ناک جگہ تھی اور اس کے مقابلے میں اب تو جیسے وہ جنت کے کسی گوشے میں رہ رہا تھا۔

اب اگر کوئی اس سے یہ سوال کرتا کہ وہ کہاں رہتا ہے تو اس کو جواب میں گجر نالے کا نام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بڑی متانت کے ساتھ' جس میں ایک قسم کے جذبۂ افتخار کی جھلک صاف طور سے محسوس ہوتی تھی' پوچھنے والے کو جواب دیتا۔ ''ہم لوگ سعود آباد میں رہتے ہیں۔'' سب جانتے تھے کہ سعود آباد کوئی کچی بستی نہیں ہے۔

ہر چیز رفتہ رفتہ اپنی ایک شکل متعین کرتی جاتی تھی۔ زندگی ایک نئے قالب میں ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ سعود آباد کے گرم اور ریتیلے بگولوں میں لپٹے ہوئے شب و روز ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ دادی کام کر رہی تھیں اور ان کو پیسے مل رہے تھے۔ فیضو کام کر رہا تھا اور پیسے آرہے تھے۔ سعود آباد آنے کے بعد گھر کے اخراجات میں کچھ اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ یہ جھگی نہیں تھی یہ ایک پختہ کوارٹر تھا' جس کی اپنی ضروریات تھیں' انہیں پورا کرنا ضروری تھا۔ پھر بسوں کے ذریعے آنے جانے کا کرایہ بھی خرچ کرنا ہوتا تھا۔ فیضو کو روز ہی جانا پڑتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر کام چل ہی جاتا تھا اور اب تو دادی نے شوکت چچا کے گھر سے مفت سبزی لینا بھی ترک کر دی تھی' کیونکہ اخراجات تو شوکت چچا کے گھر کے بھی بڑھ گئے تھے۔

فیضو اس سال میٹرک کا امتحان دینے والا تھا اس کے بعد اس کا آگے اور آگے پڑھنے کا ارادہ تھا۔ وہ بہت دور تک جانا چاہتا تھا۔ جہاں تک اس کے پیر چلنے کی اجازت دیں اور پیروں کو طاقت بہم پہنچانے کے لیے بہت کچھ کرنا ضروری تھا۔

گرمی اور برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ سعود آباد کی ریگستانی آب و ہوا میں کچھ نرمی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ دن چھوٹے ہونے لگے تھے۔ سورج جلد ہی ڈوب جاتا تھا۔

اس روز شام کو جب فیضو حسبِ معمول گھر واپس آیا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ جب گھر کے اندر داخل ہوا تو اس نے برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ پر ایک آدمی کو بیٹھے ہوئے پایا۔ لالٹین کی روشنی میں پہلی ہی نظر میں وہ کوئی بیمار آدمی معلوم ہوتا تھا۔

فیضو ایک اجنبی آدمی کو اپنے گھر میں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہاں شوکت چچا کے گھرانے کے علاوہ کسی بھی شخص سے اتنا زیادہ ربط ضبط نہیں تھا کہ کوئی آدمی یوں بے تکلفی کے ساتھ گھر میں آکر پلنگ پر بیٹھ جائے۔ دادی سامنے نظر نہیں آرہی تھیں۔ وہ شاید باورچی خانے میں

تھیں۔

فیضو نے لالٹین کی مدھم روشنی میں اس شخص کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خشخشی سفید داڑھی تھی، جس میں کہیں کوئی اکا دکا لال بال نظر آ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال کھچڑی تھے اور بہت بری طرح الجھے ہوئے اور بکھرے ہوئے تھے اور ایک لمبے عرصے سے دھوئے نہ جانے کے باعث ان کا رنگ بھی مُردہ اور پھیکا ہو چکا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں پیلی پیلی تھیں اور اس کے چہرے کی رنگت بھی مٹی کی طرح بے نور ہو رہی تھی۔ اس کے گال اندر کی طرف پچکے ہوئے تھے جس کے باعث اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر کر باہر کو نکل آئی تھیں۔

''آپ کون ہیں؟'' فیضو نے سنبھل کر اس اجنبی شخص سے پوچھا جسے اس نے اس سے پہلے اس گھر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''تم..... تم..... فیضو ہو نا؟'' اس شخص نے جلدی سے پلنگ پر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے سخت اضطرابی لہجے میں کہا اور جب وہ شخص بولا اور فیضو نے اس کی آواز سنی تو پھر فیضو کو اسے پہچاننے میں چند لمحوں سے زیادہ کا عرصہ نہیں لگا۔

گردشِ وقت سے آدمی کی شکل تو بدل جاتی ہے لیکن اس کی آواز نہیں بدلتی۔ فیضو نے اس شخص کو اس کی آواز کے ذریعے ہی فوراً پہچان لیا تھا۔ یہ تو ابا تھے۔

ابا کو پہچان لینے کے ساتھ ہی فیضو کے دل میں کبیدگی اور ناپسندیدگی کی ایک تیز لہر اٹھی۔ یہ شخص جو اس کا باپ تھا، اس کی زندگی میں برابر زہر گھولتے رہنے کے بعد اب یہاں کس لیے آیا تھا؟

''ہاں، میں فیضو ہوں۔'' جواب دیتے وقت فیضو کا لہجہ بدل گیا۔ اس لہجے میں کوئی استعجاب، کوئی تجسس، کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔ یہ پھیکا، بے رس اور پژمردہ لہجہ تھا، جس میں بیزاری اور ناآشنائی کی جھلک صاف طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

''ارے بیٹا فیضو۔'' ابا نے جلدی سے آگے بڑھ کر فیضو کو گلے لگا لیا۔ ''ماشاء اللہ کتنے بڑے ہو گئے ہو۔ میں تو تم کو پہچان بھی نہیں سکتا۔ اگر میں نے تمہیں کہیں رستے، گلی میں دیکھا ہوتا تو قسم ہے اپنے پیدا کرنے والے کی، میں تم کو بالکل بھی نہ پہچان پاتا۔ اماں بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ فیضو کو دیکھو گے تو پہچان نہیں پاؤ گے، ماشاء اللہ سے اتنا بڑا ہو گیا ہے تُو.....''

ابا کے کپڑے بہت غلیظ تھے۔ ان کا جسم بہت غلیظ تھا۔ اس کے پاس سے بڑی ناگوار سی بو آ رہی تھی، فیضو کو یہ بدبو صرف ان کے بدن اور لباس سے ہی اٹھتی ہوئی محسوس نہیں ہو

رہی تھی، یہ بدبو تو ان کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ فیضو کے دل میں ان کے لیے کوئی بھی خوشگوار جذبہ بیدار نہیں ہوا اور اس نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ دیئے بغیر جلدی سے اپنے آپ کو ان کی گرفت سے چھڑا لیا اور ایسا کرتے وقت اس پر یہ انکشاف ہوا کہ ابا تو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے ان کے اندر بالکل جان نہیں تھی۔ فیضو نے جو اُن کو زور سے اپنے آپ سے علیحدہ کیا تو وہ گرتے گرتے بچے اور جلدی سے پلنگ پر جیسے ڈھے گئے۔

''تم یہاں تک کس طرح پہنچ گئے ابا؟'' فیضو نے ان کی کسی بات کا جواب دینے کی بجائے خشک اور کھردرے لہجے میں ان سے سوال کیا۔

''ارے بیٹا..... اگر ڈھونڈنے نکلو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔'' ابا نے ایک نیم مُردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہم آج دن میں اپنے پرانے گھر گئے تھے..... گجر نالے..... وہاں جا کر معلوم ہوا کہ تم لوگوں نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے اور سعود آباد میں کوارٹر الاٹ کروا لیا ہے۔ وہیں سے کوارٹر کا نمبر بھی معلوم کر لیا..... یہ پتہ بھی چلا کہ تم روزانہ پڑھنے کے لیے وہاں ماسٹر راشد زبیری کے گھر آتے ہو۔ ہم وہاں رک کر بھی تمہارا انتظار کر سکتے تھے اور تمہارے ساتھ یہاں تک آ سکتے تھے لیکن ہم نے انتظار نہیں کیا اور وہاں سے سیدھے سعود آباد آ گئے۔ اور دیکھ لو..... ہم نے تمہارا کوارٹر بھی ڈھونڈ نکالا..... یہ تو بہت اچھا مکان ہے۔ اس جھگی سے تو لاکھ درجے بہت ہے۔ یہ کیسے مل گیا تم لوگوں کو؟ کس کے نام پر ہے؟''

''دادی کے نام پر ہے۔'' فیضو نے بے رخی کے ساتھ کہا۔ ''شوکت چچا کی کوششوں سے ملا ہے، پیسے خرچ ہوئے ہیں اس کے ملنے میں مفت میں نہیں مل گیا ہے۔''

''بہت اچھا ہے۔'' ابا چاروں طرف نظریں گھما گھما کر کوارٹر کا جائزہ لے رہے تھے۔ فیضو کو ان کی یہ حرکت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ وہاں سے جانے ہی والا تھا کہ دادی آ گئیں۔ ان کے بوڑھے، جھریوں بھرے چہرے پر ایک عجیب غم ناک قسم کی کیفیت نظر آ رہی تھی۔

''امدو آئے ہیں بیٹا فیضو۔'' دادی نے ایک ایسے لہجے میں کہا جس میں معذرت خواہانہ تاثر کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ''کتنے برسوں کے بعد آج ان کی صورت دکھائی دی ہے۔ بہت بیمار ہیں بے چارے..... کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہے ان کا.....''

''یہ اب تک کہیں نہ کہیں تو رہتے ہوں گے دادی۔'' فیضو نے کہا۔ ''جہاں رہتے تھے وہیں کیوں نہیں رہتے؟ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟''

''میں..... میں..... میں بہت بیمار ہوں فیضو بیٹا۔'' دادی کی بجائے ابا نے گڑگڑاتے

ہوئے کہا۔ ''میں کراچی سے باہر چلا گیا تھا لیکن وہ ٹھکانہ بھی مجھ سے چھین لیا گیا اور میں تم لوگوں کو ڈھونڈتا ہوا یہاں آن پہنچا۔ میری خطائیں بخش دو بیٹا..... بس کچھ دن تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ جیسے ہی طبیعت ذرا ٹھیک ہو جائے گی اپنا کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گا۔ تم لوگوں کو تکلیف نہیں دوں گا۔'' ابا کی آواز بھرا گئی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ساتھ ہی انہیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ فیضو دوسری طرف چلا گیا۔

''دادی..... تم الماری میں تو تالا لگا کر رکھتی ہو نا؟'' فیضو نے تنہائی میں دادی سے سرگوشی میں پوچھا۔

''ہاں۔'' دادی نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ وہ فیضو کی بات کا مطلب پوری طرح سمجھ رہی تھیں اور دلی صدمے کا اظہار ان کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ ''تالا لگا کر رکھتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ سارے پیسے وغیرہ الماری میں ہی رہتے ہیں۔''

''اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں دادی۔'' فیضو نے سرگوشی میں کہا۔ ''میں تو دن بھر کے لیے گھر سے چلا جاؤں گا۔ تم کو سخت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ایک منٹ کے لیے بھی غافل نہ ہونا اور سلائی مشین کا تو خاص طور سے خیال رکھنا.....''

''ہاں بیٹا۔'' دادی کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ''مگر اب شاید وہ ایسا نہ کریں، وہ بہت بیمار ہیں۔ ان سے تو ٹھیک سے چلا بھی نہیں جاتا۔''

''اس بھروسے میں نہ رہنا دادی۔'' فیضو نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''یہ تو بڑی بے غیرت ہڈی ہیں۔ ہمیں برباد کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پہلے ہی انہوں نے ہماری زندگیوں میں کیسا زہر گھول دیا تھا اور اب پھر نہ جانے کہاں سے ہمارے سر پر آ کر سوار ہو گئے ہیں۔''

دادی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ فیضو کی باتوں سے اختلاف بھی تو نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ماں تھیں..... ناخلف اولاد کو معاف کر سکتی تھیں۔ فیضو بیٹا تھا..... ظالم اور نکمے باپ کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔

☆======☆======☆

اس رات فیضو ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ اس کی آنکھ بار بار کھل جاتی تھی اور اس الماری کی طرف دیکھنے لگتا تھا جس میں پیسے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اس میں تالا لگایا ہوا تھا اور چابی بھی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ دادی نے کب الماری میں تالا لگایا اور کب اسے کھلا چھوڑ دیا۔ اس نے سلائی مشین کو بھی اٹھ کر بار بار دیکھا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ فیضو کو اسکول نہیں جانا تھا۔ دن کی روشنی میں اس نے جب ابا کو دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی بہت زیادہ بیمار ہیں۔ ان کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی اور جسم ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ آنکھیں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ ان سے ٹھیک طرح سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ چلتے میں ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں اور سانس پھولنے لگتا تھا۔ انہیں بار بار شدید کھانسی کے دورے پڑتے تھے۔

''نہ تو جلدی ٹھیک ہوں گے اور نہ یہاں سے جائیں گے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ تاہم اس کو اس بات کا قدرے اطمینان ہوا کہ اس حالت میں ابا کا گھر میں چوری کر کے بھاگ جانا آسان نہیں تھا۔ پھر بھی ان پر مستقل نظر رکھنا ضروری تھا۔

ابا اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دی اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ ہفتے بھر کے کتنے بہت سے کام اتوار کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔

ناشتے کے کچھ دیر بعد شمسن چچی آ گئیں۔ وہ دادی سے یہ کہنے کے لیے آئی تھیں کہ وہ آج کھانا نہ پکائیں کیونکہ وہ آج اپنے گھر میں کھچڑا پکا رہی تھیں اور یہاں بھی بھیجیں

گی۔انہوں نے ایک اجنبی کو گھر میں دیکھا۔وہ اس شخص کو نہیں پہچانتی تھیں۔

''ارے امدو کو نہیں پہچانا شمسن؟'' دادی نے شمسن چچی سے کہا۔

''امدو؟ اے یہ امدو بھائی ہیں؟'' شمسن چچی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔''اے ہے یہ کس قدر کھپٹ ہوگئے۔بالکل جیسے اچھور.....اے میں تو پہچان ہی نہیں سکی۔یہ اتنے برسوں رہے کہاں؟اس رات کے بعد سے ایسے غائب ہوئے کہ برسوں بعد آج شکل دکھائی ہے۔اے کبھی نگوڑ مارے اکلوتے بیٹے کی یاد بھی نہ آئی؟اے بالکل ہی کلیجہ پتھر کرلیا؟''

شمسن چچی بے تحاشہ بولے جارہی تھیں اور ابا کو بے نقط سنا رہی تھیں۔ابا کے چہرے پر برستی ہوئی پھٹکار میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔انہوں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن انہیں بڑے زور کی کھانسی اٹھی اور وہ کچھ دیر تک کھانستے رہے۔شمسن چچی ان کو غور سے دیکھتی رہیں۔

''صبح کا بھولا.....صبح.....کا بھولا.....شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہیں شمسن بہن۔'' ابا نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولتے ہوئے کہا۔''ہم بہت بیمار ہیں۔بس ذرا ٹھیک ہوجائیں تو پھر گھر کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔''

''اور تب تک مفت کی روٹیاں توڑیں گے۔''

فیضو نے نفرت بھری نظروں سے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔''اے تم کیا گھر کی ذمہ داری سنبھالو گے۔'' شمسن چچی نے حقارت آمیز انداز میں کہا۔

''اے تم تو بھیا اپنی اکیلی جان کی بھی ذمہ داری نہیں سنبھال سکے' گھر کی ذمہ داری کیا سنبھالو گے۔تم نے اس گھر کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔''

ابا کے چہرے پر جیسے اور بھی زیادہ خاک اُڑنے لگی۔ان کی آنکھوں کی گدلاہٹ میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔فیضو کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ شمسن چچی نے ابا کی خبر لی تھی۔دادی کے دل میں تو ان کے لیے نرم گوشہ موجود تھا اور انہوں نے اس نرم گوشے کا اظہار بھی کیا تھا' لیکن شمسن چچی کے دل میں بھلا کوئی نرم گوشہ کیوں موجود ہوتا؟

ابا نے شمسن چچی کی کڑی کسیلی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔دادی نے شمسن چچی کی باتوں کی نہ تائید کی اور نہ تردید کی۔وہ بس تھکی تھکی' اداس اور خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہیں۔

شمسن چچی تھوڑی دیر کے بعد چلی گئیں۔انہوں نے ابا سے پھر کوئی بات نہیں کی۔

ابا ناشتہ کرنے کے بعد لیٹ گئے۔دادی گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی تھیں۔فیضو اخبار پڑھ رہا تھا۔وہ اتوار کے اتوار باقاعدگی سے اخبار خریدتا اور پڑھتا تھا۔عام دنوں میں تو اسے ماسٹر راشد زبیری کے ہاں اخبار پڑھنے کو مل جاتا تھا۔ماسٹر صاحب باقاعدگی سے اخبار خریدتے تھے اور پڑھتے تھے اور وہ فیضو کو بھی یہ تلقین کرتے تھے کہ وہ دنیا کے تازہ ترین حالات سے واقف رہنے کے لیے اخبار ضرور پڑھا کرے۔ماسٹر راشد زبیری کی کہی ہوئی بات فیضو کے لیے کسی اٹل حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

''کھوکھو کھو۔'' ابا نے کھانسنا شروع کیا اور پھر ان کی کھانسی بڑھتی ہی چلی گئی۔فیضو اخبار میں شائع ہونے والا ایک مضمون بڑے غور اور دلچسپی سے پڑھ رہا تھا جو دل کی بیماریوں کے بارے میں تھا۔اسے میڈیسن اور سائنس کے موضوعات سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ابا کی مسلسل ''کھوکھو کھو'' نے اس کو سخت بے کیف کردیا۔اس کا ذہن مطالعے پر پوری توجہ نہیں دے رہا تھا۔

پھر ابا جلدی سے اٹھے اور چھوٹے سے کچے آنگن میں ایک کونے میں چلے گئے جہاں انہوں نے بہت سارا بلغم تھوک دیا اور پھر واپس آکر اپنے پلنگ پر گر گئے اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔

''فیضو بیٹا۔'' انہوں نے کمزور اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔''ذرا ایک گلاس پانی.....''

فیضو نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس نے ان کی بات سنی ہی نہیں ہے۔وہ خاموشی سے پڑھنے میں مصروف رہا۔

اسی وقت دادی ادھر آگئیں۔شاید انہوں نے ابا کی آواز سن لی تھی۔فیضو اسی طرح لاتعلق بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔

''اماں.....'' ابا نے دھیمی آواز میں کہا۔''ذرا ایک گلاس پانی.....''

''اچھا اچھا.....دیتے ہیں۔'' دادی نے کہا اور ابا کو ایک گلاس پانی دے دیا۔ابا پانی پی کر پھر لیٹ گئے اور وقفے وقفے سے کھانستے رہے۔دوپہر سے ذرا پہلے فیضو نے دادی سے اس وقت پوچھا جب وہ دوسرے کمرے میں مشین پر سلائی کررہی تھیں۔''دادی.....تم نے ابا سے پوچھا کہ اس رات وہ مشین چرا کر کہاں لے گئے تھے اور انہوں نے اس کا کیا کیا؟''

''نہیں بیٹا.....'' دادی نے ایک احساسِ جرم کے ساتھ کہا۔''ہم نے نہیں پوچھا۔اور اب پوچھنے سے فائدہ بھی کیا؟ وہ مشین کیا اب رکھی ہوگی؟ اور وہ خود ہی اتنے بیمار ہیں۔''

''بیمار ہیں' اور کہیں ٹھکانہ نہیں ہے رہنے کا' تبھی تو ہم کو ڈھونڈتے ہوئے ہمارے سر پر

آ کر سوار ہو گئے ہیں۔'' فیضو نے کہا۔

''ارے بیٹا پڑے رہنے دو انہیں ایک کونے میں.....'' دادی نے کہا۔ ''اب یہ کوئی گجر نالے کی جھگی تو ہے نہیں..... ماشاء اللہ کوارٹر ہے..... کافی جگہ ہے اس میں اور صرف ہم دو رہنے والے ہیں۔ ایک کونے میں ان کی چارپائی بھی پڑی رہنے دو۔''

فیضو نے دادی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' لیکن اس کے دل میں ابا کے خلاف نفرت کی ایک تازہ لہر اٹھی۔ ابا نے بڑی چالاکی کے ساتھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے سر پر مسلط کر دیا تھا۔

دوپہر کو شمسن چچی کے گھر سے کھچڑا آیا۔ شاکرہ کھچڑا لے کر آئی تھی۔

''اس لڑکی کو پہچانا امدو؟'' دادی نے شاکرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔ ابا غور سے شاکرہ کو دیکھنے لگے اور پھر انہوں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''لڑکیاں تو بڑی جلدی بڑھ جاتی ہیں اماں..... شکل وصورت ہی بدل جاتی ہے۔''

''اے بھائی شوکت حسین اور شمسن کی بڑی لڑکی ہے' شاکرہ.....'' دادی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا اچھا.....'' ابا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''شاکرہ ہے؟'' کیسی ہو بیٹی؟ اور تمہاری بہن مسعودہ کیسی ہے؟ اور تمہارے دونوں چھوٹے بھائی..... وہ کیسے ہیں؟''

''ارے..... امدو چچا کو تو سب کچھ یاد ہے۔'' شاکرہ نے خوش دلی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ ''کسی کو بھولے نہیں ہیں۔''

''ارے بیٹا' بھول کیسے جاتے؟'' ابا نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم لوگ ہمارے اپنوں کی طرح ہو..... کوئی اپنوں کو بھی بھول سکتا ہے؟''

فیضو نے بڑی کسیلی نظروں سے ابا کی طرف دیکھا۔

شاکرہ کھچڑا دے کر واپس چلی گئی۔ دادی نے ایک رکابی میں تھوڑا سا کھچڑا ابا کو کھانے کو دیا' لیکن ابا نے وہ سارا نہیں کھایا۔ فیضو انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ کھچڑا خوب چٹپٹا تھا اور اس کی وجہ سے ابا کو بار بار کھانسی اٹھنے لگتی تھی۔ مرچیں ان کے گلے میں خراش پیدا کر دیتی تھیں اور وہ بری طرح سے کھانسنے لگتے تھے۔ کھانسی کے ساتھ انہیں بلغم آنے لگتا تھا اور بار بار اٹھ کر کچے صحن کے ایک کونے میں جانا پڑتا تھا۔ انہوں نے مزید کھچڑا کھانے سے انکار کر دیا۔

کھچڑا بہت مزیدار تھا۔ فیضو نے تھوڑا سا چکھ کر دیکھا تھا اور اسے بہت اچھا لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ اس بات پر دل ہی دل میں جھلایا بھی تھا کہ اس کھچڑے میں سے ابا کو بھی

حصہ دینا پڑے گا اور اس طرح خود اس کے اپنے حصے میں آنے والا کھچڑا کم ہو جائے گا۔ جب ابا نے کھچڑا کھانے سے انکار کر دیا تو فیضو کو یک گونہ خوشی ہوئی۔

شام کے وقت شوکت چچا ابا سے ملنے کے لیے آئے۔ ان کی چہرے پر کوئی خوشگوار تاثر نہیں تھا۔ ابا نے ان کو بڑی رحم طلب نظروں سے دیکھا۔

''ارے..... تم تو بہت کمزور ہو گئے ہو امدو؟'' شوکت چچا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''شاکرہ کی ماں بتا رہی تھیں کہ تم بہت بیمار ہو۔''

''ہاں بھائی شوکت۔'' ابا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم بہت بیمار ہیں۔ کھانسی کم بخت پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ کھانستے کھانستے کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ جسم بھی بخار میں تپتا رہتا ہے۔''

''کچھ دوا علاج بھی کروایا؟'' شوکت چچا نے پوچھا۔ ''کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔''

''کچھ دن پہلے اسپتال گئے تھے۔'' ابا نے کہا۔ ''ان لوگوں نے کچھ دوائیں دی تھیں لکھ کر..... ایک مہینے کے بعد پھر بلایا تھا۔ ہم دوائیں نہیں لے سکے اور وہ پرچہ بھی گم ہو گیا۔''

''دوائیں کہاں سے لیتے؟'' فیضو نے دل ہی دل میں کہا۔ ''دوائیں مفت میں تو نہیں مل جاتیں۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو تو دوائیں کہاں سے ملیں گی۔''

شوکت چچا نے ابا سے ملاقات کر کے کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی ان سے یہ پوچھا کہ وہ اتنے برسوں تک کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔

اس دن کے بعد فیضو کے لیے گھر میں ایک نیا عذاب نازل ہو گیا تھا۔ ابا ہر وقت کھانستے اور بلغم تھوکتے رہتے تھے۔ دادی نے ٹین کے ایک بڑے سے پرانے ڈبے میں تھوڑی سی مٹی بھر کر ان کے پلنگ کے پاس رکھ دیا تھا۔ اب ابا کو بار بار اٹھ کر کچے آنگن کے کونے کی طرف جانے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ فیضو اس ساری صورتِ حال سے بیزار تھا۔ دادی کی اتنی عمر ہو گئی تھی لیکن وہ نہ تو کھانستی تھیں نہ تھوکتی تھیں۔ فیضو اپنے چھوٹے سے پُرسکون اور صاف ستھرے گھر میں اس قسم کی چیزوں کا بالکل عادی نہیں تھا جنہیں ابا اپنے ساتھ لے کر آ گئے تھے۔

دادی نے ابا کو کچھ گھریلو دوائیں دے کر خود ان کا علاج کرنے کی کوشش کی لیکن ابا کی طبیعت میں بہتری کے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے۔ اب ابا کہیں بھی آتے جاتے نہیں تھے۔ سارا دن پلنگ پر ہی نڈھال پڑے رہتے تھے اور کھوکھو کر کے کھانستے رہتے تھے۔ دن میں تو فیضو ان سے دور رہتا تھا لیکن شام کو گھر آنے کے بعد ان کی کھانسی کی آواز اس کے اعصاب

پر ہتھوڑے بن کر برستی تھی۔

ابا کو آئے ہوئے کوئی پندرہ دن ہوگئے تھے کہ ایک رات کو دادی نے فیضو سے کہا۔

''بیٹا، تم ذرا اپنے ابا کو نفاست حسین کو تو دکھا لو، ایک بار ڈاکٹر دیکھ لے اور کچھ دوائیں وغیرہ دے دے تو شاید ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے۔''

''پیسے لگتے ہیں دادی۔'' فیضو نے سرد اور خشک لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر مفت میں تو نہیں دیکھ لے گا۔''

''اللہ مالک ہے بیٹا۔'' دادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر دیکھ تو لے، پھر کوشش کریں گے کسی سرکاری اسپتال سے علاج کروالیں گے۔''

ڈاکٹر نفاست حسین کا کلینک اسی علاقے میں فیضو کے گھر کے قریب واقع تھا، وہ جس کوارٹر میں رہتا تھا، اس کے ایک چھوٹے سے حصے میں اس نے کلینک قائم کر رکھا تھا جہاں وہ مریضوں کو دیکھتا بھی تھا اور خود ہی اپنے ہی پاس سے دوائیں بھی بنا کر دیتا تھا۔ اس کے پاس کوئی کمپاؤنڈر یا ڈسپنسر بھی نہیں تھا۔ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر نفاست حسین واقعی کوئی ڈگری یافتہ اور کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے یا وہ کوئی جعلی ڈاکٹر ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کو اس بات کی کوئی کھوج نہیں تھی۔ انہیں تو بس اتنا معلوم تھا کہ ڈاکٹر نفاست حسین ان کا دوست اور ہمدرد ہے، دواؤں کے پیسے بہت کم لیتا ہے اور آدھی رات کو بھی اگر کوئی ضرورت پڑ جائے تو وہ فوراً مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اس کے علاج سے مریضوں کو فائدہ بھی ہوتا تھا۔

فیضو کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ ابا کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جائے لیکن وہ ابا کی پیہم کھانسی سے عاجز تھا جس نے اس کا گھریلو سکون غارت کر کے رکھ دیا تھا۔ ابا کی کھوکھو جیسے اب گھر کی فضا کا ایک یاس انگیز اور روح فرسا حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ ''اگر دوا سے ان کی کھانسی ٹھیک ہو جائے تو کم از کم خاموش تو رہیں گے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ اپنے اسی پُرسکون ماحول میں واپس جانا چاہتا تھا جس کا ابا نے ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا۔

اگرچہ ڈاکٹر نفاست حسین کا مطب زیادہ دور نہیں تھا، لیکن ابا کے لیے اتنی دور چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ انہیں سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلاتا ہوا مطب کی جانب چلا۔

ابا کے بدن سے اور کپڑوں سے ایک عجیب قسم کی ناگوار اور مریضانہ بو آ رہی تھی۔ اگرچہ آنے کے بعد وہ کئی بار نہا چکے تھے اور اماں نے ان کے پہننے کے لیے ایک دوسرے جوڑے کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ تو خالی ہاتھ جھلاتے ہوئے یہاں چلے آئے تھے

اور ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا، لیکن پھر بھی ایک ناگوار بو تھی جو جیسے ان کے جسم کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ فیضو کا جی چاہ رہا تھا کہ ان سے الگ ہو جائے لیکن وہ ان سے چپکا رہنے اور انہیں سہارا دینے پر مجبور تھا۔

راستے میں ابا نے اس سے اس کی پڑھائی اور اسکول وغیرہ کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی، لیکن فیضو نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اسے ابا سے بات کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر نفاست حسین نے ابا کا بہت اچھی طرح سے تفصیلی معائنہ کیا اور وہ فیضو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو بھئی، دوا تو ہم دے رہے ہیں لیکن صحیح علاج اسی وقت ہو سکے گا جب تم ان کا ایکسرے کروالو۔ ایکسرے کی رپورٹ دیکھنے کے بعد ہی ہم ان کے مرض کی بالکل صحیح تشخیص کر سکیں گے۔''

دواؤں پر بھی کچھ پیسے خرچ ہو گئے تھے اور اب ڈاکٹر ایکسرے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس میں بھی اچھے خاصے پیسے لگ جائیں گے۔ فیضو کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہو گیا۔

ماسٹر راشد زبیری نے اپنے ایک پرانے شاگرد کے ذریعے جو جناح اسپتال میں کام کرتا تھا ابا کے مفت اور فوری ایکسرے کا بندوبست کروا دیا۔ ایکسرے ہو گیا رپورٹ آ گئی۔ فیضو رپورٹ لے کر ڈاکٹر نفاست حسین کے پاس گیا۔

''میرا اندیشہ بالکل درست نکلا۔'' ڈاکٹر نفاست حسین نے رپورٹ دیکھنے کے بعد کہا۔ ''تمہارے ابا کی حالت دیکھ کر ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کو ٹی بی ہے، اب ایکسرے کی یہ رپورٹ بتا رہی ہے کہ ان کا ایک پھیپھڑا تو بالکل ختم ہو گیا ہے، دوسرا البتہ اتنا خراب نہیں ہے، لیکن وہ بھی تیزی سے خراب ہوتا جا رہا ہے۔''

''پھر؟'' فیضو نے پوچھا۔ ''کیا ان کا علاج ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے؟''

''علاج ہو سکتا ہے۔'' ڈاکٹر نفاست حسین نے کہا۔ ''لیکن دو باتیں اچھی طرح سمجھ لو، علاج لمبا ہے۔ کئی برس تک چل سکتا ہے اور مہنگا بھی ہے۔ ایک بار شروع کر کے اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔''

فیضو کے پوچھنے پر ڈاکٹر نفاست حسین نے دوا کے اخراجات وغیرہ کے بارے میں بتایا تو فیضو کے ہوش اُڑ گئے۔ یہ اخراجات کئی سال کی مدت پر پھیلے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر نفاست حسین نے اسے احتیاطی تدابیر کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا۔ یہ چھوت کی بیماری تھی، گھر کے دوسرے لوگوں کو اس سے بچانا ضروری تھا۔

"اگر چاہو تو کچھ دن کے لیے انہیں جناح اسپتال میں یا ٹی بی سینی ٹوریم میں داخل کروا سکتے ہو۔" ڈاکٹر نفاست حسین نے کہا۔ "لیکن وہ لوگ انہی زیادہ دنوں تک رکھیں گے نہیں..... ان کی بیماری کوئی ایسی تو ہے نہیں کہ دو چار دن کے علاج سے ٹھیک ہو جائے۔"

فیضو واپس گھر کی طرف روانہ ہوا تو اس کا ذہن سخت انتشار اور برہمی کی حالت میں تھا۔ ابا کے آجانے سے گھر کے اخراجات میں پہلے ہی اضافہ ہو چکا تھا۔ پہلے کھانے والے صرف دو آدمی تھے اور دونوں ہی کمائی کرتے تھے لیکن اب کمانے والے تو اتنے ہی رہے تھے لیکن کھانے والے تین ہو گئے تھے۔ آٹے کا کنستر' چاول کا تھیلا اور شکر کا ڈبہ جلدی جلدی خالی ہونے لگے تھے۔ دودھ اور چائے کی پتی بھی زیادہ خرچ ہو رہی تھی۔ اور اب..... اب ایک اور وبال نازل ہونے والا تھا..... ابا کا علاج..... برسوں تک جاری رہنے والا مہنگا علاج' جس کے لیے کافی پیسے کی ضرورت تھی..... اور اگر اس طویل اور مہنگے علاج کے نتیجے میں وہ بچ بھی گئے تو کیا ہوگا؟ پہلے کی طرح پھر چوری چکاری کے دھندوں میں لگ جائیں گے اور دوسروں کا جینا حرام کر دیں گے۔

فیضو کی ترجیحات بالکل مختلف تھیں اور ان میں کہیں بھی ابا پر پیسہ خرچ کرنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔

اس نے فیڈرل بی ایریا میں ایک سو بیس گز کے پلاٹ کی الاٹمنٹ کے لیے دو درخواستیں دی تھیں' ایک اپنے نام سے اور ایک دادی کے نام سے۔ یہ سرکاری اسکیم تھی' جس میں سرکاری نرخ پر قرعہ اندازی کے ذریعے شہریوں کو پلاٹ الاٹ کیے جا رہے تھے۔ قرعہ اندازی میں پلاٹ نکل آنے کے بعد پھر قسطوں میں اس کی قیمت ادا کرنی تھی۔

شوکت چچا نے بھی تین الگ الگ ناموں سے درخواستیں داخل کر دی تھیں۔

درخواست کے ساتھ تھوڑی سی رقم جمع کرانی تھی' جو پلاٹ نہ ملنے کی صورت میں واپس ہو جاتی' فیضو نے دو پلاٹوں کے لیے درخواستیں دی تھیں' اس کے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں تھے ایک ہی درخواست کے لیے بڑی مشکل سے کھینچ تان کر بندوبست کرنا پڑا تھا' اس موقع پر شوکت چچا اور شمسن چچی نے اس کی مدد کی تھی۔ انہوں نے اسے کچھ پیسے ادھار دے دیئے تھے۔

پلاٹوں کی قرعہ اندازی ہوئی تو سب سے زیادہ خوش نصیبی دادی کے حصے میں آئی۔ دادی کے نام ایک سو بیس گز کا ایک پلاٹ نکل آیا جبکہ فیضو کا اپنا نام قرعہ اندازی میں نہیں آیا' نیز شوکت چچا کے تینوں نام بھی خالی گئے۔ ان لوگوں کو اپنی رقم واپس مل گئی۔

دادی کے نام پلاٹ نکل آیا تھا اور یہ ایک ایسی شاندار کامیابی تھی کہ فیضو خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اب اچانک صاحبِ جائیداد ہو گیا تھا۔ وہ شہر کے ایسے نئے علاقے میں' جہاں ابھی مکانات بننا شروع نہیں ہوئے تھے ایک پلاٹ کا مالک بن گیا تھا اب اس کو اس پلاٹ کی قسطیں ادا کرنی تھیں۔ اسے ایک ایک پائی بچانی تھی۔ آمدنی بڑھانی تھی۔ ٹیوشنوں سے زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے تھے اور کم سے کم پیسے خرچ کرنے تھے۔ اسے ہر طرح جتن کر کے اس پلاٹ کو اپنے قبضے میں رکھنا تھا۔ اس نے شوکت چچا کی رقم بھی واپس نہیں کی جو انہوں نے اسے ادھار دی تھی اور جو اسے بعد میں واپس مل گئی تھی۔ اس نے اس رقم کو قسط میں جمع کرا دیا اور شوکت چچا سے کہا کہ وہ ان کے پیسے بعد میں ادا کر دے گا۔ وہ کسی حالت میں بھی اس پلاٹ سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا اس نے دادی کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا کہ ایک ایک پائی بچانا اور جوڑنا بہت ضروری ہے۔ دادی بھی اس بات سے بہت خوش تھیں کہ وہ لوگ اب ایک پلاٹ کے مالک بن گئے ہیں' جس پر خدا توفیق دے تو کبھی اپنا مکان بھی تعمیر کروایا جا سکتا ہے۔

حالات قابو میں تھے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک ابا بیچ میں کود پڑے۔ ان کے آنے سے کھانے وغیرہ کے جو اخراجات بڑھے تھے وہ تو اپنی جگہ پر تھے ہی' لیکن ان کی بیماری تو ایک ایسا وبال تھی جس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ برسوں تک سینکڑوں روپے مہینے کا خرچہ..... اتنی تو آمدنی بھی نہیں تھی..... نہیں..... وہ ایک چلتی پھرتی لاش میں تازہ روح پھونکنے کے لیے اپنے آپ کو قربان نہیں کر سکتا تھا۔

گھر واپس آنے کے بعد اس نے دادی کو ابا کی بیماری کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر کہتا ہے کہ اب ابا کا چل چلاؤ ہے اور انہیں دوسرے صحت مند لوگوں سے الگ تھلگ رکھنے کی ضرورت ہے۔ انہیں ٹی بی ہو گئی ہے اور ان کے دونوں پھیپھڑے چھلنی ہو چکے ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے برتن بالکل الگ کر دو اور خود بھی ان سے دور رہو یہ اُڑ کر لگنے والی بیماری ہے۔"

دادی فیضو کی یہ بات سن کر بہت دیر تک روتی رہیں۔ پھر جب ان کا دل ذرا ٹھکانے آیا تو انہوں نے کہا۔ "ہماری طرف اس کو بڑی بیماری کہتے تھے اور یہ کہا جاتا تھا کہ یہ بیماری تو قبر کھود کر آتی ہے' نہ جانے امدو کو یہ بیماری کس طرح ہو گئی۔ مگر بیٹا' ڈاکٹر نے کوئی دوا تو بتائی ہو گی؟"

"ہاں۔" فیضو نے کہا۔ "ڈاکٹر نے دوا لکھ کر دی ہے' میں بازار سے لے آؤں گا۔"

لیکن فیضو بازار سے وہ مہنگی دوائیں نہیں لایا جو ڈاکٹر نے لکھ کر دی تھیں۔اس کے بجائے وہ سر درد کی معمولی اور بے حد سستی گولیاں خرید لایا جنہیں اس نے پتے میں سے نکال کر ایک خالی شیشی میں ڈال دیا۔اس نے دادی کو بتایا کہ اس میں سے ایک گولی روزانہ رات کو ابا کو دینا ہے اور وہ خود ہی انہیں دوا دیا کرے گا۔اس نے وہ شیشی بھی اپنی تحویل میں ہی رکھی۔وہ رات کے کھانے کے بعد اس میں سے ایک گولی اپنے ابا کو دے دیتا تھا۔اس نے دادی کو سختی کے ساتھ ہدایت دے رکھی تھی کہ ابا کی ہر چیز الگ کر دیں اور گھر میں کھانے پینے کی کسی چیز میں یا برتنوں وغیرہ میں انہیں ہاتھ نہ لگانے دیں۔ایک شام ابا اپنے کٹورے میں مٹکے سے پانی انڈیل رہے تھے کہ فیضو ان پر بری طرح برس پڑا۔''کیوں ہاتھ لگا رہے ہو مٹکے کو؟ مانگ نہیں سکتے تھے مجھ سے یا دادی سے؟ جانتے نہیں ہو کیا کہ تمہیں ٹی بی ہے۔کیا سارے گھر کو ٹی بی لگاؤ گے؟'' ابا کا بڑھا ہوا ہاتھ ایک دم رک گیا۔وہ مٹکے کے پاس سے ہٹ گئے۔ان کے چہرے پر مردنی طاری ہو گئی۔

''تم نے امدو کو بہت بری طرح جھڑک دیا۔'' دادی نے بعد میں تنہائی میں فیضو کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔''تم انہیں نرمی سے بھی سمجھا سکتے تھے۔''

''ان کا مٹکا الگ کر دو دادی۔'' فیضو نے جواب میں بالکل دوسری بات کہی۔''انہیں گھر کے مٹکے میں ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

فیضو اس دن کے بعد سے پھر کبھی اپنے باپ کو ڈاکٹر نفاست حسین یا کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس لے کر نہیں گیا۔دادی کے پوچھنے پر وہ یہی کہتا تھا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بس یہی دوا دیتے رہو۔دادی اپنے طور پر کچھ عملیات اور جھاڑ پھونک وغیرہ میں بھی لگی رہتی تھیں۔ابا کے گلے میں کئی کئی تعویذ نظر آنے لگے تھے جن کی ڈوریاں ان کی گردن کے میل اور پسینے میں اٹی رہتی تھیں لیکن اس سب کا کچھ بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ابا کی حالت تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔اب تو ان کو کھانسی میں خون بھی آنے لگا تھا۔

ابا کو زندہ نہیں رہنا چاہئے تھا۔اس کی ایک اور ٹھوس وجہ بھی تھی۔

فیضو کو فیڈرل بی ایریا میں جو پلاٹ قرعہ اندازی کے ذریعے ملا تھا' وہ فیضو کے اپنے نام پر نہیں تھا' بلکہ دادی کے نام پر تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ قانونی طور پر اس کی وراثت میں ابا بھی شریک تھے۔فیضو اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ابا کو وراثت سے بے دخل نہیں کر سکتا.....صرف ابا کی موت ہی ان کو وراثت سے خارج کر سکتی تھی۔اس نے خود تو ابا کو پلاٹ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ ابا سے زیادہ فالتو بات ہی نہیں کرتا تھا لیکن

دادی کی زبانی انہیں اس کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا اور انہوں نے اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ابا کا یہ اظہارِ مسرت فیضو کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔علاوہ ازیں ابا سعود آباد کے کوارٹر میں بھی دادی کی وراثت میں شریک تھے۔

دن گزرتے گئے۔ابا کو ایک دن بھی ان کے مرض کی صحیح دوا نہیں ملی اور ان کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔بعض اوقات تو وہ ساری رات کھانس کھانس کر اور خون تھوک تھوک کر گزار دیتے تھے اور فیضو دل ہی دل میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ ابھی ابا کی زندگی میں ایسی اور کتنی راتیں باقی ہیں اور آخری رات کیسی ہوگی؟ کب آئے گی؟

دریں اثناء وہ کبھی کبھار ڈاکٹر نفاست حسین کے مطب کا چکر لگا لیتا تھا اور اسے بتاتا تھا کہ وہ اس کی تجویز کردہ دوائیں پابندی سے ابا کو دے رہا ہے' لیکن ان کی حالت میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ڈاکٹر نفاست حسین اسے بتاتا کہ ان دواؤں کے علاوہ ٹی بی کا کوئی دوسرا علاج موجود نہیں ہے اور وہ انہی دواؤں کو جاری رکھے۔تاہم اس نے بعض دواؤں میں کچھ تبدیلیاں بھی کی تھیں۔

اس روز دادی کے بہت زیادہ اصرار پر وہ ڈاکٹر نفاست حسین کو گھر بلا لایا۔ابا پر بار بار غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ڈاکٹر نفاست حسین نے ان کا تفصیلی معائنہ کیا۔

''ہم انہیں دوائیں تو برابر دے رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔'' فیضو نے کہا۔''لیکن حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی جا رہی ہے۔''

''بھائی اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' ڈاکٹر نفاست حسین نے آہستہ سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''بہتر ہوگا کہ تم ان کو اسپتال لے جاؤ۔وہ لوگ انہیں داخل کر لیں گے' پھر شاید وہ کچھ کر سکیں۔''

دادی رونے لگیں۔انہوں نے شوکت چچا کو بلوایا۔اگلے دن شوکت چچا نے ایک ٹیکسی کا بندوبست کیا اور وہ فیضو اور ابا کو لے کر جناح اسپتال گئے۔ماسٹر راشد زبیری کے شاگرد نے ان لوگوں کی بہت مدد کی اور ابا کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔

''مریض کی حالت بہت خراب ہے۔'' شاگرد نے ڈاکٹر کے حوالے سے فیضو کو بتایا۔''عام طور سے ایسے مریض کو داخل نہیں کرتے' جس کی زندگی کی کوئی امید نہ ہو اور اسے واپس گھر بھیج دیتے ہیں۔میرے کہنے سننے سے انہوں نے انہیں داخل تو کر لیا ہے لیکن ایک دو دن سے زیادہ رکھیں گے نہیں۔بستروں کی بہت سے دوسرے مریضوں کو ضرورت ہے۔''

فیضو اور شوکت چچا ابا کو اسپتال میں چھوڑ کر واپس آ گئے۔فیضو دوسرے دن اسکول کی

چھٹی کے بعد اسپتال گیا۔ابا وارڈ میں نہیں تھے۔ان کے بستر پر کوئی اور مریض لیٹا ہوا تھا۔معلوم ہوا کہ ابا کا گزشتہ رات انتقال ہوگیا تھا اور ان کی لاش کو مردہ خانہ میں رکھ دیا گیا تھا۔

''افوہ.....''فیضو نے گہری اکتاہٹ کے ساتھ دل میں کہا۔''خواہ مخواہ اس قدر مصیبت سے یہاں لانا پڑا۔اب اس سے زیادہ مصیبت ہوگی جنازہ سعود آباد لے جانے میں ایک دو دن پہلے گھر پر ہی ختم ہو جاتے تو کیا ہرج تھا؟''

ابا کی موت پر رونے والا دادی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔فیضو جب ان کی لاش لے کر گھر پہنچا تو دادی چیخ چیخ کر رونے لگیں۔''اچھا ہے'جی بھر کر رولیں۔آخر ایک نہ ایک دن تو رونا ہی تھا۔''فیضو نے دل میں کہا۔

فیضو نے ابا کی تدفین کے فوراً ہی بعد ان کے ذاتی استعمال کی ساری چیزیں جن میں ان کے دو ایک جوڑے کپڑے بھی شامل تھے'باہر پھینکوا دیں۔ان کی چارپائی کو چھت پر دھوپ میں ڈلوا دیا اور ابا کی موت کے فوراً بعد جو سب سے پہلا کام اس نے کیا'وہ تھا کہ اس نے ڈاکٹر نفاست حسین کے لکھے ہوئے نسخے کو پرزے پرزے کر کے پھینک دیا۔

جس رات کا اسے مہینوں سے انتظار تھا'وہ آئی تو ایسے چپکے سے آئی کہ اسے اس کی خبر ہی نہ ہوسکی۔بہرحال'وہ رات آچکی تھی اور اپنا جادو جگا کر چلی گئی تھی۔

اسے اطمینان ہوا کہ اب گھر کے اخراجات میں کمی واقع ہو جائے گی۔دادی ابا کے لیے کچھ زیادہ ہی کھانے کا انتظام کرتی تھیں۔وہ ان کے لئے روزانہ ایک پاؤ دودھ بھی لیتی تھیں نیز کچھ پھل بھی ان کے لیے ضرور خریدتی تھیں۔بڑی بیماری میں مبتلا ہونے والے لوگوں کی غذا پر تو خاص توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

اب پلاٹ بھی محفوظ تھا اور کوارٹر بھی۔دادی کا کوئی اور وارث تو تھا ہی نہیں۔دادی کے دوسرے بیٹے اور ان کی جو اولادیں وغیرہ تھیں ان سے تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ان کی طرف سے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی شوکت چچا نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ پلاٹ اپنے نام کروالے۔دادی تو خود بھی یہی چاہتی تھیں۔انہوں نے پلاٹ فیضو کے نام کردیا۔قانونی کارروائی مکمل کرنے میں ماسٹر راشد زبیری نے بہت مدد کی۔

ابا کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا اور فیضو نے آزادی کی سانس لی۔زندگی ایک بار پھر بڑی تیزی سے رواں دواں ہوگئی۔فیضو نے میٹرک کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔سائنس میں اس نے سب سے زیادہ نمبر لیے۔ماسٹر راشد زبیری بہت

زیادہ خوش تھے۔انہوں نے پہلے ہی فیضو کو یہ مشورہ دیا تھا کہ میٹرک کرنے کے بعد وہ سائنس میں داخلہ لے۔فیضو کو سائنس سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے سائنس کالج میں داخلہ ملنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

جس دن فیضو کا رزلٹ آیا۔اس دن دادی اپنے مرنے والے بیٹے کو یاد کر کے بہت روئیں۔''ارے'اس سے تو اچھا ہوتا کہ وہ یہاں آئے ہی نہ ہوتے۔ہم یہی سمجھتے رہتے کہ ہوں گے کہیں پڑے ہوئے۔مگر وہ آئے بھی اور پھر ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ہم نے تو ان کا کتنا علاج کروایا.....کیسی مہنگی دوائیں ان کے لیے فیضو لایا.....مگر جو خدا کو منظور.....آج اگر زندہ ہوتے تو بیٹے کی کامیابی دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔مگر یہ ناس پیٹی بیماری.....اس نے تو کھک کر دیا دُکھیا کو.....''

شوکت چچا اور شمسن چچی فیضو کی اس کامیابی میں اپنی بیٹی کی آئندہ زندگی کی خوشحالی اور مسرت کی تصویر دیکھ رہے تھے۔فیضو کو جو کچھ حاصل ہو رہا تھا وہ اکیلے فیضو کا نہیں تھا'اس میں شاکرہ کا بھی پورا پورا حصہ تھا۔وہ دونوں میاں بیوی ہر مرحلے پر فیضو اور اس کی دادی کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

لیکن اب وقت آگیا تھا کہ اس معاملے کو ایک باضابطہ شکل دے دی جائے۔دونوں گھرانوں کی گہری قربت اور شاکرہ اور فیضو کی باہمی دوستی کے باوجود'جسے ان دونوں کی ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کی یقینی علامت قرار دیا جاسکتا تھا'ابھی تک اس سلسلے میں دونوں گھرانوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی اور جہاں تک فیضو اور شاکرہ کا تعلق تھا تو ان کے درمیان بھی رسمی قسم کے اظہارِ محبت کی کوئی منزل نہیں آئی تھی۔

☆======☆======☆

فیضو نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا اور زندگی ایک ہی جھٹکے میں بہت آگے بڑھ گئی۔سب کو یہ لگ رہا تھا کہ فیضو اچانک بہت بڑا ہوگیا ہے اور خود فیضو کو بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یکبارگی اپنے بچپن اور لڑکپن کو بہت پیچھے چھوڑ کر بڑوں کی دنیا میں داخل ہو گیا ہے'جہاں زندگی کے نئے مطالبات اس کے منتظر ہیں۔

ماسٹر راشد زبیری صرف میٹرک تک کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ٹیوشن دیتے تھے۔فیضو اس مرحلے سے گزر چکا تھا'لیکن وہ اب بھی وہاں جاتا تھا۔ماسٹر صاحب سے انگریزی اور اردو میں کافی مدد مل جاتی تھی اور پھر وہاں فیضو کے اپنے شاگرد بھی تھے۔اب تو اس نے اپنی فیس بھی بڑھا دی تھی اور اس کے شاگردوں کی تعداد بھی بڑھتی جارہی تھی۔

اس مرحلے پر شوکت حسین نے یہ فیصلہ کیا کہ فیضو کی دادی سے بات کر کے رشتہ پکا کر دیا جائے یا کم از کم معاملے کو ایک خاص شکل تو دے دی جائے۔ وہ لوگ اگرچہ لڑکی والے تھے لیکن یہاں کوئی ایسا نہیں تھا جسے درمیان میں ڈال کر بات کی جا سکتی۔ خود ہی کسی نہ کسی طرح گھما پھرا کر بات نکالنی تھی۔ شاکرہ آٹھویں پاس کر کے نویں میں آ چکی تھی۔ وقت تو پر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ وقت کو تو قید نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن آنے والے وقت کی موجوں میں اپنی پسندیدگی کی گرہیں ضرور لگائی جا سکتی تھیں۔

اس روز شوکت چچا اور شمسن چچی دونوں دادی کے پاس پہنچے۔ دادی گھر میں اکیلی بیٹھی سلائی کر رہی تھیں۔ فیضو کالج گیا ہوا تھا۔

''فیضو بتا رہا تھا کہ وہ اب ذرا بڑی کلاسوں کے بچوں کو بھی ٹیوشن دینے لگا ہے۔''

شوکت حسین نے گفتگو کی ساری حکمت عملی پہلے ہی سے طے کر لی تھی اور اب اس کا آغاز کر رہا تھا۔ ''فیضو کہہ رہا تھا کہ آمدنی بھی بڑھ گئی ہے۔''

''ہاں بھیا۔'' دادی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھے بھی بتا رہا تھا۔''

''اپنا تو سارا خرچہ بہت دنوں سے وہ خود ہی اٹھاتا ہے۔''

''دو سال میں انٹر کر لے گا..... پھر وہ کیا کہتے ہیں کہ اسے بی ایس سی..... اور پھر کہیں بہت اچھی سی نوکری مل جائے گی اسے۔'' شوکت حسین نے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو بہت ترقی کرے گا ہمارا فیضو۔ بڑا ہی لائق بچہ ہے، بہت اونچا جائے گا۔''

''اے تمہارے منہ میں گھی شکر بھیا۔'' دادی نے کہا۔ ''اے ہماری پھوٹی آنکھوں کا تو وہی ایک تارہ ہے۔ اس کو دیکھ کر تو ہم جیتے ہیں۔ اسی کے لیے تو ہم اس بڑھاپے میں اپنی آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر یہ سلائی کا کام کرتے ہیں کہ گھر کا چولہا جلتا رہے۔ اللہ بخشے امدو نے تو کچھ بھی کر کے نہ دیا اور اس بچے کو دیکھو..... امدو بیمار ہو کر یہاں آئے تو پیسہ نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے باپ کے دوا علاج پر کتنی رقم خرچ کی۔ کیسی کیسی مہنگی دوائیں باپ کے لیے لا کر دیں، مگر بھیا وہ تو اتنی ہی لکھا کر لائے تھے، آخر کو ختم ہو گئے۔''

''سب کو ایک دن ختم ہو جانا ہے فخرن خالہ۔'' شمسن نے گفتگو کی ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''مگر امدو بھائی بے چارے وقت سے بہت پہلے اٹھ گئے۔ وہ تو اپنے بیٹے کا سہرا بھی نہ دیکھ سکے۔''

''ارے اگر وہ زندہ ہوتے تو سہرا بھی دیکھ لیتے۔'' دادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''کون سے دس بیٹے تھے ان کے۔ لے دے کے یہی ایک لڑکا..... ماں حرافہ تو ایسی نکلی

کہ سب کے منہ پر جوتا مار کر دفعان ہو گئی۔''

دادی اپنی بہو کو گالیاں دینے اور کوسنے دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔

''اے خاک ڈالو نگوڑ ماری پر فخرن خالہ۔'' شمسن نے کہا۔ ''اب اس کے نام کی کب تک پٹس ڈالتے رہیں۔ اب تو آگے کی سوچو..... آنے والے دنوں کے بارے میں سوچو۔''

''ہاں خالہ۔'' شوکت حسین نے اپنی بیوی کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو۔ فیضو اکیلا بچہ ہے۔ زمانہ بہت خراب ہے فخرن خالہ..... خدا نہ کرے، کوئی اسے بہکائے اور وہ کوئی الٹے سیدھے لوگوں کے پھیر میں آ جائے، تم اس کو کہیں باندھ دو۔''

''باندھ دیں؟'' دادی نے حیرت سے کہا۔ ''کیا مطلب؟ کہاں باندھ دیں؟''

''مطلب یہ ہے فخرن خالہ کہ اس کی کہیں بات چیت طے کر دو۔'' شمسن نے صاف کہا۔ ''کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر ابھی سے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھا دو کہ اسے اس کے ساتھ شادی کر کے گھر بسانا ہے۔''

''اس میں بڑا فائدہ ہے فخرن خالہ۔'' شوکت حسین نے کہا۔ ''لڑکے کو اگر یہ معلوم رہے کہ آئندہ چل کر فلاں لڑکی سے اس کی شادی ہو گی اور اسے اس کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہو گی تو پھر لڑکے کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا نہیں ہے اور اس کے گھر والوں کو بھی اطمینان رہتا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں فیضو کی بات کہیں پکی کر دینی چاہیے؟'' دادی نے شوکت حسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں فخرن خالہ۔'' شوکت حسین نے کہا۔ ''ہمارے خیال میں تو تم فیضو کے لیے ابھی سے کوئی لڑکی تلاش کر لو۔''

''ہم تو بہت پہلے سے ہی فیضو کے لیے ایک لڑکی کو نظر میں رکھے ہوئے ہیں۔'' دادی نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

شوکت حسین اور شمسن چچی دونوں کے دماغ ایک ساتھ ہی جھنجھنا اٹھے۔

''کیا؟'' شمسن کی زبان سے بے ساختگی کے عالم میں نکلا۔ ''تم نے لڑکی تلاش کر لی ہے؟''

اور اس کے ساتھ ہی ان کی نظروں کے سامنے پندرہ دن پہلے کا ایک واقعہ گھوم گیا۔ زبیدہ اپنی بڑی بیٹی رقیہ کے ساتھ سعود آباد آئی تھی اور دونوں ماں بیٹیوں نے تقریباً سارا

دن یہاں گزارا تھا۔فخرن خالہ ان دونوں کے آنے سے بہت خوش تھیں۔زبیدہ کے ان پر بڑے احسانات تھے۔زبیدہ نے ہی انہیں کپڑے سینے کا کام دلوایا تھا۔زبیدہ کی بیٹی رقیہ بہت خوبصورت تھی اور فخرن خالہ اکثر اس کی تعریف کرتی رہتی تھیں۔وہ اس وقت ساتویں میں پڑھ رہی تھی۔پندرہ دن پہلے جب رقیہ اپنی ماں کے ساتھ ان لوگوں کے گھر آئی تھی تو اس کے جانے کے بعد فخرن خالہ نے شمسن سے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔''کیسی پیاری بچی ہے ماشاءاللہ اے بالکل جیسے چاند کا ٹکڑا.....''

اور اب جو دادی نے کہا کہ انہوں نے فیضو کے لیے ایک لڑکی تلاش کر لی ہے تو معاً شمسن کا ذہن رقیہ کی طرف گیا۔رقیہ گجرنالے میں کبھی کبھی فیضو سے پڑھنے کے لیے بھی آجایا کرتی تھی۔

''اچھا؟''شمسن نے سخت حیرت کے عالم میں لیکن دھیمے لہجے میں کہا۔''تم نے فیضو کے لیے لڑکی تلاش کر لی ہے' چلو اچھا کیا.....کون ہے وہ؟''

''اچھا ہوا کہ تم لوگوں نے خود ہی یہ ذکر نکال لیا۔''دادی نے کہا۔''ورنہ وقت آنے پر ہم خود ہی تمہارے آگے جھولی پھیلائے ہوئے آتے اور جھولی تو اب بھی پھیلانی ہی ہے' ہم لڑکے والے جو ٹھہرے.....لڑکے والوں کو تو جھولی پھیلانی ہی پڑتی ہے۔''

''اے کیا مطلب ہے فخرن خالہ؟''شمسن کی آواز فرطِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔رقیہ کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے سے بھک سے اُڑ گئی تھی۔وہ سارا منظر یکبارگی فضا میں تحلیل ہوگیا تھا۔''اے ذرا صاف صاف بات کرو نا.....''

''صاف بات یہ ہے شمسن کہ ہم تو کب سے تمہاری شاکرہ کو اپنی نظر میں رکھے ہوئے ہیں۔''دادی نے کہا۔''بھلا فیضو کے لیے اور اس گھر کے لیے شاکرہ سے اچھی لڑکی اور کون ہو سکتی ہے؟''

''اے اللہ تمہاری زبان مبارک کرے فخرن خالہ۔''شمسن نے خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے کہا۔وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی۔اس کی آواز بھرانے لگی۔''سچ جانو فخرن خالہ' ہمیں تو فیضو اپنے بچوں کی طرح عزیز ہے۔ہم نے اسے کبھی اپنوں سے الگ سمجھا ہی نہیں۔''

''اے یہ بھی بھلا کوئی کہنے کی بات ہے شمسن؟''دادی نے کہا۔''تم لوگوں نے اس بچے کے لیے جو کچھ کیا ہے' وہ بھلا آج کل کے وقتوں میں کون کسی کے لیے کرتا ہے؟ اے تم

لوگوں نے تو سمجھو کہ اسے اور ہمیں نئی زندگی دی ہے۔اے وہ جھاڑو پھیری افسری تو ہمارے منہ کو لو لگا کر دفعان ہوگئی تھی.....''دادی ایک بار پھر اپنی بہو کو گالیاں اور کوسنے دینے پر اتر آئی تھیں۔جب ذرا سانس لینے کے لیے رکیں تو شوکت حسین نے ذرا سنبھل کر ان سے کہا۔''ایک بات اور ہے فخرن خالہ۔اگر برا نہ مانو تو کہوں۔''

''اے لو بھلا' ہم تمہاری بات کا کیا برا مانیں گے بھیا؟ اے تم ایک نہیں دس باتیں پوچھو۔ہم نے کب تمہیں منع کیا ہے۔''

شوکت حسین ایک جہاں دیدہ آدمی تھا۔برسوں سے گلی گلی' محلے محلے پھیری لگا کر سبزی بیچتا تھا۔کتنے ہی گھرانوں سے اس کے روابط تھے اور اس کے روابط کا حلقہ بہت وسیع تھا۔اس حلقے میں بڑی تعداد ان گھریلو عورتوں کی شامل تھی جو جان پہچان کے پھیری لگانے والوں' ٹھیلے والوں اور آس پاس کے دکانداروں سے دنیا جہاں کے مسئلوں مسائل پر بڑی روانی اور بے باکی سے گفتگو کرتی تھیں اور طرح طرح کی معلومات کا تبادلہ کرتی تھیں۔شوکت حسین ایسے کتنے ہی واقعات سے واقف تھا کہ مرضی کے خلاف شادی کر دیئے جانے کی صورت میں بعض اوقات کیسے کیسے خطرناک اور رسوا کن حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔وہ اپنی بیٹیوں کی شادی کے سلسلے میں بہت حساس تھا اور ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اچھا ہوتا فخرن خالہ کہ تم اس معاملے میں فیضو کی مرضی بھی معلوم کر لیتیں۔''شوکت حسین نے کہا۔

''اے لو بھلا' فیضو کی مرضی کی بھی ایک ہی کہی تم نے.....اے بھیا ہم نے یہ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کیے ہیں۔ہم تو آدمی کی نظر پہچانتے ہیں۔اے ہم نے اللہ بخشے امدو اور افسری کی نظریں بھی دیکھی ہیں۔برسوں تک دیکھتے رہے اور ہم نے ان دونوں بچوں کی نظریں بھی دیکھی ہیں۔''

''پھر بھی فخرن خالہ۔''شوکت حسین نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔''تم یہ بات فیضو کے کان میں ڈال دو.....کم از کم یہ تو معلوم کر لو کہ اس کے دل میں کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے شوکت حسین۔''دادی نے کہا۔''ہم اس سے پوچھ لیں گے۔اس میں کیا مشکل ہے۔ارے ہم تو دل سے چاہتے ہیں کہ شاکرہ ہماری بہو بن کر آجائے.....اے اپنے گھر کی بچی ہے کچھ چھان بین کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہم بھی شاکرہ کو بتا دیں گے۔''شوکت حسین نے کہا۔''اس کو یہ بات ابھی سے معلوم ہو جانا چاہئے کہ اس کے لیے آگے کیا ہونے والا ہے؟''

شوکت حسین اور شمسن کچھ دیر کے بعد چلے گئے۔ وہ دونوں بہت ہی زیادہ خوش اور مطمئن تھے۔ سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوا تھا' انہیں پورا یقین تھا کہ انہوں نے شاکرہ کے مستقبل کو محفوظ کرلیا ہے۔

شمسن نے خود ہی شاکرہ سے بات کی۔ شوکت حسین نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے کس طرح بات کرنی ہے۔

''فخرن خالہ تمہارے لیے فیضو کا رشتہ دینا چاہتی ہیں۔'' شمسن نے شاکرہ سے کہا۔ ''تمہارے ابا کا کہنا ہے کہ کوئی زبردستی والی بات نہیں ہے۔ اگر تم اس رشتے سے راضی ہو تو پھر بات آگے چلائی جائے گی۔''

شاکرہ کا دل اس قدر تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے وہ پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس کا جسم پسینے میں بھیگنے لگا۔ اماں جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ اس کے لیے اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ اس بات سے ناواقف ہو کہ فیضو کے حوالے سے اس کے والدین کے کیا محسوسات ہیں اور خود اس کے اپنے محسوسات بھی اپنے والدین کے محسوسات سے جدا نہیں تھے۔ وہ تو فیضو کو دل و جان سے پسند کرتی تھی۔ اس کی اب تک کی زندگی میں اگر کوئی لڑکا چپکے سے اپنی جگہ بنا کر داخل ہونے میں کامیاب ہو سکا تھا تو وہ صرف فیضو تھا' لیکن شاکرہ نے اپنے جذبات کو بڑی احتیاط سے سنبھال کر اپنے دل کے اندر ہی پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ اسے نہ تو ان کے اظہار کا کوئی طریقہ معلوم تھا اور نہ ہی وہ اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ فیضو اس کو بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کو خوش دیکھنا چاہتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بھی فیضو کو اچھی لگتی ہے..... تو بس یہ کافی تھا۔ اس سے آگے کا جو راستہ تھا' وہ شاکرہ کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے بعد کون سی منزل آتی ہے اور پھر کیا کیا جانا چاہئے۔

لیکن اماں کے ایک جملے نے جیسے اس پر زندگی کے سارے راز کھول دیئے اور آن کی آن میں اس پر وہ سب کچھ منکشف ہوگیا جو دل اور روح کے نہ جانے کون کون سے گمنام گوشوں میں سویا پڑا تھا..... اس پر یکبارگی یہ انکشاف ہوا کہ وہ فیضو سے محبت کرتی ہے..... اور اب سے نہیں' نہ جانے کب سے کرتی ہے..... شاید اس دن سے جس دن سے اس نے فیضو کو پہلی بار دیکھا تھا..... اور یہ کہ فیضو کو بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

اس کی زبان گنگ ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بولنا ہی بھول گئی ہو۔ اس کی شادی کی بات۔ مگر ابھی تو وہ صرف ساتویں میں تھی۔

''بولو بیٹا بولو۔'' اماں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ دل میں ہے وہ کہہ ڈالو..... ہم اپنی طرف سے تو تمہارا بھلا ہی چاہتے ہیں۔''

''جیسی تم لوگوں کی مرضی اماں۔'' شاکرہ نے گردن جھکا کر کہا۔ اس کا چہرہ بالکل سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آواز بہت مدھم تھی۔ شمسن کا چہرہ ایک دم سے کھل اٹھا۔

☆======☆======☆

اس رات جب فیضو گھر آیا تو کھانا وغیرہ کھانے کے بعد دادی نے اس کے پاس بیٹھ کر آہستہ سے کہا۔ ''تمہارے ابا اور اماں تو ساری زندگی ایک دوسرے سے اس طرح لڑتے رہے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں اور دونوں کی لڑائی نے اس گھر کو تیرہ تین کردیا' مگر ہم یہ چاہتے ہیں بیٹا کہ جو کچھ ان لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا' خدا نہ کرے کہ تم اور تمہاری بیوی بھی ایک دوسرے کے ساتھ وہی کریں۔''

''میری بیوی؟'' فیضو نے چونک کر کہا۔

''اے ہاں تمہاری بیوی۔'' دادی نے کہا۔ ''ابھی نہیں ہے تو کل ہوگی تو..... ہم تمہاری شادی کسی ایسی لڑکی سے کرنا چاہتے ہیں جسے تم اچھی طرح جانتے ہو اور جو خود بھی تمہیں اچھی طرح جانتی ہو.....''

''جب اس کا وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا دادی.....'' فیضو نے دادی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ فوری طور پر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ دادی نے یہ کیا بے وقت کی راگنی شروع کردی ہے۔

''بہت ساری باتیں وقت سے پہلے ہی سوچ لی جاتی ہیں بیٹے۔'' دادی نے کہا۔ ''اور یہ اس لیے اچھا ہوتا ہے کہ آدمی وقت پر سوچنے اور فیصلہ کرنے کی تکلیف سے بچ جاتا ہے۔ سنو..... سیدھی سی بات ہے کہ ہم تمہاری شادی شاکرہ سے طے کررہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شادی ابھی تو نہیں ہورہی ہے' وہ تو وقت آنے پر ہی ہوگی' مگر ہم ابھی سے بات پکی کردینا چاہتے ہیں۔''

فیضو کے لیے اصل بات کی تہہ تک پہنچنا بالکل مشکل نہیں تھا۔ وہ بہت ذہین اور ہوشیار لڑکا تھا اور معاملات کو سمجھنے کی گہری صلاحیت سے مالا مال تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شوکت چچا اور شمسن چچی اس کے اور دادی کے حال پر اتنی زیادہ غیر معمولی عنایتیں کررہے ہیں تو اس کے پیچھے اگر ان کا اپنا بھی کوئی مقصد پوشیدہ ہو تو اس میں تعجب یا اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دادی کے دماغ میں تو ابھی تک اس کی شادی کا کوئی خیال آیا تھا اور نہ آسکتا تھا۔ یہ سب

کچھ تو ابھی بہت قبل از وقت تھا لیکن اگر دادی نے آج اچانک یہ بات نکالی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ سلسلہ شوکت چچا اور شمسن چچی کی طرف سے شروع ہوا تھا..... اور اگر ایسا تھا تو یہ ایک خوشگوار سلسلہ تھا فیضو کو اس سے خوشی حاصل ہوئی۔

''کمال کرتی ہو دادی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بھلا ابھی اس کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی میں انٹر کروں گا پھر بی ایس سی کروں گا' پھر ایم ایس سی کروں گا۔ اس کے بعد ہی مجھے کوئی اچھی نوکری مل سکے گی اور نوکری ملنے کے بعد ہی میں شادی کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔''

''اے تو ہم کون سا کہہ رہے ہیں کہ تم ابھی شادی کرلو۔'' دادی نے پُرمسرت نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اے ابھی تو ماشاءاللہ شاکرہ بھی پڑھ رہی ہے اور اس کے ماں باپ بھی اسے بہت آگے تک پڑھانا چاہتے ہیں۔ شادی کوئی کل تھوڑی ہوئی جارہی ہے۔ بس یہ ہے کہ ابھی بات چیت طے ہوجائے تاکہ کل پھر سوچنا نہ پڑے۔''

''سمجھ دیکھو دادی۔'' فیضو نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ''میں اگر تمہاری بات مان لوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ کل تم ڈنڈا لے کر میرے سر پر سوار ہوجاؤ کہ کر شادی..... میں ابھی کئی سال تک شادی کے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔ مجھے ایم ایس سی کرنا ہے۔ اس میں پانچ سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ لگے گا۔''

''اے تو پانچ سال میں تم کون سے بڈھے ہوئے جارہے ہو یا شاکرہ بڑھیا ہوئی جارہی ہے۔'' دادی نے کہا۔ ''شاکرہ کے والدین بھی تو اس کو پڑھا رہے ہیں۔ ہاں' بس یہ ہے بھیا کہ ہماری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔'' دادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''پانچ سال کس نے دیکھے ہیں..... خیر..... چلو' ہم اگر زندہ نہ بھی رہے تو بھی تم لوگ خوش رہو گے۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتی ہو دادی؟'' فیضو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارے تم تو ابھی کم سے کم پچاس سال تک اور جیو گی۔''

''اے دُر۔'' دادی نے ہنس کر ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔ ''اے ہم کیوں جینے لگے پچاس سال تک؟ کیا ہم عاقبت کے بوریئے بٹوریں گے؟''

''ان لوگوں کو سمجھا دینا دادی۔'' فیضو اچانک سنجیدہ ہوگیا اور اس کی آواز ہلکی ہوگئی۔ ''کم از کم پانچ سال تک شادی کا نام نہ لیں۔''

''انہیں کوئی جلدی نہیں ہے۔'' دادی نے کہا۔ ''بس ہم سب تو یہ چاہتے ہیں کہ بات

پکی ہوجائے۔''

''تو پھر بس پکی ہی سمجھو.....'' فیضو نے کہا اور دادی کے بوڑھے چہرے پر بہار کے نہ جانے کتنے رنگ ایک ساتھ کھل اٹھے۔

دادی نے شوکت حسین اور شمسن کو اور شوکت حسین اور شمسن نے دادی کو یہ زندگی آمیز خوشخبری سنادی کہ فیضو اور شاکرہ شادی کے لیے راضی ہیں اور دونوں گھرانوں میں خوشی کی ایک تازہ لہر دوڑ گئی۔

لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جس نے اس رشتے کے طے ہوجانے پر کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا اور وہ تھی شاکرہ کی چھوٹی بہن مسعودہ۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے اماں؟'' مسعودہ نے اپنی ماں سے کہا۔ ''آپا کو تعلیم تو پوری کر لینے دو..... انہیں فیضو سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔''

''مگر فیضو میں کیا برائی ہے؟'' شمسن نے قدرے ناگواری کے ساتھ کہا۔ ''انٹر میں پڑھ رہا ہے۔ آگے بھی پڑھائی کرے گا۔ اچھی نوکری کرے گا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ شاکرہ کو ساس نندوں کا اور جٹھانیوں اور دیورانیوں کا کوئی بھگتان نہیں بھگتنا پڑے گا۔ دونوں میاں بیوی مزے سے رہیں گے۔ لے دے کے ایک بڑی بی ہیں بے چاری..... اے خدا ان کو زندگی دے' وہ کب تک جیتی رہیں گی؟ اور پھر وہ شاکرہ کے لیے کوئی مشکل تھوڑی پیدا کریں گی۔''

''اماں' ذرا یہ بھی تو سوچو..... فیضو کا باپ نکما' ناکارہ' نکھٹو اور چور تھا۔'' مسعودہ نے کہا۔ ''اس کی ماں ایک آوارہ بدچلن عورت تھی۔ آپا لوگوں کو اپنے ساس سسر کے بارے میں کیا بتائیں گی؟''

شمسن کے چہرے پر ہلکی سی سیاہی دوڑ گئی۔ ''ماں باپ کے کرتوتوں کی سزا اولاد کو کیوں ملے؟'' شمسن نے مدافعانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک فیضو کے باپ کا تعلق ہے' تو وہ مرن جوگا اب تو اس دنیا میں ہی نہیں رہا۔ اس کا کیا ذکر؟ بس سمجھ لو کہ ماں باپ دونوں ہی مرگئے کسی کے سامنے بکھان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''پھر بھی اماں' خاندان کا صاف ستھرا ہونا تو ضروری ہے۔ آدمی کی نظر دوسروں کے سامنے جھکی ہوئی تو نہیں ہونی چاہیے۔''

''فیضو مرد بچہ ہے بیٹی.....'' شمسن نے کہا۔ ''اگر وہ لڑکی ہوتا تو بات الگ ہوتی۔ تب شاید ہم بھی اسے اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہ ہوتے مگر مرد کے لیے ان باتوں سے کوئی فرق

نہیں پڑتا۔"

مسعودہ نے مزید کوئی بات تو نہیں کی، لیکن رشتے پر کسی خوشی کا اظہار بھی نہیں کیا۔

رشتے کی بات طے ہو جانے کے بعد، جب فیضو اور شاکرہ کی پہلی ملاقات ہوئی تو شاکرہ کی دنیا میں تو جیسے ایک انقلاب عظیم ہی آ چکا تھا اور فیضو کی آنکھوں میں بھی ایک انوکھی چمک پیدا ہو چکی تھی، جو اس کے دل میں جنم لینے والے بہت سے نامعلوم جذبوں کی عکاسی کرتی تھی۔

تنہائی میں ہونے والی اس پہلی ملاقات کے دوران شاکرہ کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ بچپن سے فیضو کے ساتھ کھیلتی، ملتی جلتی اور اٹھتی بیٹھتی چلی آئی تھی اور یہ سب کچھ اس قدر عام، بے ساختہ اور معمول کے مطابق تھا کہ اس کے بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، لیکن آنِ واحد میں سب کچھ جیسے بدل گیا تھا، فیضو بدل گیا تھا، فضائیں بدل گئی تھیں۔

فیضو نے مسکرا کر شاکرہ کی طرف دیکھا اور شاکرہ کے دل میں ہزاروں ستارے روشن ہو گئے جنہوں نے اس کے سارے وجود کو منور کر دیا۔

"تمہیں شمسن چچی نے کچھ بتایا؟" فیضو نے سرگوشی میں شاکرہ سے پوچھا۔

ہزاروں دفعہ کی سنی ہوئی فیضو کی آواز آج شاکرہ کو ایک بالکل ہی بدلی ہوئی آواز لگ رہی تھی اور یہ آواز جو انتہائی مہربان ہونے کے باوجود اجنبی معلوم ہو رہی تھی، اس سے جو سوال پوچھ رہی تھی، اس کے جواب میں شاکرہ کو اپنا سارا وجود پگھلتا ہوا لگ رہا تھا اور وہ اپنے اس پگھلتے ہوئے وجود کو سارے کا سارا فیضو کے قدموں میں انڈیل دینا چاہتی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب شاکرہ کا مٹ جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اور فنا کی یہ وہ منزل تھی جس میں بقا کے ہزار ہا راز پوشیدہ تھے۔

"ہاں۔" اس کی زبان سے ایک عالمِ سرشاری میں نکلا۔ یہ سرشاری کا عالم بھی تھا اور خود فراموشی کا بھی..... سب کچھ جیسے ختم ہو گیا تھا..... بس ایک وجود باقی تھا۔ فیضو کا وجود، جس میں وہ ضم ہوئی جا رہی تھی، وہ صرف ایک لفظ بول کر خاموش ہو گئی اور نظریں جھکا کر زمین کو دیکھنے لگی۔

"اچھا تو اب میری بات بھی سن لو۔" فیضو نے قدرے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "مجھے ایم ایس سی کرنے میں ابھی پانچ سال سے کچھ زیادہ عرصہ لگے گا..... تمہیں تب تک انتظار کرنا ہو گا۔"

"معلوم ہے۔" شاکرہ نے ایک ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم خود بھی تو ابھی

پڑھ رہے ہیں۔"

"ہاں..... پڑھو..... خوب پڑھو....." فیضو نے کہا۔ "ہم اگر کچھ حاصل کر سکتے ہیں تو صرف پڑھائی کے ذریعے..... کیونکہ ہمارے گھر والے تو فقیروں سے کچھ تھوڑے سے ہی بہتر ہیں۔"

"ایسا کیوں کہتے ہو؟" شاکرہ کو فیضو کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ "بھلا ہم لوگ کیوں فقیر ہونے لگے؟ ہمارے پاس اللہ کا دیا اتنا کچھ تو ہے..... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنا گھر ہے۔"

"جو کچھ ہے، وہ صفر سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔" فیضو نے کہا۔ "اور اس کو ابھی آگے تک، بہت آگے تک لے جانا ہے۔"

اسی وقت مسعودہ شاکرہ کو تلاش کرتی ہوئی وہاں آن پہنچی اور ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ختم ہو گئی۔

شدید جذباتی ہیجان اور غیر متوقع اور بے پایاں انبساط و نشاط کی یہ کیفیت کچھ دن تو جاری رہی، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس میں اعتدال پیدا ہوتا گیا۔ ان دونوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ آگے چل کر ان کی شادی ہونے والی ہے۔ چنانچہ اب کوئی تجسس باقی نہیں رہا تھا اور نہ ہی کوئی جذباتی کشمکش موجود تھی۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ اس میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ چنانچہ فیضو اور شاکرہ کے درمیان جلد ہی تعلقات پہلے کی طرح معمول کی سطح پر واپس آ گئے۔

اس کے بعد ایک نئی پیش رفت یہ ہوئی کہ فیضو اور اس کی دادی پر شوکت حسین اور شمسن چچی کی مہربانیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ نہایت محدود آمدنی اور لگے بندھے کم تر وسائل کا حامل ہونے کے باوجود وہ لوگ اپنے مقدور بھر فیضو اور اس کی دادی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہتے تھے۔

اس روز شام کو شمسن چچی ان لوگوں کے گھر آئیں تو ان کے ہاتھ میں کپڑے جیسی کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ فیضو سامنے ہی موجود تھا۔

"لو بھئی فیضو..... ہم نے تمہارے لیے یہ کُرتا پاجامہ سیا ہے۔" شمسن چچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے چچا بچوں کے لیے کپڑا لائے تھے تو تمہارے لیے بھی لیتے آئے۔ ہم نے سی کر جوڑا تیار کر دیا۔"

"ابھی تو تمہارا دیا ہوا کُرتا پاجامہ بھی کہیں سے نہیں پھٹا ہے شمسن چچی۔" فیضو نے

مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور تم نے دوسرا بھی تیار کر دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ شمسن چچی کہ اب میں کُرتا پاجامہ کم ہی پہنتا ہوں۔ بس گھر میں ہی پہنتا ہوں' کالج میں تو میں پتلون قمیص پہن کر جاتا ہوں۔ جب تک اسکول میں تھا' تب تک تو کُرتا پاجامہ ہی ٹھیک تھا' مگر کالج میں تو تقریباً سبھی ہی لڑکے پتلون قمیص پہن کر آتے ہیں۔''

اگلے مہینے شمسن نے سفید زین کی ایک پتلون سلوا کر فیضو کو دی۔ ناپ کے لیے وہ فیضو کی ایک پتلون اس کے گھر سے لے گئی تھی۔ محلے کے درزی نے اسی وقت ناپ لے کر پتلون واپس کر دی تھی۔

لین دین کا یہ سلسلہ تقریباً یک طرفہ تھا۔ شوکت حسین اور شمسن فیضو کو کپڑے اور دوسری چیزیں دیتے رہتے تھے' لیکن فیضو کی طرف سے کوئی ٹھوس جوابی کارروائی عمل میں نہیں آئی تھی۔ دادی نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ شاکرہ اور اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے کوئی چیز لے آئے اور انہیں دے دے' لیکن فیضو ہر بار یہ کہہ کر ٹال گیا کہ ابھی اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔

فیضو نے انٹر سائنس کا امتحان دیا اور غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اس کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی اور کیمسٹری میں اس کو امتیازی نمبر ملے تھے۔ ویسے تو فیضو کو سائنس کے تمام مضامین سے ہی گہری دلچسپی تھی' لیکن کیمسٹری وہ مضمون تھا جس سے اس کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔

☆======☆======☆

سعود آباد کی شکل وصورت بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہی تھی۔ گزشتہ برسوں کے دوران یہاں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ کوارٹر آباد ہوتے چلے جا رہے تھے اور یہاں آنے والے زیادہ تر خاندان وہ تھے جن میں پڑھنے والے بچے موجود تھے۔ سارے کے سارے اردو بولنے والے خاندان تھے اور بالکل اَن پڑھ خاندانوں میں بھی بچوں کو پڑھانے کا رجحان تیزی سے فروغ پا رہا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے سرکاری اسکولوں کے علاوہ بعض چھوٹے موٹے پرائیویٹ اسکول بھی کھل گئے تھے۔ علاوہ ازیں اسکول جانے والے بچوں کو ایسے مقامی اساتذہ کی بھی تلاش تھی جو بچوں کو ٹیوشن دے کر ان کی مدد کر سکیں۔

فیضو کے لیے اب گجر نالے جا کر چھوٹے بچوں کو پڑھانا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اب ماسٹر راشد زبیری کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی' کیونکہ وہ اب اس کو کوئی فیض نہیں پہنچا سکتے تھے۔ فیضو نے اب ماسٹر راشد زبیری کے گھر جا کر بچوں کو پڑھانا ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے

سعود آباد میں ہی یہ کام مل رہا تھا اور بڑی کلاسوں کے بچے بھی اس سے پڑھنا چاہتے تھے۔

ماسٹر راشد زبیری نے فیضو کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن فیضو نہیں رکا۔ وہ ماسٹر راشد زبیری سے وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا جو حاصل کر سکتا تھا۔ ماسٹر راشد زبیری کو اپنے بڑھاپے اور تنہائی کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ فیضو کی وجہ سے ان کو بہت سہارا تھا' لیکن فیضو کے جانے کے بعد یہ سہارا ختم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

فیضو نے سعود آباد میں اپنے گھر میں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور ایک چھوٹا سا ٹیوشن سنٹر قائم کر لیا۔ وہ خاص طور سے حساب اور سائنس کے مضامین بہت عمدگی کے ساتھ پڑھاتا تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس کے پاس آٹھویں اور نویں کلاس تک کے طلبا پڑھنے کے لیے آنے لگے اور اس کا کام تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ بڑی کلاس کے لڑکوں سے فیس بھی زیادہ مل رہی تھی اور فیضو کی آمدنی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

شوکت حسین اور شمسن چچی نے فیضو کا کام جمانے میں اس کی بہت مدد کی۔ شوکت حسین نے اپنے خرچ پر کچھ فرنیچر وغیرہ فراہم کیا اور فیضو نے یہ وعدہ کیا کہ جب کام چل نکلے گا تو وہ جلد ہی یہ رقم واپس کر دے گا۔ علاوہ ازیں ان لوگوں نے کئی خاندانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنے بچوں کو فیضو کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے فیضو کے پاس کافی طالب علم آنے لگے اور اس کی آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا۔

شوکت حسین اور شمسن بہت خوش تھے کہ ان کا ہونے والا داماد بہت تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب وہ فارغ التحصیل ہو کر بڑا آدمی بن جائے گا۔

فیضو نے انٹر سائنس کا امتحان بھی نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کیا اور وہ بی ایس سی میں آ گیا۔ اس کے شاگردوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ اب وہ کافی رات تک مصروف رہتا تھا اور لڑکوں کو پڑھاتا رہتا تھا۔

اس روز رات کو جب فیضو اپنا کام ختم کر کے بیٹھا ہی تھا کہ شوکت چچا آ گئے۔

''ایک بری خبر ہے فیضو۔'' شوکت چچا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ فیضو ایک دم چونک پڑا' وہ کوئی بری خبر سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے گجر نالہ سے رفیق میرے پاس آیا تھا۔ تم تو اس وقت پڑھانے میں مصروف تھے اس لیے میں نے اسے تمہارے پاس آنے سے روک دیا۔ وہ یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ ماسٹر راشد زبیری کا شام کو انتقال ہو گیا اور ان کی تدفین کل صبح دس بجے کے قریب ہو گی۔''

''اے ہے۔'' دادی نے سخت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اے اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بہت اچھے آدمی تھے۔ ہمارے اوپر تو ان کے کس قدر احسان ہیں۔ فیضو کو بغیر فیس کے پڑھاتے رہے۔''

''ہاں فخرن خالہ۔'' شوکت چچا نے آہستہ سے کہا۔ پھر وہ فیضو سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''ہم صبح سویرے ہی نکل جائیں گے۔ تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا' تدفین میں شرکت کرنا تو ضروری ہے۔''

''میں..... میں..... تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا شوکت چچا۔'' فیضو نے رک رک کر کہا۔ ''میں تو پہلے کالج جاؤں گا۔ صبح کا پیریڈ ضروری ہے۔ میں کالج سے ہی وہاں آجاؤں گا۔ دس بجے سے پہلے ہی پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' شوکت چچا نے کہا۔ ''لیکن ضرور آجانا..... تمہارے تو وہ استاد تھے اور تم سے بہت پیار کرتے تھے۔''

''ہاں بیٹا۔'' دادی نے کہا۔ ''جانا ضرور ان کی روح خوش ہو جائے گی۔''

لیکن فیضو نے اپنے محسن استاد کی روح کو خوش کرنے میں کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ گھر سے کالج گیا اور پھر اس نے سارا دن کالج میں ہی گزارا۔ دوپہر کے بعد تک وہ کالج میں ہی رہا' سہ پہر کو وہ گھر واپس آگیا۔

شوکت حسین ماسٹر راشد زبیری کی تدفین میں شریک تھا۔ وہ وقت سے کافی پہلے ہی پہنچ گیا تھا اور بے چینی سے فیضو کا انتظار کرتا رہا تھا' لیکن فیضو کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ فیضو نہیں آیا اور ماسٹر راشد زبیری کو دفن کر دیا گیا۔

گھر واپس پہنچنے کے بعد اس نے دادی کے استفسار پر ان کو یہ بتایا کہ کالج میں ''ڈبل کلاس'' کی وجہ سے اسے وہاں سے نکلنے کا موقع نہیں مل سکا اور یہی بات اس نے شام کو شوکت چچا کو بھی بتائی جنہیں اس بات کا دکھ ہوا تھا کہ فیضو نے اپنے استاد کے جنازے میں شرکت نہیں کی۔ تاہم فیضو نے ان کو اپنی اچانک مصروفیات کا یقین دلا کر کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا۔

بی ایس سی کے دو سال بھی اسی شان سے گزر گئے کہ فیضو اب ٹیوشنز سے اتنے پیسے کما رہا تھا کہ اگر وہ کہیں نوکری بھی کر رہا ہوتا تو اسے اس سے زیادہ تنخواہ نہ ملتی۔ آمدنی بڑھی تو گھر کی حالت بھی کچھ ٹھیک ہوئی تھی اور فیضو کی اپنی حالت بھی بہتر ہوئی تھی۔ بی ایس سی کا امتحان فیضو نے بہت امتیازی کامیابی کے ساتھ پاس کیا اور بغیر کوئی وقت ضائع کیے کراچی یونیورسٹی

میں ایم ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ اسے بہت آسانی سے داخلہ مل گیا کہ اس کے نمبر بہت ہی اچھے تھے۔

کالج کی پڑھائی ختم ہو گئی تھی اور اب فیضو کراچی یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ زندگی کے تیور بدل رہے تھے اور ساتھ ہی فیضو کے تیور بھی بدل رہے تھے۔

کچھ عرصہ پہلے تک تو وہ کم فیس دینے والے لڑکوں کو بھی پڑھا دیا کرتا تھا' لیکن اب اس نے اپنی فیس میں اضافہ کر دیا تھا اور اس معاملے میں وہ کسی سے رعایت نہیں کرتا تھا۔

زندگی کی شاہراہ پر فیضو کی کامیابیاں شوکت حسین اور شمسن کے لیے گہری طمانیت اور سکون قلب کا باعث تھیں۔ فیضو کی ہر تازہ کامیابی میں انہیں اپنی بیٹی کی تقدیر مسکراتی ہوئی نظر آتی تھی اور وہ شاکرہ بھی بڑے صبر کے ساتھ اس وقت کا انتظار کر رہی تھی' جب فیضو زندگی بھر کے لیے اسے اپنا ساتھی بنا لے گا۔ فیضو نے ایم ایس سی کا امتحان دے دیا تھا اور وہ نتیجے کے انتظار میں تھا لیکن وہ نتیجے کے انتظار میں خالی نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے امتحان سے فارغ ہوتے ہی نوکری کی تلاش شروع کر دی تھی اور مختلف جگہوں پر درخواستیں بھیجی تھیں۔

ایم ایس سی سال اول میں اس کے نمبر فرسٹ ڈویژن کے تھے اور سال دوم میں بھی اسے اتنے ہی کی' بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی کی توقع تھی۔

فیضو کو ایک بڑی دواساز کمپنی کی جانب سے انٹرویو لیٹر ملا اور وہ فوراً ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس کا سارا تعلیمی ریکارڈ غیر معمولی طور پر شاندار تھا۔ کمپنی کو ایک ایسے نوجوان' ذہین اور کوالیفائیڈ کیمسٹ کی ضرورت تھی جو ضروری تربیت کے بعد کمپنی کے کوالٹی کنٹرول سیکشن میں کام کر سکے۔

کمپنی کے مالک کا نام منصور علی تھا اور وہ خود بھی ایک ٹیکنیکل آدمی تھا۔ اگرچہ وہ پرانے زمانے کا صرف بی ایس سی تھا لیکن دواسازی کے میدان میں وہ طویل تجربے کا مالک تھا۔ اسے سعود آباد میں رہنے والا یہ غریب لیکن بہت ذہین اور بہترین تعلیمی ریکارڈ کا حامل نوجوان بہت پسند آیا جس کے تیوروں میں خود اعتمادی اور حوصلے کی جھلک صاف طور پر محسوس ہوتی تھی۔

''تمہارے تعلیمی ریکارڈ کی روشنی میں ہم تمہارا تین ماہ کے لیے عارضی بنیاد پر تقرر کرتے ہیں۔'' منصور علی نے کہا۔ ''اس دوران تمہیں ٹریننگ بھی دی جائے گی اور تمہارا رزلٹ بھی آجائے گا۔ اگر سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا تو پھر تمہارا باقاعدہ اپائنٹ منٹ ہو جائے

گا۔"

فیضو کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ نوکری کے بارے میں بجا طور پر اس کا تصور یہی تھا کہ وہ رشوت' تعلقات یا سفارش کے بغیر نہیں ملتی' لیکن اس کے ساتھ تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے تو صرف پہلی ہی کوشش میں نوکری مل گئی تھی۔ وہ اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ یہ کوئی عام کلرکوں والی نوکری نہیں تھی۔ یہ ٹیکنیکل نوکری تھی اور ابھی ایسا کام کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ انہیں کہیں نہ کہیں اپنے مطلب کی نوکری مل ہی جاتی تھی۔ اس کی قسمت نے یاوری کی اور اسے فوراً ہی نوکری مل گئی۔

دادی کی طرف سے محلے میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ مٹھائی بظاہر تو دادی کی طرف سے تقسیم کی گئی تھی لیکن فی الحقیقت اس کی قیمت شوکت حسین نے ادا کی تھی۔ شوکت حسین اور شمسن کو اب شاکرہ کا مستقبل پوری طرح سے محفوظ نظر آ رہا تھا۔

"نوکری تو تمہاری ہو گئی بھیا!" دادی نے فیضو سے کہا۔ "اور اب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تین مہینے کے بعد پکی بھی ہو جائے گی۔ تو اب شوکت حسین اور شمسن سے پوچھتے ہیں کہ ان کا کب تک خیال ہے۔"

"نہیں دادی' بالکل نہیں۔" فیضو نے سختی کے ساتھ منع کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ایسی کوئی بات نہیں کرنا۔ ابھی تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمیں ابھی وقت چاہئے۔"

☆======☆======☆

دادی خاموش ہو گئیں۔ اگرچہ انہیں فیضو کی بات سے بالکل اتفاق نہیں تھا' لیکن وہ اس پر زور نہیں دینا چاہتی تھیں۔

فیضو نے کام کرنا شروع کر دیا اور وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ کام سیکھنے لگا۔ فیکٹری کا مالک..... منصور علی اس کے بارے میں کرامت اللہ سے تقریباً روز ہی رپورٹ لیتا رہتا تھا۔

کرامت اللہ کوالٹی کنٹرول ڈیپارٹمنٹ کا چیف تھا۔ وہ بہت لائق آدمی تھا اور اپنے کام میں پوری طرح مہارت رکھتا تھا لیکن وہ عمر رسیدہ تھا اور اس کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ منصور علی جلد از جلد اس کو فارغ کر دینا چاہتا تھا' کیونکہ کرامت اللہ میں اب وہ پہلے جیسی چستی نہیں رہی تھی' لیکن وہ کرامت اللہ کو فوری طور پر اس لیے فارغ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا کوئی کوالیفائیڈ متبادل موجود نہیں تھا۔ منصور علی کو اپنے مطلب کے آدمی کی تلاش تھی اور وہ اب اس کو مل گیا تھا۔ چنانچہ وہ چاہتا تھا کہ کرامت اللہ جلد از جلد اس نئے اور ہوشیار لڑکے کو

کام کے لیے اچھی طرح تیار کر دے تاکہ اس کے بعد وہ کرامت اللہ کو طبی بنیادوں پر ریٹائر کر کے اس سے جلد از جلد جان چھڑا لے۔ اس طرح وہ کافی رقم بھی بچا سکتا تھا جو بھاری تنخواہ کی صورت میں کرامت اللہ کو دی جاتی تھی۔

تین ماہ کا عرصہ ایسے گزر گیا جیسے ایک پل۔ فیضو کا رزلٹ آ گیا اور اس نے فرسٹ ڈویژن اور دوسری پوزیشن کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

چھ ماہ کے اندر اندر حالات میں ایسی زبردست تبدیلیاں نمودار ہو گئیں کہ فیضو کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ واقعی حقیقت ہے یا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے اور ابھی ذرا دیر میں آنکھ کھل جائے گی اور سارا منظر بھک سے اُڑ جائے گا۔

فیضو کی نوکری پکی ہو چکی تھی۔ اس کی تربیت وقت سے کافی پہلے ہی مکمل ہو گئی اور وہ اسسٹنٹ کوالٹی کنٹرول آفیسر مقرر ہو گیا۔ تنخواہ اتنی تھی کہ فیضو نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی کمائی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اماں نوکری کرتی تھیں اور معمولی سی تنخواہ پاتی تھیں۔ ابا تو صرف ڈنڈے بجایا کرتے تھے۔ دادی آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر سلائی کرتی تھیں تو اتنے پیسے ملتے تھے کہ بڑی مشکل سے روٹی کے لیے کافی ہو سکتے تھے..... اور وہ خود اس وقت سے ٹیوشن پڑھاتا چلا آ رہا تھا جب وہ نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ مگر یہ ساری کمائیاں مل کر بھی اس کی موجودہ تنخواہ کے آگے کس قدر حقیر اور بے مایہ تھیں۔ بھلا ان کی بھی کوئی اوقات تھی۔

منصور علی کی فیکٹری لانڈھی میں کئی ایکڑ رقبے پر واقع تھی۔ اس وسیع احاطے میں فیکٹری کی عمارت کے علاوہ منصور علی کی رہائش گاہ بھی تھی' جس میں وہ اپنے بیوی بچوں سمیت رہتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور مکانات بھی تھے جن میں فیکٹری کے بعض سینئر افسران رہتے تھے انہیں رہائش کی یہ سہولت فیکٹری کی انتظامیہ کی جانب سے فراہم کی گئی تھی۔ انہی میں سے ایک مکان میں کوالٹی کنٹرول آفیسر کرامت اللہ بھی رہتا تھا۔ فیضو نے اس بنگلے کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب اس کا رزلٹ آنے کے بعد کرامت اللہ نے اس کو ایک شام اپنے گھر چائے پر بلایا تھا۔

اس بنگلے کو اندر سے دیکھ کر فیضو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گجر نالے کی بستی سے نکل کر سعود آباد کے کوارٹر میں آ جانے والے اس نوجوان نے آج تک ایسے کسی بنگلے کو اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دنیا میں تو اس قسم کے مکانوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔ اس شاندار اور بے حد سجے ہوئے ڈرائنگ روم کے مقابلے میں جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا' اسے اپنا سعود آباد کا کوارٹر سڑک کے کنارے واقع کسی کوڑا گھر کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

''میں نے تم کو کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے یہاں بلایا ہے۔'' کرامت اللہ نے اس سے مخاطب ہو کر گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''میری باتیں دھیان سے سننا۔ میں اس وقت علم اور تجربے کے جس درجے پر فائز ہوں' وہاں تک پہنچنے کے لیے تمہیں ایک طویل عرصہ لگے گا۔ تم نوجوان ہو اور تم نے ابھی عملی زندگی میں قدم رکھا ہے۔ میں نے تمہارے کوائف دیکھے ہیں۔ تم ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ میری دو باتیں گرہ میں باندھ لو' جب نوکری کر رہے ہو تو ہمیشہ اپنے آپ کو نوکر ہی سمجھنا' مالک کا ہم پلہ بننے کی کوشش نہ کرنا اور دوسری بات یہ ہے کہ مالک کو کبھی ایمانداری کی نصیحت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ان دونوں ہی باتوں کا انجام برا ہوگا اور نکال کر باہر پھینک دیئے جاؤ گے۔ میں نے ملازمت کی اپنی طویل زندگی میں اپنے تجربے سے یہی سبق سیکھا ہے جو میں تم کو بھی سکھا دینا چاہتا ہوں کیونکہ اب میری جگہ پر تم آنے والے ہو۔''

''میں؟'' فیضو نے سخت حیرت اور بے یقینی کے عالم میں کہا۔ ''میں آنے والا ہوں؟ وہ کیسے سر؟''

''وہ اس طرح کہ مجھے میڈیکل گراؤنڈز پر ریٹائرمنٹ کا نوٹس مل چکا ہے۔ گو کہ میری عمر ابھی پچپن سال ہے اور میں مزید کئی سال تک کام کر سکتا ہوں لیکن میرے سینئر ہونے کی وجہ سے کمپنی کو مجھے زیادہ تنخواہ دینی پڑ رہی ہے جس میں کمی نہیں کی جا سکتی اور اگر مجھ سے بہت کم تنخواہ پر میرا جیسا کام کرنے والا کوئی صحت مند نوجوان مل جائے تو کمپنی کا اس میں فائدہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ کمپنی نے میری ملازمت ختم کر دی ہے اور میرے جانے کے بعد میری جگہ تم کو دے دی جائے گی' تنخواہ میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہو جائے گا۔''

فیضو حیرت سے کرامت اللہ کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اسے صاحب کے اس فیصلے کے بارے میں خود کچھ علم نہیں تھا۔

''پھر..... آپ کیا کریں گے سر؟'' فیضو کے ذہن میں فوری طور پر اس کے علاوہ اور کوئی سوال نہیں آیا۔

''اس کو چھوڑو کہ میں کیا کروں گا۔'' کرامت اللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس پر دھیان دو کہ تم کیا کرو گے۔ یاد رکھو..... جس پرائیویٹ ادارے میں بھی کام کرو' بہت محتاط رہ کر کام کرو۔ جیسا کچھ ہو رہا ہے ہونے دو..... ایسے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کرو جن کے بارے میں مالکوں کا ایک طے شدہ رویہ ہو۔ تمام مالکان اپنے مفادات کو خوب سمجھتے ہیں اور یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان مفادات کو کس طرح حاصل کیا جائے۔''

کرامت اللہ کی باتیں ٹھیک سے فیضو کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ نوکری کا یہ فیضو کا پہلا تجربہ تھا۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں کام کس طرح ہوتا ہے۔ ابھی تک تو اس شعبے کے سارے معاملات کرامت اللہ کے ہی ہاتھ میں تھے اور اسے صرف کرامت اللہ کی ہدایات پر عمل کرنا ہوتا تھا۔

اس کے کوئی ہفتہ بھر کے بعد جب کمپنی کے ایم ڈی منصور علی نے فیضو کو اپنے کمرے میں طلب کر کے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ اسے ترقی دے کر کرامت اللہ کی جگہ پر کوالٹی کنٹرول آفیسر مقرر کیا جا رہا ہے' کیونکہ کرامت اللہ کو میڈیکل گراؤنڈز ریٹائر ہو رہے ہیں' تو فیضو نے اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت شخص سمجھا۔ اس کی تنخواہ ڈیوڑھی کر دی گئی تھی۔ یہ اگرچہ کرامت اللہ کی تنخواہ کے مقابلے میں بہت کم تھی لیکن فیضو کے لیے ناقابلِ یقین حد تک زیادہ تھی۔ اتنی جلدی..... اتنی بڑی تنخواہ..... ایسی شاندار نوکری..... زندگی اس پر کس قدر مہربان ہو گئی تھی..... زمین و آسمان کے تمام رنگ بدل گئے تھے۔ فیضو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا میں منصور علی کے علاوہ اور کسی کا وجود ہی نہیں ہے جس نے اسے سونے میں تول دیا ہے۔

فیضو کی کرامت اللہ سے جو گفتگو ہوئی تھی' اس کے بارے میں اس نے دادی یا شاکرہ کے گھر والوں کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ کرامت اللہ نے جو کچھ کہا تھا اس پر عملدرآمد نہیں کیا گیا تھا اور فیضو وقت سے پہلے ان باتوں کو اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔

لیکن آج وہ فیکٹری سے گھر پہنچا تو وہ ایک ایسی زبردست خوشخبری کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا جسے وہ جلد از جلد اتار پھینکنا اور اپنے آپ کو ہلکا کر لینا چاہتا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو شمسن چچی گھر میں موجود تھیں۔ انہوں نے پائے پکائے تھے اور وہ فیضو کے گھر بھی لے کر آئی تھیں۔ فیضو کو دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں اور انہوں نے اسے بتایا کہ پائے شاکرہ نے اپنے ہاتھ سے پکائے ہیں۔

فیضو نے جب شمسن چچی کے موجودگی میں دادی کو اپنی غیر معمولی ترقی کے بارے میں خبر سنائی تو دادی کے بوڑھے چہرے کی بہت ساری جھریاں جیسے اچانک غائب ہو گئیں۔ ان کی بوڑھی اور میلی میلی آنکھوں میں ایک ایسی غیر معمولی چمک نمودار ہو گئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں ابھری تھی اور شمسن چچی وہ تو جیسے بے حال ہو گئیں۔

''اے سچ؟'' شمسن نے فیضو کی زبان سے اس کی اضافہ شدہ تنخواہ کے بارے میں سنتے ہوئے شدید حیرت اور بے یقینی کے عالم میں کہا۔ ''تو اب تم کو اتنے پیسے ملا کریں گے؟''

"ہاں شمسن چچی۔" فیضو نے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب اگلے مہینے سے میری تنخواہ یہی ہوگی۔"

"واہ میرے مولا تیری شان ....." شمسن چچی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "اے ہمارے تو نصیب جاگ اٹھے۔ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ماشاء اللہ اتنے بہت سارے پیسے۔"

☆======☆======☆

ایک ہفتے کے بعد ایم ڈی منصور علی نے اس کو ایک بار پھر اپنے کمرے میں طلب کیا۔ کرامت اللہ کی چھٹی ہو چکی تھی اور وہ اگلے ہفتے یہاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے والا تھا۔

"کرامت اللہ جا رہے ہیں اور ان کا مکان خالی ہو رہا ہے۔" منصور علی نے کہا۔ "یہ مکمل طور سے فرنشڈ مکان انہیں کمپنی کی طرف سے ملا ہوا تھا جس میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ اب ان کی جگہ سنبھالنے کے بعد اس مکان پر تمہارا حق بنتا ہے۔ تم لوگ اگر چاہو تو اپنا سعود آباد کا کوارٹر چھوڑ کر فیکٹری کے اس مکان میں منتقل ہو سکتے ہو۔"

فیضو کو ایک لمحے کے لیے یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"بہت بہت شکریہ سر۔" اس نے فوراً کہا۔ "میں تو خود ہی کچھ دنوں سے یہ سوچ رہا تھا کہ لانڈھی کے علاقے میں ہی کہیں رہائش کا بندوبست کر لوں' کیونکہ آنے جانے میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ آپ کی اس مہربانی کے لیے میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میرے پاس تو الفاظ نہیں ہیں سر....."

تمام وقت وہ خوبصورت سجا سجایا ڈرائنگ روم فیضو کے دماغ میں گھومتا رہا تھا۔ اُف..... گجر نالے کی کچی بستی سے اس بنگلے تک کا سفر کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے طے ہو گیا تھا۔

یہ دوسری خوشخبری دادی کے لیے اور شاکرہ کے گھر والوں کے لیے اور بھی زیادہ مسرت آمیز تھی۔ فیضو کو دفتر کی طرف سے فیکٹری کے احاطے میں ایک خوبصورت بنگلہ رہنے کے لیے مل رہا تھا۔

"اے بھیا پھر سامان سمیٹنا شروع کر دیں؟" دادی نے فیضو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت شوکت چچا' شمسن چچی' شاکرہ اور مسعودہ سب لوگ موجود تھے۔ مکان ملنے کی خبر سن کر سب لوگ آ گئے تھے۔

"نہیں دادی۔" فیضو نے کہا۔ "یہ سارا کاٹھ کباڑ ہم یہیں چھوڑ کے جائیں گے۔ اس اعلیٰ درجے کے بنگلے میں بھلا اس کی کیا گنجائش ہے؟ وہاں تو سارا فرنیچر پہلے ہی سے موجود ہے۔"

"اے ہوش کی دوا لو لڑکے۔" دادی نے فیضو کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "گھر کے سامان کو کاٹھ کباڑ کہہ رہا ہے؟ ارے بیٹا زندگی گزر جاتی ہے تب کہیں جا کر ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر گرہستی تیار ہوتی ہے۔"

لیکن چند روز بعد جب دادی اور شوکت چچا اور ان کے تمام گھر والے فیضو کا نیا مکان دیکھنے کے لیے گئے جو اسے کمپنی کی طرف سے ملا تھا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ واقعی فیضو نے ٹھیک ہی تو کہا تھا' اس مکان میں موجود ساز و سامان کے سامنے سعود آباد کے کوارٹر کے ساز و سامان کو تو واقعی محض کاٹھ کباڑ ہی قرار دیا جا سکتا تھا..... اور یہ کاٹھ کباڑ دونوں ہی کوارٹروں میں یکساں نوعیت کا حامل تھا۔ جیسا ساز و سامان فیضو کے کوارٹر میں تھا ویسا ہی ساز و سامان شوکت حسین کے کوارٹر میں بھی تھا۔

فیضو کا سامان تو بدل رہا تھا۔ وہ اپنے کوارٹر کے سامان کو کاٹھ کباڑ قرار دے سکتا تھا لیکن..... "ہمارے کوارٹر کے ساز و سامان کا کیا ہوگا؟" شاکرہ کے دماغ میں ایک سہما سہما سا خیال ابھرا۔ اگرچہ اس کو یقین تھا کہ یہ جو کچھ فیضو کو مل رہا ہے صرف فیضو کا ہی نہیں' اس کا اپنا بھی ہے اور وہ فیضو کی خوشی میں پوری طرح شریک بھی تھی لیکن پھر بھی' ایک قسم کی بے چینی تھی جو اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ فیضو نے جو اچانک چھلانگ ماری تھی اس سے شاکرہ کچھ گھبرا گئی تھی۔

فیکٹری کے مینٹی ننس ڈیپارٹمنٹ کی ایک خاتون فاخرہ بانو ان لوگوں کے ساتھ تھی' جو فیضو اور اس کے گھر والوں کو مکان دکھا رہی تھی اور وہاں موجود چیزوں اور ساز و سامان کے بارے میں انہیں بتا رہی تھی۔ فیضو نے فاخرہ بانو سے اپنی دادی کا تعارف تو کروایا تھا' لیکن باقی لوگوں کے بارے میں اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ سارے لوگ بڑی حیرت کے عالم میں اس شاندار مکان اور اس کے ساز و سامان کو دیکھ رہے تھے اور مرعوبیت کا تاثر ان کے چہروں سے ظاہر تھا۔

"یہ آپ کی کون ہیں؟" فاخرہ بانو نے شمسن چچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیضو سے پوچھا۔

"یہ لوگ ہمارے پڑوسی ہیں۔" فیضو نے ان سبھوں کا مشترکہ تعارف کراتے ہوئے

کہا۔ ''ہمارے گھر کے قریب ہی رہتے ہیں۔''

''اچھا.....اچھا.....'' فاخرہ بانو نے مسکرا کر کہا اور پھر وہ شوکت حسین سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''آپ کیا کام کرتے ہیں سر؟''

شوکت حسین کا دل کانپ اٹھا۔ اسے آج تک کسی سے یہ بات چھپانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ وہ سبزی کا ٹھیلا لگاتا ہے گو اب کافی عرصے سے اس نے ٹھیلا لگانا چھوڑ دیا تھا اور وہ مختلف ہوٹلوں میں سبزی کی سپلائی کا کام کرتا تھا جس سے اس کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، پھر بھی وہ بنیادی طور پر ایک سبزی فروش ہی تھا اور اس نے آج تک کسی سے یہ بات نہیں چھپائی تھی۔ دراصل زندگی نے اسے کبھی کسی ایسے موڑ پر لا کر نہیں کھڑا کیا تھا جہاں اسے اپنی شناخت چھپانے کی ضرورت پیش آئی ہو.....لیکن اس وقت وہ اچانک ایسی غیر متوقع صورتِ حال سے دوچار ہو گیا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس معزز عورت کو اپنے بارے میں کیا بتائے، جو اس کے ہونے والے داماد کو ملنے والے بنگلے میں کھڑی ہوئی اس سے اس کے پیشے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

شوکت حسین کی کالج میں پڑھنے والی ذہین اور ہوشیار بیٹی مسعودہ نے اس موقع پر اپنے باپ کی مدد کی اور شوکت حسین کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''ہمارے والد کنٹریکٹر ہیں۔ ان کا سپلائی کا کام ہے۔ وہ فروٹ اور ویجی ٹیبل وغیرہ سپلائی کرتے ہیں۔''

''دیٹ از فائن۔'' فاخرہ بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شوکت حسین اس کی بات کا مطلب تو نہیں سمجھ سکا، لیکن اس نے اطمینان اور سکون کی گہری سانس لی۔ مسعودہ نے اسے ایک عذاب سے بچا لیا تھا.....اور پھر.....مسعودہ نے کوئی غلط بات بھی نہیں کہی تھی۔

فیضو کی آنکھوں میں ہزاروں رنگ اتر رہے تھے اور وہ بڑے گہرے جذبۂ افتخار کے ساتھ ایک ایک چیز ان لوگوں کو دکھا رہا تھا۔ فاخرہ بانو نے مہمانوں کے لیے چائے کا بندوبست بھی کیا تھا۔

جب وہ لوگ وہاں سے واپس آئے تو دادی بے انتہا خوش ہونے کے ساتھ سخت گھبراہٹ کا بھی اظہار کر رہی تھیں۔

''اے ہم سے اتنے بڑے گھر میں اکیلے کیسے رہا جائے گا؟ اے اکیلے گھر میں ہم کہاں کہاں ڈولتے پھریں گے؟''

''اے تم ہمیشہ تو اکیلی نہیں رہو گی فخرن خالہ۔'' شمسن چچی نے فوراً لقمہ دیا اور معنی خیز نظروں سے دادی کی طرف دیکھا۔ دادی فوراً ہی شمسن چچی کا مطلب سمجھ گئیں۔

''ہاں بھئی وہ تو ہے۔'' انھوں نے ایک طمانیت خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مگر..... مگر تب تک تو اکیلے ہی رہنا پڑے گا.....اے وہاں تو کوئی ایسا پاس پڑوس بھی نظر نہیں آتا.....''

''پاس پڑوس کے چکر میں زیادہ نہ پڑنا دادی۔'' فیضو نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''وہاں نچلے اسٹاف کی عورتوں وغیرہ سے زیادہ مت گھلنا ملنا اور کسی کو یہ ہرگز مت بتانا کہ سعود آباد آنے سے پہلے ہم لوگ گجر نالہ کی بستی میں رہتے تھے.....اور نہ ابا اور اماں کے بارے میں کوئی بات کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے وہاں یہی بتایا ہے کہ وہ دونوں مر چکے ہیں۔''

دادی کے چہرے پر ایک ہلکی سی سیاہی دوڑ گئی۔ شمسن چچی بھی بالکل خاموش ہو گئیں۔ یہاں سعود آباد میں تو سارے پڑوسیوں کو یہ بات معلوم تھی کہ یہاں آنے سے پہلے وہ لوگ گجر نالہ کی بستی میں رہتے تھے.....لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کا ماضی ان کے لیے گالی بن گیا ہو۔

☆======☆======☆

کرامت اللہ نے اپنے کام کے آخری دن فیضو کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اگلے دن سے کرامت اللہ اس جگہ سے جا رہا تھا۔ مکان اس نے پہلے ہی خالی کر دیا تھا۔

کرامت اللہ کے کمرے میں شمس الدین سپروائزر پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔

''اب تمہیں سارا کام سنبھالنا ہے۔'' کرامت اللہ نے ایک غم انگیز مسکراہٹ کے ساتھ فیضو سے کہا۔ ''اور اچھی طرح جان لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم کوالٹی کنٹرول کے انچارج ہو لیکن تمہیں کسی بھی دوا کی تیاری پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو دوا جیسی بن رہی ہے، جن اجزاء کے ساتھ بن رہی ہے، تمہیں بس اس کو پاس کر دینا ہے اور کاغذ پر اپنے دستخط کر دینے ہیں۔''

فیضو کام تو کافی دن سے کر رہا تھا لیکن وہ ابھی تک اس مرحلے سے نہیں گزرا تھا۔ دواؤں کی کوالٹی کی فائنل چیکنگ کرامت اللہ خود کرتا تھا اور اس نے اس کام میں ابھی تک اپنے نئے اسسٹنٹ فیضان علی کو شریک نہیں کیا تھا۔ فیضو کو دیگر کاموں کی تربیت دی جا رہی تھی، دواؤں کی تیاری کے مختلف مراحل کے بارے میں، ان کے اجزاء کے بارے میں ان کی پیکنگ کے بارے میں ساری ضروری باتیں اسے بتائی گئی تھیں، لیکن اصل بات تو کرامت اللہ اسے آج بتا رہا تھا۔

''لیکن تیاری کے وقت دوا کے اندر شامل اجزاء کے تناسب اور مقدار کی چیکنگ.....''

"تمہیں اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" کرامت اللہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ شمس الدین تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ بس سب کچھ ان پر چھوڑ دو۔ انہیں معلوم ہے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔"

شمس الدین سپروائزر کے بارے میں فیضو کو معلوم تھا کہ وہ ایک پرانا آدمی ہے اور صرف میٹرک پاس ہے اور جدید کیمسٹری یا دواسازی وغیرہ کے نازک اور باریک مسائل کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں ہے۔

"لیکن سر اگر کوئی غیر معیاری دوا بن کر مارکیٹ میں چلی گئی تو؟" فیضو نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ "کسی دوا کے مطلوبہ اجزاء میں اگر کوئی کمی بیشی ہوگئی تو؟ اس کے نتیجے میں کمپنی کا مینوفیکچرنگ لائسنس بھی کینسل ہوسکتا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" کرامت اللہ نے اسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "مالک لوگ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور تم بھی جان لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

"اور ڈرگ انسپکٹر....."

"ان کی فکر مت کرو۔" کرامت اللہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم بس یہ سمجھ لو کہ تسلسل کے ساتھ کام کرتا ہوا ایک ڈھانچہ ہے اور تمہیں اپنے آپ کو اس ڈھانچے میں فٹ کرکے اس کا ایک حصہ بن جانا ہے۔"

"دوائیں جس طرح بن رہی ہیں، اسی طرح بنتی رہیں گی۔" شمس الدین نے کہا۔ "آپ کو اس بارے میں بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے سر....." آپ اطمینان سے اپنا کام کرتے رہیے..... سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"جب تک تم مالکوں کی مرضی کے مطابق کام کرتے رہو گے، تمہارا اپنا نوکری کا میٹر بھی چلتا رہے گا، لیکن جب تم مالکوں کی مرضی کے خلاف چلنا چاہو گے تو یہ میٹر بند ہوجائے گا اور پھر دوسرے میٹر کی تلاش تمہارے لیے آسان نہیں ہوگی۔"

کرامت اللہ نے فیضو سے جو باتیں اس وقت کہی تھیں جب اس نے فیضو کو اپنے گھر میں بلایا تھا، ان کا پورا مفہوم فیضو پر آج واضح ہوگیا اور اس وقت اس نے اس کی عملی شکل دیکھ لی جب اس نے اپنی "نگرانی" میں تیار ہونے والی دواؤں کو دیکھا۔ ان میں سے تقریباً ہر دوا غیر معیاری تھی۔

دوا کے فارمولے میں اس کے جو اجزاء ترکیبی درج ہوتے تھے ان میں سے مہنگے اجزاء کی مقدار کم کردی جاتی تھی۔ یہ کمی اس حد تک کی جاتی تھی کہ وہ دوا بالکل غیر موثر نہ

ہوجائے، کیونکہ اس صورت میں وہ مارکیٹ میں فیل ہوجاتی۔ دوا کو اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ اس کا مطلوبہ اثر اس کی زیادہ مقدار زیادہ دنوں تک استعمال کرنے کے بعد ہی ظاہر ہو۔ اس طرح لاگت میں بہت کمی کرکے اندھا دھند منافع کمایا جارہا تھا۔

☆======☆======☆

فیضو دادی کو ساتھ لے کر فیکٹری کے اندر بنے ہوئے بنگلے میں منتقل ہوگیا، جسے کرامت اللہ خالی کرکے چلا گیا تھا۔ سعود آباد کے کوارٹر کا سارا "کاٹھ کباڑ" وہیں چھوڑ دیا گیا۔ ان میں سے کسی بھی چیز کی نئے گھر میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ فیضو کی کتابوں اور کپڑوں کے علاوہ سب کچھ چھوڑ دیا گیا اور چابی شمسن چچی کے حوالے کردی گئی۔

دادی کا کپڑے سینے کا سلسلہ تو کافی دن پہلے ہی سے ختم ہوچکا تھا، وہ اگرچہ اسے جاری رکھنا چاہتی تھیں، لیکن فیضو نے انہیں سختی کے ساتھ منع کردیا تھا۔ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ان لوگوں سے اور اس گھر سے جدا ہوتے وقت دادی بہت روئیں۔ شوکت حسین اور شمسن کے ساتھ ان کا کتنا پرانا رشتہ تھا اور اب وہ ان لوگوں سے دور جارہی تھیں، لیکن اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ یہ دوری محض عارضی ہے اور عنقریب سب لوگ پھر مل جائیں گے۔ شاکرہ کو تو بہو بن کر ان کے گھر میں جلد ہی آنا تھا۔

"اے اتنا کیوں رو رہی ہو فخرن خالہ۔" شمسن نے دادی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اے تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اللہ رکھے فیضو کو اتنی ترقی ملی ہے۔ میرے مولا نے یہ دن دکھایا۔"

"آتی جاتی رہنا شمسن۔" دادی نے کہا۔ "ہم اکیلے میں بہت گھبرائیں گے۔" پھر دادی کی آواز ایک بالکل ہلکی سرگوشی میں تبدیل ہوگئی۔ "اب اللہ نے چاہا تو جلد ہی دن تاریخ طے کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب تو فیضو کی نوکری بھی پکی ہوگئی..... اور اتنا اچھا گھر بھی مل گیا رہنے کو....."

"بس اب تمہارے ہی اوپر ہے فخرن خالہ۔" شمسن نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ "ہم تو ہر وقت تیار ہیں..... بس تمہارے اشارہ کرنے کی دیر ہے۔"

"اللہ کے حکم سے اشارہ بھی بہت جلدی ہوجائے گا۔" دادی نے کہا۔

شاکرہ بی اے کرچکی تھی اور اب پرائیویٹ طور پر ایم اے کی تیاری کررہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ملیر کے ایک اسکول میں نوکری بھی کرلی تھی۔ وہ اب خاندان کی آمدنی

میں اضافے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی۔اس کی چھوٹی بہن مسعودہ انٹر سائنس پاس کرنے کے بعد میڈیکل میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگئی تھی۔جس دن شوکت حسین اور شمسن کو یہ علم ہوا کہ مسعودہ کو میڈیکل میں داخلہ مل گیا ہے۔اس دن انہیں ایسا لگا جیسے وہ آسمان کی لامحدود بلندیوں پر پرواز کررہے ہیں اور انہیں کہکشاں میں رہنے کے لیے گھر مل گیا ہے۔

گلی گلی ٹھیلا لگا کر سبزی فروخت کرنے والے شوکت حسین کی بیٹی ڈاکٹر بننے جارہی تھی! شوکت حسین اور شمسن کو تو اس بات کا یقین ہی نہیں آرہا تھا کیا خدا کی قدرت تھی! ان کے پورے خاندان میں تو کوئی الف کے نام لٹھ نہیں جانتا تھا اور ان کی بیٹی ڈاکٹر بننے جارہی تھی۔

اس روز صبح کو اسکول جاتے وقت شاکرہ فیضو کے کوارٹر کے سامنے سے گزری تو اس کے دروازے پر تالے کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔کتنے برس بیت گئے تھے ان لوگوں کو ان کوارٹروں میں رہتے ہوئے.....لیکن اس کوارٹر میں آج تک کبھی تالا نہیں پڑا تھا۔دادی بے چاری تو کہیں جاتی ہی نہیں تھیں۔وہ تو سارا دن گھر میں رہتی تھیں اور گھر کے چولہے کو روشن رکھنے کی غرض سے کپڑے سیتی رہتی تھیں۔فیضو دن بھر گھر سے باہر رہتا تھا اور زندہ رہنے کی تگ ودو اسے سکون کا سانس نہیں لینے دیتی تھی۔اس کوارٹر کے در و دیوار میں زندگی کی کڑی مشقتوں اور جدوجہد کی سانسیں گھلی ہوئی تھیں' مگر آج سب کچھ کس قدر خاموش اور ویران معلوم ہورہا تھا۔کوارٹر کے در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی اس کے دروازے میں پڑا ہوا تالا اس بات کی خبر دے رہا تھا کہ وہ اب ایک خالی پنجرے کی طرح ہے۔

''نہ جانے فیضو اور دادی اس وقت کیا کررہے ہوں گے۔'' شاکرہ نے دُکھے ہوئے دل کے ساتھ سوچا اور ہولے ہولے قدم رکھتی ہوئی کوارٹر کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔اس کے دماغ میں یہ خیال ابھر رہا تھا کہ ایک دن وہ بھی اپنے کوارٹر کو چھوڑ کر اس گھر میں چلی جائے گی جس میں فیضو اور دادی گئے ہیں۔پھر کیا ہوگا؟ نہ جانے وہاں کیسا لگے گا؟ اس کے دل میں ایک غم آلود جذبہ بیدار ہونے لگا۔

☆======☆======☆

دادی اتنے بڑے گھر میں آنے کے بعد بولائی بولائی پھر رہی تھیں۔سب سے پہلے تو یہاں موجود بہت سی چیزوں کا استعمال ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور انہیں بار بار فیضو سے پوچھنا پڑتا تھا۔یہاں کتنی چیزیں ایسی تھیں جو دادی نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔یہاں فرش پر موٹے موٹے قالین بچھے ہوئے تھے' جن کو مشین کے ذریعے صاف

کیا جاتا تھا۔فریج تھا جس میں ٹھنڈے پانی کی بوتلیں رہتی تھیں۔غسل خانوں میں فلش ٹینک تھے اور نہانے کے لیے شاور تھے۔فیضو انہیں کسی بچے کی طرح ایک ایک چیز کے بارے میں بتارہا تھا اور دادی پر جیسے ایک نئی طلسماتی دنیا منکشف ہوتی چلی جارہی تھی۔اس گھر میں اتنا کچھ تھا' لیکن پھر بھی دادی بعض چیزوں کی کمی بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی تھی۔دادی نے آنے کے ساتھ ہی تو گھر میں گھڑونچی اور ٹھنڈے پانی کے مٹکے کی تلاش شروع کردی' لیکن انہیں نہ تو کہیں گھڑونچی ملی اور نہ اس پر رکھا ہوا ٹھنڈے پانی کا گھڑا۔یہ گھر اگرچہ دنیا جہان کی نعمتوں سے بھرا ہوا تھا لیکن دادی کو اس میں اپنے مطلب کی چیزیں مل ہی نہیں رہی تھیں۔انہیں پورے گھر میں کہیں کوئی چارپائی نظر نہیں آئی۔ان کے کوارٹر میں تو کئی چارپائیاں تھیں۔باورچی خانے میں دادی کو کوئی پیڑھی نظر نہیں آئی اور وہ پریشان تھیں کہ وہ کس چیز پر بیٹھ کر باورچی خانے میں کام کریں گی۔چولہا کہاں ہے' کدھر ہے' کیسا ہے' وہ انہیں کہیں نظر ہی نہیں آرہا تھا اور برتن وغیرہ دھونے کے لیے جو نل لگا ہوا تھا وہ اتنی اونچائی پر تھا کہ وہاں تک صرف کھڑے ہوکر ہی پہنچا جاسکتا تھا۔

دادی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے سعود آباد کے کوارٹر کا اس مکان سے کس طرح مقابلہ کریں۔بھلا کوئی مقابلہ تھا؟ دروازے سے چل کر اندر کمرے تک جاؤ تو بس چند قدموں کے اندر اندر سارا فاصلہ طے ہو جاتا تھا۔گھر کے کسی بھی حصے میں بس پلک جھپکتے میں پہنچ جاؤ.....لیکن یہاں تو معاملہ ہی بالکل دوسرا تھا۔گھر کے اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک کتنے فاصلے تھے۔

''اے بھیا مکان تو تمہارا بہت ہی اچھا ہے۔'' دادی نے فیضو سے کہا۔''خدا مبارک کرے۔تمہیں اس میں رہنا نصیب ہو اور اصل خوشی تو اس دن ہوگی جس دن اس گھر کی اصل گھر والی یہاں آکر رہنا شروع کرے گی۔''

فیضو نے دادی کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔فیضو نے ایک ایک چیز کے بارے میں دادی کو سمجھایا۔اس نے انہیں بتایا کہ پانی کے مٹکے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ اس گھر میں ریفریجریٹر موجود ہے اور چارپائی اس لیے نہیں ہے کہ مسہریاں موجود ہیں' جنہیں بیڈ کہتے ہیں اور جن پر موٹے موٹے گدے بچھے ہوئے ہیں اور باورچی خانے میں پیڑھی یا پیڑھے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ یہاں نیچے بیٹھ کر نہیں بلکہ کھڑے ہوکر کھانا پکایا جاتا ہے۔رفتہ رفتہ ساری باتیں دادی کی سمجھ میں آگئیں۔پھر بھی انہیں ان بہت ساری سہولتوں کے فقدان کا شکوہ تھا جو انہیں سعود آباد کو کوارٹر میں حاصل تھیں' سب سے بڑی کمی تو یہ تھی کہ یہاں کوئی

پڑوس نہیں تھا۔ یہاں شوکت حسین اور شمسن کا گھر نہیں تھا اور دادی اٹھتے بیٹھتے ان لوگوں کو یاد کرتی تھیں۔

''اب وہ لوگ تو اٹھ کر یہاں نہیں آسکتے نا دادی۔'' فیضو نے ایک برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''وہ جہاں ہیں خوش ہیں' ٹھیک ہیں اور ہم جہاں ہیں' وہاں ٹھیک ہیں۔''

''بس اب جلدی سے معاملہ طے کرو۔'' دادی نے کہا۔ ''اب تو سب کچھ ہوگیا۔ نوکری بھی پکی ہوگئی۔ رہنے کو اتنا اچھا گھر بھی مل گیا ہے۔ اب تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے تمہارے پاس..... اب شاکرہ کو لے آؤ اس گھر میں..... دیر کس بات کی ہے؟''

''اور جلدی کس بات کی ہے؟'' فیضو نے فوراً جواب دیا۔ ''ذرا سانس تو لینے دو ہمیں..... شاکرہ کون سی کہیں بھاگی جارہی ہیں۔''

''بھاگی تو نہیں جارہی ہے بیٹا' مگر شمسن اشاروں اشاروں میں ہم سے کئی بار کہہ چکی ہیں' ہم ان کا مطلب خوب سمجھتے ہیں۔ وہ لڑکی والی ہیں کھل کر تو نہیں کہہ سکتیں' ہمیں خود بات سمجھنی چاہیے۔''

فیضو نے بات کو آگے نہیں بڑھایا اور خاموشی اختیار کی۔

☆======☆======☆

فیکٹری میں جس طرح کام ہورہا تھا' اس کے جملہ اسرار و رموز فیضو پر آہستہ آہستہ منکشف ہوتے گئے۔ غیر معیاری دوائیں تیار ہوتی تھیں اور مارکیٹ میں دھڑلے سے سپلائی کی جاتی تھیں۔ کہنے کو تو فیضو کوالٹی کنٹرول آفیسر تھا لیکن فی الحقیقت اس کا کوالٹی پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ کوالٹی کنٹرول آفیسر صرف اس لیے تھا کہ اس کے پاس ضروری ڈگری تھی۔ وہ کوالیفائیڈ تھا اور اس منصب کے قانونی تقاضوں کو پورا کرتا تھا' مگر فی الحقیقت دواؤں کی تیاری کا عملی کام میٹرک پاس سپروائزر شمسن الدین کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ کون سی دوا میں کون کون سے اجزاء ترکیبی کس تناسب سے شامل کرنے ہیں' یہ صرف شمس الدین کو معلوم رہتا تھا' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کوالٹی کنٹرول آفیسر فیضان علی کو وہاں کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ فیضان علی کو تو بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ نئی نئی دواؤں کے فارمولے آتے تھے۔ پرانے فارمولوں میں نئی تحقیق کی روشنی میں ردوبدل کیا جاتا تھا۔ وزارتِ صحت سے نئی دوائیں منظور کروائی جاتی تھیں۔ وزارتِ صحت کے حکام اور افسران سے گفت وشنید کرنی پڑتی تھی۔ وہ سارا دن بہت مصروف رہتا تھا۔

فیکٹری میں ڈرگ انسپکٹر آتے تھے اور ہر ماہ کا مقررہ بھتہ لے کر اور کاغذ پر دستخط کر کے

چلے جاتے تھے۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا نہ دیکھتا تھا کہ کیا بن رہا ہے اور کس طرح بن رہا ہے۔ فیکٹری انسپکٹر آتے تھے' مقررہ بھتہ لیتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ وہ فیکٹری کے حالاتِ کار پر نظر بھی نہیں ڈالتے تھے..... ایکسائز والے آتے تھے' بھتہ لیتے تھے' دستخط کرتے اور چلے جاتے تھے۔ اب جتنی مقدار میں دوائیں جی چاہے' محصول ادا کیے بغیر فیکٹری سے باہر نکال کر لے جاؤ۔

فیضو نے اپنے کانوں اور آنکھوں کو کھلا رکھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ساری معلومات اپنے اندر جذب کرتا جارہا تھا۔ یہ اس کا پہلا تجربہ تھا اور وہ ایک ایک چیز کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ سمجھنے میں مصروف تھا۔ وہ کرامت اللہ کا ممنون تھا جنہوں نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کس طرح کام کرنا ہے۔ وہ اسی طرح کام کررہا تھا۔ اپنے آپ کو نوکر سمجھنا' مالکوں کے مفادات کی حفاظت کرنا اور جو کچھ مالک چاہیں' جیسا چاہیں وہی کرنا۔

وہ یہ سب کچھ عملی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ سیکھ رہا تھا اور اس کاروبار میں اندھا اور بے دریغ منافع کمانے کے خفیہ گر منکشف ہوتے جارہے تھے۔ کئی ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی یہ عظیم الشان فیکٹری سونے کی کان تھی۔ کان سے نکالے جانے والے سونے کا کچھ حصہ ان لوگوں تک پہنچانا لازمی تھا جو کان کو کسی بھی طرح استعمال کرنے کی اجازت دیتے تھے۔

فیضو کا رویہ مالکان کی جانب سے بے حد نیاز مندانہ اور اطاعت شعارانہ تھا۔ اس سے جو کام جس طرح کرنے کے لیے کہا جاتا۔ وہ اس طرح سے کرتا تھا اور کوئی غیر ضروری سوالات نہیں کرتا تھا' نہ غیر ضروری مشورے دیتا تھا۔

فیکٹری کا مالک منصور علی تھا' جو ایم ڈی تھا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ اس کے علاوہ اس کے دو جوان بیٹے تھے اور وہ بھی کاروبار میں اس کے ساتھ شریک تھے۔ ان کے نام منظور علی اور محمود علی تھے۔ منظور علی زیادہ تر اکاؤنٹس وغیرہ کا کام سنبھالتا تھا اور محمود علی مارکیٹنگ کی نگرانی کرتا تھا۔ فیضو کا تینوں ہی مالکوں سے سابقہ رہتا تھا اور وہ تینوں کو خوش رکھتا تھا۔ اسے اس بات کا بھی خیال رہتا تھا کہ شمس الدین کے ساتھ اس کا کوئی بگاڑ نہ ہونے پائے۔ شمس الدین مالکوں کا معتمد خصوصی اور ان کا گہرا رازداں تھا۔ دواؤں کی تیاری میں کیے جانے والے لاکھوں روپے کے گھپلے' جو آگے جا کر کروڑوں روپے کی شکل اختیار کر لیتے تھے' شمس الدین کی ہی زیر نگرانی انجام پاتے تھے۔

فیضو کو یہاں کام کرتے ہوئے مزید تین ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس عرصے کے دوران

دادی دو دن کے لیے سعود آباد جا کر شوکت چچا کے گھر رہی تھیں۔ فیضو نہیں چاہتا تھا کہ وہ جائیں، لیکن دادی بضد تھیں۔ چنانچہ فیضو نے فیکٹری کی ایک گاڑی سے ان کو وہاں پہنچوا دیا تھا اور پھر واپس بلوا لیا تھا۔ شوکت حسین اور شمسن نے دادی سے سخت شکایت کی تھی کہ فیضو بھی ان کے ساتھ کیوں نہیں آیا۔

وہ لوگ بھی اس دوران ایک بار آئے تھے اور شمسن چچی کافی دیر تک دادی سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ دادی کو شاکرہ کے جہیز کے ان جوڑوں کے بارے میں بتا رہی تھیں جن کو وہ پوری طرح تیار کروا چکی تھیں۔ فیضو زیادہ دیر تک گھر میں نہیں رکا تھا۔ وہ یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ اسے فیکٹری میں کچھ ضروری کام ہے۔

اس روز ایم ڈی منصور علی نے فیضو کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ فیضو فوراً وہاں پہنچا اور اس کو یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ ایم ڈی صاحب خوشگوار موڈ میں تھے۔ چند دن پہلے وہ ایک چھوٹے سے مسئلے پر فیضو سے خاصی ناراضگی کا اظہار کر چکے تھے، حالانکہ غلطی فیضو کی نہیں تھی۔ فیضو پریشان ہو گیا تھا، لیکن پھر ایم ڈی صاحب ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور انہوں نے مفاہمانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔

''ہاں میاں فیضان۔'' منصور علی نے مسکراتے ہوئے فیضو کی طرف دیکھا۔ ''کیسا چل رہا ہے تمہارا کام؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟''

''بالکل ٹھیک سر۔'' فیضو نے چہک کر کہا۔

''سیکرٹری ہیلتھ کے گھر تم نے قالین تو پہنچوا دیئے تھے نا؟''

''جی ہاں سر۔'' فیضو نے فوراً جواب دیا۔ ''اسی دن پہنچوا دیئے تھے..... ان کی بیگم کچھ پردوں کے لیے کہہ رہی تھیں۔ میں نے کھڑکیوں کا ناپ لینے کے لیے آدمی بھجوا دیا تھا۔''

''ہاں، سیکرٹری صاحب کا فون آیا تھا۔'' منصور علی نے کہا۔ ''قالین ان کی بیگم کو بہت پسند آیا۔ خیر یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ یہ بتاؤ ایک طالب علم کی فزکس میں کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

''ضرور کر سکتا ہوں سر۔'' فیضو نے فوری آمادگی کے ساتھ کہا۔ ''اگر بڑی کلاس کا طالب علم ہے، تو بھی مدد کر سکتا ہوں۔''

''بھئی بات یہ ہے کہ ہماری بیٹی ہے ناہید۔'' منصور علی نے کہا۔ ''وہ اس سال بی ایس سی کا امتحان دے رہی ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ باہر سے کسی ٹیوٹر کو بلوا لوں لیکن مجھے خیال آیا کہ تمہارا تعلیمی ریکارڈ تو بہت شاندار رہا ہے اور بی ایس سی میں تمہارے فزکس

میں بہت اچھے نمبر تھے، تو میں نے سوچا کیوں نہ تم کو ہی تکلیف دوں۔''

''ارے سر، اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟'' فیضو نے سراپا عجز و نیاز بن کر کہا۔ ''میرے لیے تو یہ بڑی عزت کی بات ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں بڑی خوشی سے اس خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

''میں نے اس سلسلے میں یہ سوچا ہے کہ تم کو روزانہ فیکٹری سے ایک گھنٹہ پہلے ہی چھٹی دے دی جائے۔ اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں سے ایک گھنٹہ تم ہماری بیٹی کے لیے صرف کرو گے اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے تمہیں علیحدہ معاوضہ نہیں درکار ہو گا۔''

''نہیں سر، بھلا معاوضے کی کیا بات ہے؟'' فیضو نے جلدی سے کہا۔ ''میں فیکٹری کے پورے کام کے بعد صاحب زادی کو پڑھا دیا کروں گا۔ میرے لیے بھلا کیا فرق پڑے گا؟''

''نہیں فیضان میاں۔'' منصور علی نے کہا۔ ''فرق پڑتا ہے۔ فیکٹری کی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد جو وقت ہے وہ تمہارا ہے اس پر تمہیں اختیار ہے۔ تم ایک گھنٹہ پہلے ہی چھٹی کر لیا کرو۔ میری طرف سے تمہیں اس کی اجازت دی جاتی ہے۔''

''جیسا آپ چاہیں سر۔'' فیضو نے کہا۔ ''ویسے میں اس بات کے لیے بالکل تیار ہوں کہ فیکٹری ٹائم کے بعد انہیں پڑھا دیا کروں۔''

''نہیں..... فیکٹری ٹائم کے اندر ہی.....'' منصور علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تو پھر کب سے شروع کرو گے؟''

''جب سے آپ کہیں سر۔'' فیضو نے جواب دیا۔ ''میں بالکل تیار ہوں۔''

''بس تو پھر کل سے۔'' منصور علی نے کہا۔ ''میں ناہید کو آج بتا دوں گا۔ تم کل شام کو ہمارے بنگلے پر پہنچ جانا۔ ناہید بھی تمہیں تیار ملے گی۔''

فیضو اس اعزاز پر پھولا نہیں سما تا تھا۔ مالک نے اسے اس قابل سمجھا تھا کہ اپنی نوجوان بیٹی کا ٹیوٹر مقرر کرے۔ خوش قسمتی کس طرح قدم قدم پر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اسے اپنی صلاحیتوں کے اظہار اور مالکوں کا اعتماد جیتنے کا ایک اور موقع مل رہا تھا۔

فیضو کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ دو بیٹوں کے علاوہ منصور علی کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا نام ناہید ہے اور جو بی ایس سی میں پڑھتی ہے۔ اس نے فیکٹری کے کمپاؤنڈ میں ایک بار ناہید کو اپنی گاڑی میں آتے جاتے دیکھا بھی تھا، لیکن اس نے بالکل قریب سے ناہید کو کبھی نہیں دیکھا تھا، تاہم اسے معلوم تھا کہ ناہید ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی ہے۔

اگلے دن منصور علی نے اس کو فون کر کے یاد دلایا کہ اسے ایک گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے اٹھ

جانا ہے۔

''مجھے یاد ہے سر۔'' فیضو نے فوراً کہا۔ ''بھلا آپ کے حکم کو میں کس طرح بھول سکتا ہوں؟''

ایک گھنٹہ پہلے اٹھ کر وہ مالکوں کے بنگلے پر جا پہنچا۔ اس نے آج تک اس بنگلے کو صرف باہر سے اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا۔ اس کے اندر کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ ایک ملازم نے جسے شاید اس کی آمد کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔ اس کو اندر لے جا کر کمرے میں بٹھا دیا۔ سارا کمرہ نہایت بیش قیمت ساز و سامان سے بھرا ہوا تھا۔ فیضو ایک ایک چیز کو حیرت اور تحسین کی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ صرف اس کمرے میں موجود قیمتی سامان سے سعود آباد کے کتنے کوارٹر خریدے جا سکتے ہیں۔

اسی وقت ناہید کمرے میں داخل ہوئی۔ فیضو اس کو آتا دیکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور جو چیز اس نے سب سے پہلے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ ناہید لنگڑی تھی۔ وہ دائیں طرف کو لنگ کھا کر چلتی تھی۔ فیضو آج پہلی بار اس کو قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی لیکن فیضو کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ناہید مالک کی بیٹی تھی اور وہ اسے پڑھانے کے لیے آیا تھا ناہید اسے سلام کر کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ ایک ملازمہ کتاب اور کاپی وغیرہ لے کر آئی اور میز پر خاموشی سے رکھ کر چلی گئی۔

فیضو نے جب ناہید کو پڑھانا شروع کیا تو اس کا رویہ ایک استاد کا رویہ نہیں تھا۔ یہ ایک نیاز مند اور اطاعت گزار ملازم کا رویہ تھا' جو اپنے شاگرد کو پڑھانے میں حد درجہ احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ کہیں اس سے کوئی گستاخی سرزد نہ ہو جائے۔

ایک گھنٹہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا اور ناہید فیضو کے پڑھانے سے بہت متاثر ہوئی۔

''آپ بہت اچھا پڑھاتے ہیں سر۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کالج میں تو یہ چیزیں کتنی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ آپ نے سمجھایا تو بہت آسانی سے سمجھ میں آ گئیں سر۔''

''مجھے خوشی ہے کہ میرا پڑھانا آپ کو ٹھیک لگا۔'' فیضو نے مسرت اور انکسار سے سرشار لہجے میں کہا۔ ''ان شاء اللہ بہت جلد آپ کی ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔''

اس دن کے بعد سے فیضو نے روزانہ ناہید کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ناہید اس کی علمیت اور طریق تدریس سے بہت زیادہ مطمئن تھی اور اس کی بہت عزت کرنے لگی تھی' جس کا برملا اعتراف اس نے والدین اور بڑے بھائیوں کے سامنے کیا تھا۔ وہ لوگ اس بات سے بہت

خوش ہوئے تھے۔

منصور علی وسیع کاروبار' اثاثوں اور جائیداد کا مالک تھا اور اس کے تین وارث تھے' جن میں دو بیٹوں کے علاوہ سب سے چھوٹی بیٹی ناہید بھی شامل تھی' جس میں ایک پیدائشی نقص تھا اس کی ایک ٹانگ بڑی اور ایک چھوٹی تھی اور یہ فرق بہت زیادہ تھا' جس کے باعث وہ لنگڑا کر چلتی تھی۔ اس زمانے کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے' جن میں لندن کے ڈاکٹر بھی شامل تھے ناہید کا معائنہ کیا تھا مگر وہ اس کا یہ نقص دور نہیں کر سکے تھے۔

فیکٹری میں جب اسسٹنٹ کوالٹی کنٹرول آفیسر کے لیے جگہ کا اشتہار شائع کروایا گیا تھا تو اس کے جواب میں آنے والی درخواستوں کا تینوں باپ بیٹوں نے خصوصی توجہ کے ساتھ جائزہ لیا تھا۔ پھر جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا تھا' ان سے انٹرویو کے دوران ان کی جملہ ذاتی حالت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی تھی۔

''اس لڑکے کے بارے میں سوچو۔'' بعد میں منصور علی نے اپنے دونوں بیٹوں سے فیضان علی کے بارے میں کہا۔ ''نوجوان ہے' کیمسٹری میں ایم ایس سی کا امتحان دے چکا ہے۔ لاجواب تعلیمی کیریئر کا حامل ہے۔ ایک کنگال خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ سعود آباد کے ایک کوارٹر میں اپنی ایک بیوہ دادی کے ساتھ اکیلا رہتا ہے۔ ماں باپ مر چکے ہیں' کوئی اور بھائی بہن بھی نہیں ہے۔ ٹیوشنز پڑھا کر گزارا کرتا ہے۔ کیا خیال ہے تم لوگوں کا؟''

''میرے خیال میں تو بہترین رہے گا۔'' محمود علی نے کہا۔ ''پرسنالٹی بھی اچھی ہے اور کوالیفیکشن تو بہترین ہے۔''

''کوشش کی جانی چاہیے۔'' منصور علی نے کہا۔ ''اگر کام بن گیا تو ساری زندگی ہمارا وفادار بن کر رہے گا۔''

''ہمیں دراصل ایسے ہی کسی بالکل غریب لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت نوجوان کی تلاش ہے۔'' منصور علی نے کہا۔ ''ناہید کے لیے رشتوں کی تو کوئی کمی نہیں' اس کا دولت مند ہونا اس کے لنگڑے پن کے عیب کو ڈھانپ لیتا ہے' مگر ہمیں ایسا آدمی چاہیے جو ہمارے احسانوں کے بوجھ تلے اتنا دبا ہوا ہو کہ کبھی ہماری جائیداد کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے اور کبھی ناہید کو ورغلا کر ہمارے خلاف نہ کھڑا کر سکے۔''

''مجھے تو یہ لڑکا خاصا مسکین اور عاجز قسم کا لگتا ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے حد ضرورت مند ہے۔ اس کی یہ پہلی پہلی نوکری ہوگی۔ ہم اسے تھوڑے پیسے بھی دیں گے تو وہ اس کو اپنی موجودہ حالت میں بہت لگیں گے۔''

''کرامت اللہ کی تنخواہ میں ہم اس جیسے کئی لڑکے رکھ سکتے ہیں۔'' منصور علی نے کہا۔ ''کرامت اللہ کی ہمیں اب ضرورت نہیں ہے۔ وہ آئے دن بیمار رہتے ہیں اور انہیں چھٹی چاہئے ہوتی ہے۔''

چنانچہ اس پس منظر میں فیضو نے ناہید کو پڑھانے کا کام شروع کیا۔ ناہید کی ماں رابعہ نے جب فیضو کو اچھی طرح سے دیکھا تو اسے وہ لڑکا بہت پسند آیا اور جب ناہید نے بڑے اشتیاق کے عالم میں اس کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے لیے بھرپور احترام کا اظہار کیا تو اس لڑکے میں رابعہ کی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ پڑھائی ختم ہو جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے وہاں بیٹھ جاتی اور فیضو سے اس کے بارے میں باتیں کرتی رہتی۔

''تمہارے والدین کیا تمہارے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے؟'' ایک شام رابعہ نے فیضو سے پوچھا۔

''جی ہاں میڈم۔'' فیضو نے بڑے ادب سے کہا۔ ''والدہ تو بہت عرصہ پہلے مر گئی تھیں۔ والد کا انتقال ان کے کئی سال بعد ہوا۔''

''ارے بھئی' یہ تم مجھ کو میڈم ویڈم مت کہا کرو۔'' رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''سیدھے سادے انداز میں تم مجھے آنٹی کہہ سکتے ہو۔ آخر میں تمہاری ماں کی طرح ہوں۔''

''ارے امی' یہ تو مجھے بھی میڈم کہتے ہیں۔'' ناہید نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بھئی۔'' رابعہ نے کہا۔ ''ناہید تو تم سے چھوٹی ہے اور پھر تمہاری شاگرد ہے۔ بھلا کوئی ٹیچر اپنی شاگرد کو میڈم کہے گا؟ نام لیا کرو اس کا۔''

''میں..... میں بھلا ایسی جسارت کیسے کر سکتا ہوں؟'' فیضو نے کہا۔ ''میں تو..... میں ایک ملازم ہوں آپ کے اس ادارے کا.....''

''ارے ملازم ہو تو کیا ہوا؟'' رابعہ نے اپنائیت کے انداز میں کہا۔ ''ملازم ہو تو دفتر میں ہو' گھر میں تو نہیں ہو۔ ناہید تمہاری بہت تعریف کرتی ہے۔ تم بہت قابل لڑکے ہو..... اور بھئی ہم تو تمہیں اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔''

اپنے خاندان کا ایک فرد..... فیضو کے دماغ میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس نے تو ایسے الفاظ سننے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا..... تقدیر اسے کس طرف لے جا رہی تھی؟ اس رات وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ وہ اتنا نادان تو نہیں تھا کہ ان غیر معمولی عنایتوں کا مطلب سمجھ نہ پاتا' لیکن یہ بات اس کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ شاید یہ صرف اس کا وہم تھا' صرف ایک کمزور سی خوش گمانی..... ورنہ کہاں وہ کروڑ پتی لوگ اور کہاں وہ کنگلا..... ایک نکھٹو' جواری باپ کی

اولاد..... لیکن..... لیکن..... اگر واقعی ایسا کچھ ہو جائے تو؟ جذبات کی یورش اور شدت کے باعث اس پر وحشت سی طاری ہونے لگی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ معمولی شکل وصورت کی حامل لنگڑی ناہید کی زرنگار وزر افروز دنیا کے آگے سبزی کا ٹھیلا لگانے والے شوکت چچا کی حسین بیٹی شاکرہ غربت کے دھندلکوں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

فیضو نے دادی کو ناہید کو پڑھانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور اس طرح اسے یقین تھا کہ یہ بات شوکت چچا کے گھر والوں کو نہیں معلوم ہو سکے گی۔ دل میں چور تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات وہاں تک پہنچے۔

پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا اور ساتھ ساتھ فیضو پر ان لوگوں کی اور خاص طور سے ''آنٹی'' کی نوازشوں اور عنایات میں اضافہ ہوتا گیا۔ رابعہ نے اس دوران کئی قیمتی چیزیں فیضو کو دیں' جن میں ایک گرم سوٹ کا انگلش کپڑا' کئی قمیصیں اور ٹائیاں' ایک پارکر پین وغیرہ شامل تھا۔ فرطِ ممونیت سے فیضو کا سارا وجود دبا دبا اور جھکا جھکا جا رہا تھا۔ منصور علی اور اس کے دونوں بیٹے بھی اس پر بہت مہربان تھے اور فیضو کو لنگڑی ناہید کی آنکھوں میں بھی ایک ایسی چمک نظر آنے لگی تھی جس سے فیضو بخوبی واقف تھا۔ یہ وہ چمک تھی جس سے شاکرہ کی آنکھیں اس کے لیے ہمیشہ روشن رہتی تھیں لیکن ناہید کی آنکھوں میں یہ چمک عاجزی اور انکسار کا بھی ایک نیا سارنگ لئے ہوئے تھی۔

☆======☆======☆

اس روز سپر وائزر شمس الدین جس کو فیضو ہمیشہ خوش اور راضی رکھنے کی کوشش کرتا تھا' کیونکہ وہ مالکوں کا سب سے خاص آدمی تھا۔ تنہائی میں فیضو سے راز دارانہ انداز میں کہنے لگا۔ ''ناہید بٹیا کے لیے ایک بہت شاندار رشتہ آیا ہے..... ٹکر کا خاندان ہے۔ لکھ پتی لوگ ہیں' کپڑے کا بزنس ہے۔''

''جی ہاں' کیوں نہیں۔'' فیضو نے آہستہ سے کہا۔ ''بڑے لوگوں کے گھر تو بڑے لوگوں کے ہی رشتے آتے ہیں۔ ان کے لیے تو اور بھی کئی اچھے رشتے آئے ہوں گے۔ انہیں بھلا رشتوں کی کیا کمی ہوگی۔''

''ہاں۔'' شمس الدین نے کہا۔ ''کئی بڑے گھرانوں کے رشتے آئے ہیں ان کے لیے..... لیکن گھر والوں نے منع کر دیا..... وہ لوگ اس رشتے کو بھی منع کر دیں گے' مجھے معلوم ہے.....''

''مگر کیوں؟'' فیضو نے کہا۔ ''کیوں منع کر دیں گے؟''

''ان کا خیال یہ ہے کہ ان رشتوں کے پیچھے صرف لالچ کارفرما ہے۔'' شمس الدین نے کہا۔ ''اور ان کو ڈر ہے کہ یہ لوگ ناہید بٹیا کو خوش نہیں رکھ سکیں گے اور بعد میں پریشان کریں گے۔''

''نہیں' کوئی ضروری تو نہیں ہے۔'' فیضو شمس الدین کی بات کا مفہوم کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ ''ناہید صاحبہ کی ٹانگ میں جو نقص ہے' شاید آئندہ چند برسوں میں اس کا علاج نکل آئے گا۔ میں ایک میڈیکل جرنل آرتھوپیڈک سرجن کی ایک ریسرچ اسٹڈی پڑھ رہا تھا۔ اس کی ٹیم کا کہنا ہے کہ آئندہ چند برسوں میں اس قسم کے پیدائشی نقص کو آپریشن کے ذریعے ٹھیک کیا جا سکے گا۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو پھر بہت ہی اچھا ہے۔'' شمس الدین نے کہا۔ ''مگر یہ سب تو مفروضات ہیں سر..... عملی صورتِ حال کیا ہے؟ ناہید بٹیا کے والدین ان کی شادی کسی ایسے گھرانے میں کرنا چاہتے ہیں جہاں دولت کے لالچ کا دور دور تک گزر نہ ہو.....''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' فیضو نے کہا۔

''سر' ایک بات کہوں' اگر آپ برا نہ مانیں۔'' شمس الدین نے کہا۔ ''آپ..... آپ کیوں نہیں کرتے کوشش؟''

''کیا؟'' فیضو کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شمس الدین کو دیکھنے لگا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ بھلا میری یہ اوقات کہ میں ایسی بات سوچ بھی سکوں۔''

''کیوں سر؟'' شمس الدین نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا خرابی ہے آپ کی اوقات میں؟ آپ اتنے پڑھے لکھے' کوالیفائیڈ' ٹیکنیکل ہینڈ ہیں۔ آپ نے تو ابھی اپنے کیریئر کا آغاز کیا ہے اور آپ تو بہت آگے تک جا سکتے ہیں۔''

''میں تو ایسی بات کبھی زبان پر بھی نہیں لا سکتا شمس الدین صاحب۔'' فیضو نے مرتعش آواز میں کہا۔ ''نوکری بھی جائے گی اور ذلت ہوگی سوا لگ۔''

''دیکھیے سر' مانا کہ آپ میرے افسر ہیں اور مجھ سے بہت زیادہ پڑھے لکھے ہیں' لیکن میں عمر میں آپ سے دوگنا ہوں اور میرا تجربہ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ ایک بار ہمت کر کے تو دیکھیے۔''

''نہیں شمس الدین صاحب۔'' فیضو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہے میں اپنی نوکری سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔''

''اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں سر' میں بات کرتا ہوں۔'' شمس الدین نے کہا۔ ''اور میں کس طرح بات کروں گا' یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں آپ کی پوزیشن کو بالکل خراب نہیں ہونے دوں گا لیکن پہلے ایک بات اچھی طرح سے سوچ لیجیے سر.....''

''وہ کیا؟'' فیضو نے پوچھا۔

''وہ یہ کہ اگر معاملہ بن گیا تو پھر آپ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔'' شمس الدین نے کہا۔ ''اس صورت میں میرا منہ تو کالا ہوگا ہی' آپ کا بھی بہت نقصان ہوگا..... اس لیے اچھی طرح سوچ لیجیے' دادی صاحبہ سے بھی مشورہ کر لیجیے۔''

''نہیں..... دادی سے فی الحال اس معاملے پر بات کرنا غیر ضروری ہے۔'' فیضو نے کہا۔ ''اور جہاں تک میرے پیچھے ہٹنے کا تعلق ہے تو بھلا میں کیوں پیچھے ہٹوں گا؟ جب ایک

بار قدم آگے بڑھاؤں گا تو پوری طرح سے سوچ سمجھ کر ہی بڑھاؤں گا۔''

''جی ہاں..... اس بات کو یاد رکھئے گا کہ شادی بیاہ کے معاملات گڑیا گڈے کا کھیل نہیں ہوتے۔ یہ زندگی اور موت کے معاملات ہوتے ہیں۔ اس لیے خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔'' شمس الدین نے کہا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں شمس الدین صاحب۔'' فیضو نے کہا۔ ''جو کچھ ایک بار طے ہو جائے پھر اسی پر عمل ہونا چاہئے۔''

اس شام جب فیضو ناہید کو پڑھانے کے لیے اس کے بنگلے میں داخل ہوا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ خود اپنے بنگلے میں داخل ہو رہا ہے اور یہاں کی ایک ایک چیز اس کی اپنی ملکیت ہو اور صرف یہ بنگلہ ہی نہیں' بلکہ اس پوری فیکٹری میں یہاں کے سارے اثاثوں اور جائیداد میں اس کا حصہ اس کا منتظر ہو..... اس کے قدم زمین پر نہیں' آسمان پر تھے۔

اسے اپنا وسیع حقِ ملکیت دور دور تک موجیں مارتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس حق ملکیت کی مکمل تجسیم لنگڑی ناہید کی صورت میں اس کے سامنے موجود تھی' جس کے چہرے پر کھلی ہوئی مسکراہٹ فیضو کو ایک بہت بڑے خزانے کی کنجی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

آج پہلی بار فیضو نے اپنے اندر اتنی جرأت پیدا کی کہ ناہید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی ادا کے ساتھ مسکرا کر اسے دیکھا اور بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز میں اس کا حال چال پوچھا۔ ناہید تو جیسے کھل اٹھی اور مسکراہٹ کے نرم نرم پھول برساتی ہوئی اس سے لگاوٹ کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

''شمس الدین کامیاب ہوگا' شمس الدین کامیاب ہوگا۔'' فیضو نے جوشِ انبساط سے کانپتے ہوئے سوچا۔

تین دن گزر گئے۔ اس دوران فیضو کو یہ ہمت ہی نہیں پڑ سکی کہ وہ شمس الدین سے اس معاملے کی پیش رفت کے بارے مین کچھ پوچھ سکتا۔ شمس الدین نے خود بھی کوئی بات نہیں کی۔

فیضو کو کسی وقت ایسا لگتا تھا کہ جیسے خزانے کی وہ کنجی' جو اس کے ہاتھ لگنے والی تھی' راستے میں ہی کہیں گم ہو گئی ہے۔ اور اب وہ اس تک نہیں پہنچ سکے گی' تاہم' اسے مالکوں کے رویے میں اپنے لیے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اگر مالکوں نے اس بات کو ناپسند کیا ہوتا تو یقیناً اس کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں تو ہوتا' لیکن ایسا تو بالکل نہیں تھا اور ''آنٹی'' نے تو کل ہی خوبصورت نائم پیس تحفے میں دی تھی۔

فیضو شدید ترین ہیجان کے عالم سے گزر رہا تھا اس کی جذباتی کیفیت دگرگوں ہو رہی تھی۔ ایک پوری سلطنت اس کے ہاتھ آنے والی تھی۔ سیٹھ منصور علی کا داماد بن جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور فیضو کے لیے تو یہ ایسی بات تھی کہ جس کا وہ کبھی خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ویسے وہ خواب بہت کم دیکھتا تھا۔ وہ صرف ان چیزوں کے بارے میں سوچتا تھا جنہیں وہ ممکن الحصول سمجھتا تھا اور اسی لیے اس کی زندگی میں ناکامیوں کے دکھ کا گزر بہت کم تھا۔

چوتھے دن شمس الدین مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر کھیلتی ہوئی اس خوشگوار مسکراہٹ کو جو دیکھ کر فیضو کے وجود میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ایک بجلی تھی کہ سر سے پاؤں تک کوند گئی۔

''لیجئے سر' آپ تو خواہ مخواہ اس قدر گھبرا رہے تھے۔'' شمس الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایم ڈی صاحب اور ان کی میڈم تو اس بات سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ دونوں بیٹے بھی راضی ہیں۔ ان سب لوگوں کو کہنا ہے کہ انہیں ناہید بٹیا کے لیے آپ جیسے کسی لڑکے کی تلاش ہے۔ جس میں ذاتی لیاقت اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ شرافت اور نیک نیتی بھی ہو۔ میں نے آپ کو بتایا تھا' ناہید بٹیا کے لیے رشتے تو بہت آ رہے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تو لوگ صرف دولت کے لالچی ہیں۔ انہیں ناہید بٹیا سے نہیں' بلکہ ان کی دولت سے دلچسپی ہے۔ آپ تو ناہید بٹیا کو ذاتی طور پر اچھی طرح سے جان گئے ہیں۔ بس سر' سمجھ لیجئے کہ آپ کی زندگی بن گئی۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنا کر رکھیں گے۔ آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آپ کے لیے سب کچھ یہیں موجود ہے۔''

''تو..... تو گویا..... گویا یہ بات پکی ہو گئی؟''

فیضو نے تقریباً سرگوشی میں پوچھا۔ ''ان لوگوں نے مجھے قبول کر لیا ہے؟''

''ارے قبول کیوں نہیں کریں گے سر؟'' شمس الدین نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ خود کو کمتر کیوں سمجھتے ہیں؟''

''اور..... ناہید؟'' فیضو نے پوچھا۔

''ارے..... ان سے میڈم نے خود بات کر لی..... وہ تو آپ پر فدا ہو گئی ہیں سر۔'' اس نے شوخ انداز میں کہا۔ ''اب آپ یوں کیجئے کہ اپنی دادی کو ناہید بٹیا کے گھر بھیجئے۔''

''دادی کو.....؟'' فیضو کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

''جی ہاں دادی کو..... اور کس کو؟ آپ کے بڑوں میں تو صرف آپ کی دادی ہیں..... آپ کے والدین تو ہیں نہیں اور کوئی بڑا بھائی' بڑی بہن بھی نہیں ہے۔''

''جی ہاں.....''فیضو نے جلدی سے کہا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں.....میرے بزرگوں میں بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ سارے رشتے داروں میں لے دے کر صرف ایک دادی ہی ہیں۔''

''آپ کے شاید کوئی اور رشتے دار بھی تو ہیں جو سعود آباد میں ہی رہتے ہیں اور آپ کے گھر یہاں بھی آتے تھے.....فاخرہ بتا رہی تھی ان لوگوں کی ایک بیٹی غالباً میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے۔''

''وہ.....وہ ہمارے رشتہ دار نہیں ہیں' شمس الدین صاحب!''فیضو نے جلدی سے کہا۔''وہ لوگ سعود آباد میں ہمارے پڑوسی تھے' اچھے لوگ ہیں' ہم لوگوں سے ان کا میل جول ہے۔''

''میل جول تو سبھی سے رکھنا چاہئے سر!''شمس الدین نے بزرگانہ اور ناصحانہ انداز میں کہا۔''میل جول سے انسان کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ مدد مل جاتی ہے.....خیر تو سر.....اب آپ جلدی سے اپنی دادی کو وہاں لے جانے کا بندوبست کیجئے' آپ کی دادی ان لوگوں سے مل کر باقاعدہ آپ کا پیغام دیں.....سب کچھ بالکل اسی طرح ہونا چاہئے جیسا کہ قاعدہ ہے' پیغام تو ہمیشہ لڑکے والوں کی طرف سے ہی جاتا ہے۔''

''جی ہاں.....جی ہاں۔''فیضو نے جلدی سے کہا۔''وہ مجھے معلوم ہے۔''

''آپ دادی سے بات کر لیجئے اور انہیں بتا دیجئے۔''شمس الدین نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''فیضو نے کہا۔''میں دادی سے بات کروں گا' پھر آپ کو بتاؤں گا کہ وہ کس دن آئیں گی۔''

''بس ایک آدھ روز میں ہی آ جائیں۔''شمس الدین نے کہا۔''نیک کام میں بھلا دیر کاہے کو اور پھر اس قسم کے معاملات تو جس قدر جلد طے ہو جائیں' اتنا ہی اچھا ہے۔''

''جی.....جی.....!''فیضو نے کہا۔

فیضو کو معلوم تھا کہ اب اس کام کے سب سے زیادہ مشکل اور جان لیوا مرحلے سے گزرنا ہے۔

دادی بے چاری کو تو ان ساری باتوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا' ابھی پرسوں ہی رات کو وہ فیضو سے کہہ رہی تھیں کہ وہ اتنے بڑے گھر میں دن بھر اکیلی کیا کریں' کوئی پاس پڑوس بھی ایسا نہیں تھا جہاں کی عورتوں سے ان کا ملنا جلنا رہتا۔ انہوں نے فیضو سے کہا تھا کہ وہ اب جلد سے جلد شادی کی تاریخ کے بارے میں فیصلہ کرے تاکہ اس کا گھر بھی آباد ہو

جائے اور انہیں اس تکلیف دہ تنہائی سے نجات مل سکے۔ فیضو یہ کہہ کر صاف ٹال گیا تھا کہ ابھی اسے کوئی جلدی نہیں ہے کیونکہ ابھی اس کی دفتری مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔

لیکن اب دادی سے دوٹوک بات کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ فیضو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ دادی پر اس خبر سے قیامت گزر جائے گی اور وہ ہرگز اس بات کے لیے تیار نہیں ہوں گی کہ شاکرہ سے بات چیت توڑ دی جائے۔ اس معاملے میں کوئی مضبوط اور بہت اچھی طرح سے سوچی سمجھی حکمتِ عملی اختیار کرنے کی ضرورت تھی' کیونکہ خواہ کچھ بھی ہو جائے' وہ اس نادر موقع سے خود کو محروم نہیں کر سکتا تھا' جو تقدیر نے محض اتفاق سے اسے عطا کر دیا تھا' دادی چاہے مانیں یا نہ مانیں.....یہ شادی تو بہر حال ہونی تھی۔

ٹھیلا لے کر گلی گلی آواز لگانے والے سبزی فروش کی لڑکی سے ایک بہت بڑے صنعت کار کی بیٹی تک رسائی کا راستہ فیضو نے اس قدر آسانی کے ساتھ طے کر لیا تھا کہ اس کو اب یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے' لیکن ایسا ہو چکا تھا اور اب جبکہ لکھ پتی صنعت کار کی بیٹی اپنی بانہیں پھیلائے اس کے سامنے کھڑی تھی تو وہ ایک سبزی فروش کی بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا.....شوکت چچا بے چارے تو منصور علی کے پاؤں کی دھول بھی نہیں تھے۔

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے دادی سے مصلحت آمیز لیکن فیصلہ کن طریقے سے بات کا آغاز کیا۔ دادی کو معلوم تھا کہ فیکٹری کے مالک کی ایک بیٹی بھی ہے لیکن انہوں نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا اور نہ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتی تھیں' سوائے اس کے کہ وہ کالج میں پڑھتی ہے۔ انہوں نے اس کے بارے میں جاننے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی کیونکہ انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' مالک لوگوں سے ذرا دور ہی رہنا چاہئے۔

''دادی.....تم کو ایک بہت بڑی خوشخبری سنانی ہے۔''فیضو نے کہا۔''ایسی خوشخبری کہ تم کو یقین نہیں آئے گا اور تم اچھل جاؤ گی.....ہماری تو قسمت کا ستارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا دادی.....!''

''اے سچ.....؟'' دادی کی حیرت آمیز آواز میں معصومیت اور سچائی کا رنگ گھلا ہوا تھا۔''اے جلدی بتاؤ بیٹا! کیا بات ہے؟''

''وہ.....فیکٹری میں سپر وائزر ہیں شمس الدین' میرے ماتحت ہیں' پرانے آدمی ہیں اور مالکوں کے بہت قریب ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مالک لوگ ہمیں اپنے خاندان میں شامل کر لینا چاہتے ہیں۔''

''کیا مطلب .....؟'' دادی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''خاندان میں شامل کر لینا چاہتے ہیں؟ وہ کس طرح؟ ہمارا ان کے خاندان سے کیا تعلق.....؟''

''دادی.....! تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ فیکٹری کے مالک منصور علی کی ایک بیٹی ہے' اس کا نام ناہید ہے اور وہ کالج میں پڑھتی ہے۔''

''ہاں.....! ہم نے سنا تو ہے۔'' دادی ایک دم سنبھل گئیں' انہیں اپنے دماغ کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹیاں بجتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں' ان کے چہرے پر سختی آ گئی تھی۔

''ہم نے اسے کچھ دن پڑھایا تھا۔'' فیضو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ان لوگوں کو ہمارا پڑھانا بہت پسند آیا اور ہمیں تو مالک لوگ پہلے ہی سے بہت پسند کرتے تھے۔ اب مالکوں نے شمس الدین کے ذریعے کہلوایا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ہمارے ساتھ کرنا چاہتے ہیں .....مجھے تو.....''

''تو.....تم نے ان کو بتایا نہیں کہ تمہاری بات تو برسوں پہلے طے ہو چکی ہے؟'' دادی نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ارے کمال کرتی ہو دادی.....!'' فیضو نے کہا۔ ''ذرا سوچو مالک کی بیٹی.....کیا کچھ نہیں ملے گا دادی.....! ارے ہمیں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہمارے دن پھیر دیئے اور ہمیں.....!''

''اے تم کچھ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' دادی نے ایک بار پھر اس کو مزید بولنے سے روک دیا۔ ''کچھ مت ماری گئی ہے تمہاری؟ شاکرہ کے ساتھ تمہارا رشتہ برسوں پہلے طے ہے' ارے ہم شوکت حسین اور شمسن کو زبان دیئے بیٹھے ہیں اور جو کچھ کیا تھا' تم سے پوچھ کر کیا تھا' کوئی زبردستی تو رشتہ طے نہیں کیا تھا ہم نے.....؟''

''ان پرانی باتوں کو چھوڑو دادی اور نئے حالات کو دیکھو۔ ایک سے ایک مالدار لڑکوں کے رشتے آ رہے ہیں ناہید کے لیے لیکن اس کے والدین نے ان سارے رشتوں کو مسترد کر دیا ہے.....وہ چاہتے ہیں کہ ناہید کی شادی مجھ سے ہو۔ وہ سب لوگ مجھے اتنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ میری اتنی کم حیثیت کے باوجود مجھے اپنے گھر کا داماد بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو خوش ہونا چاہئے کہ انہوں نے ہمیں اس قابل سمجھا ہے۔''

''اچھا چلو ہم تو خوش ہو لئے۔'' دادی نے ماتھے پر ستر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس بدنصیب کا کیا ہوگا جو تمہارے نام پر بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ کس کی جان کو روئے گی؟''

''ارے کوئی کسی کی جان کو نہیں روتا دادی.....!'' فیضو نے لاپرواہی کے ساتھ

کہا۔ ''پڑھی لکھی لڑکی ہے' پڑھ رہی ہے' ہو جائے گی اس کی بھی کہیں نہ کہیں شادی کوئی نہ کوئی اچھا لڑکا اس کو مل سکتا ہے۔''

''ایسا مت کرو فیضو!'' دادی ایک دم بلبلا کر رونے لگیں۔ ''ہم شوکت حسین اور شمسن کو زبان دے چکے ہیں' تم بڑھاپے میں کیوں ہمارا منہ کالا کروانا چاہتے ہو؟ ہماری سفیدی میں کیوں سیاہی لگوانا چاہتے ہو؟''

''تمہارا تو بڑھاپا ہے دادی' لیکن ہمارا تو بڑھاپا نہیں ہے۔'' فیضو نے سرد اور خشک لہجے میں کہا۔ ''ہمیں تو ابھی بہت دن جینا ہے' پوری زندگی پڑی ہوئی ہے ہمارے سامنے..... قسمت ایسے موقعے بار بار نہیں دیتی دادی! اگر ہم نے یہ موقع گنوا دیا تو زندگی بھر پچھتائیں گے۔''

''تو کیا ہم شوکت حسین اور شمسن کو دانت دکھا دیں؟'' دادی نے روتے ہوئے کہا۔

''اس میں کون سی انوکھی بات ہے دادی؟'' فیضو نے کہا۔ ''کیا دنیا میں رشتے ٹوٹتے نہیں ہیں؟ ارے ہزاروں رشتے لگتے ہیں اور بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی قیامت تو نہیں آ جاتی۔ اب ایسا تھوڑی ہے کہ اگر ایک بار رشتہ طے ہو گیا تو وہ پتھر کی لکیر ہو گیا.....تم ان لوگوں سے کہہ سکتی ہو کہ.....!''

''نہیں' نہیں.....ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' دادی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم کچھ نہیں کہیں گے۔''

''اچھا تو پھر ہم اس نوکری پر لات مار دیتے ہیں دادی!'' فیضو نے غصے میں چلا کر کہا۔ ''سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں' یہ نوکری بھی' یہ مکان بھی' یہ سب کچھ اور ایک بار پھر سعود آباد کے کوارٹر میں واپس چل کر تم آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر دو دو پیسے کے لیے تیرے میرے کپڑے سینا اور ہم پڑھانے کی دکان کھول کر بیٹھ جائیں گے.....اس صورت میں صرف یہی ہو سکتا ہے کیونکہ ہمارے انکار کے بعد ہمارے لیے یہاں نوکری کا جاری رکھنا ممکن نہیں ہوگا' یہ لوگ ہمیں لات مار کر نکال باہر کریں گے.....وہ سب کچھ چھین لیں گے جو انہوں نے ہمیں دے رکھا ہے۔''

دادی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک کرسی پر گر کر دوپٹے سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا' وہ مسلسل رو رہی تھیں' فیضو دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

''یہ تو ایک بار ہونا ہی تھا۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''جب بھی ان کو اس واقعہ کی اطلاع ملتی تو یہی ہونا تھا.....اچھا ہے آج ہی ہو گیا.....اب آگے کی سوچنا ہے۔''

فی الوقت دادی کے لیے اتنی ہی ڈوز کافی تھی' بات دادی کے علم میں آ گئی تھی اور ساتھ ہی اس کا یہ فیصلہ بھی کہ وہ پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں۔ اب باقی باتیں دادی سے بعد میں ہو سکتی تھیں۔ فیضو کو بہت سنبھل سنبھل کر چلنا تھا' آخر دادی کو ناہید کے گھر تو لے کر جانا ہی تھا لیکن اگر وہ بالکل ہتھے سے اکھڑی رہتیں تو پھر ان کو نظر انداز کر کے کوئی اور متبادل راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا تھا۔ فیضو کے ذہن میں کئی منصوبے تھے لیکن ابھی ذرا انتظار کرنا تھا۔

اگلے روز شام کو فیضو نے دادی کے ساتھ بات چھیڑی۔ اس نے دادی کو اتنا موقع دے دیا تھا کہ وہ صورت حال کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔

''وہ لوگ چاہتے تھے کہ تم ان کے گھر آ کر باقاعدہ پیغام دو جیسا کہ قاعدہ ہے۔'' اس نے دادی سے کہا۔ ''آخر لڑکی والوں کے ہاں بزرگ ہی تو لڑکے کا پیغام لے کر جاتے ہیں۔ اب یہ کام تمہیں کرنا ہے دادی.....!''

''نا بھیا نا.....!'' دادی نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو جہاں پیغام دینا تھا دے چکے اور وہاں پیغام بھی منظور ہو گیا۔ جب سب کچھ طے ہو چکا پوری طرح سے تو اب ہم دوسری جگہ پیغام لے کر.....؟ نہیں.....! یہ ہم سے نہیں ہو سکے گا۔''

''دادی بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' فیضو نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ شادی تو ہونی ہی ہے۔ ہم اس طرح سے بھری تھالی میں لات نہیں مار سکتے' خدا نے ہمیں یہ موقع دیا ہے تو ہم اس کی ناشکری کیوں کریں؟ اور تم شوکت چچا اور شمسن چچی سے اتنا ڈرتی کیوں ہو' ارے بھئی کوئی زبردستی تھوڑی ہے؟ کوئی منگنی ہوئی تھی' نہ کوئی نکاح ہوا تھا' کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا بس ایک زبانی بات چیت ہی تو تھی۔''

''ارے وہی تو سب سے بڑی چیز ہے۔'' دادی نے کہا۔ ''ارے اس چمڑے کی زبان سے ہی تو لوگ بیٹا' بیٹی ہار جاتے ہیں۔''

''کوئی نہیں ہارتا دادی!'' فیضو نے خشک اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ میں ان لوگوں سے کس روز کا کہوں۔ شمس الدین مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں اپنی دادی کو لے کر کب آ رہا ہوں تاکہ وہ ان لوگوں کو پہلے سے بتا سکیں۔''

اس رات فیضو اور دادی میں خاصی دیر تک تلخ کلامی ہوتی رہی۔ دادی کسی طرح رشتہ لے کر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں' وہ برابر روئے جا رہی تھیں اور شدید غم و غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔

بالآخر طویل بحث و مباحثے اور جھگڑے کے بعد ان کے درمیان چند نکات پر ایک

سمجھوتہ ہو گیا۔ یہ طے پایا کہ رشتہ تو جانے کے بارے میں فیضو خود شوکت حسین اور شمسن کو بتائے گا اور دادی کو ملوث کیے بغیر اس امر کا اعتراف کرے گا کہ یہ اس کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔

یہ کہ دادی فیضو کے ساتھ ناہید کے گھر جائیں گی لیکن وہ خود اپنی زبان سے رشتہ نہیں مانگیں گی۔ فیضو کے بزرگ کی حیثیت سے شمس الدین رشتہ مانگے گا اور دادی صرف اس بات کی تائید میں گردن ہلاتی رہیں گی۔

یہ کہ دادی ان لوگوں کو شاکرہ کے ساتھ فیضو کے رشتے کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گی اور اگر ان لوگوں کو کسی اور ذریعے سے اس رشتے کے بارے میں پتہ بھی چل گیا تو دادی یہی کہیں گی کہ یہ رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

یہ کہ شادی ہو جانے کے بعد دادی یہاں نہیں رہیں گی بلکہ واپس سعود آباد کے کوارٹر میں چلی جائیں گی جہاں وہ اکیلی رہیں گی یا وہیں کے کسی جاننے والے کو ساتھ رکھ لیں گی۔

فیضو پوری طرح مطمئن تھا' خاص طور پر آخری نکتہ تو بہت ہی اچھا تھا۔ دادی اس کے میلے کچیلے ماضی کا ایک پھٹا پرانا لباس تھیں اور وہ اس لباس کو جلد از جلد اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ نہ جانے دادی کب اور کس وقت ناہید یا اس کے گھر والوں کے سامنے کون سا پرانا اور رسوا کن قصہ لے کر بیٹھیں..... گجر نالہ کی بستی میں ذلت اور رسوائی میں گزارے ہوئے روز و شب کا کوئی قصہ' غربت کی گہری دھند میں لپٹی ہوئی زندگی کی کسی اداس اور نیم مردہ ساعت کا کوئی قصہ..... اس کے پاس ایسے قصوں کی کوئی کمی تو نہیں تھی' تاہم انہوں نے اماں یا ابا کی نازیبا حرکتوں کے بارے میں کبھی بھی کسی غیر متعلق شخص سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

اب فیضو کو شمس الدین کو شیشے میں اتارنا تھا' لیکن اس کے لیے اسے ذرا سی بھی محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ شمس الدین خود بہت سمجھدار اور چالاک آدمی تھا۔

''دادی پرانے وقتوں کی ہیں اور بالکل اَن پڑھ ہیں۔'' فیضو نے معذرت خواہانہ انداز میں شمس الدین سے کہا۔ ''وہ سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ دادی ان سے ٹھیک سے بات نہیں کر پائیں گی' اس معاملے میں آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس معاملے میں ذرا ہماری مدد کریں۔''

''ارے سر.....! آپ حکم دیجیے۔'' شمس الدین نے فوری آمادگی کے ساتھ کہا۔ ''آپ مجھ سے درخواست کیوں کرتے ہیں؟ میں تو ہر خدمت کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں شمس الدین صاحب کہ ہماری طرف سے آپ بات کریں۔'' فیضو نے کہا۔ ''دادی ہمارے ساتھ موجود ہوں گی' جو کچھ آپ کہیں گے' وہ اس کی تائید کریں گی۔''

''اس میں بھلا کیا مشکل ہے؟'' شمس الدین نے ہنس کر کہا۔ ''میں ساری بات کرلوں گا' دادی صرف میری ہاں میں ہاں ملاتی رہیں۔''

''بہت بہت شکریہ شمس الدین صاحب!'' فیضو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے میری بہت بڑی مشکل آسان کردی۔ اصل میں دادی بے چاری ان لوگوں سے ٹھیک سے بات نہیں کرپائیں گی۔''

''میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔'' شمس الدین نے کہا۔

دو دن کے بعد فیضو شام کے وقت اپنی دادی کو لے کر سیٹھ منصور علی کے بنگلے پر پہنچا۔ بنگلے کے اندرونی دروازے پر منصور علی اور رابعہ بیگم نے بہ نفس نفیس مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور فیضو پر ایک زبردست انبساط آفرین نشے کی کیفیت طاری ہوگئی..... اس کے درجات کس قدر بلند ہوگئے تھے' ایم ڈی صاحب اور ان کی بیگم' اس کے اور اس کی دادی کے خیر مقدم کے لیے خود موجود تھے۔

شمس الدین' فیضو اور دادی کے ساتھ ہی آیا تھا۔ وہ ''لڑکے والوں'' میں شامل تھا اور ان کی جمعیت کا ایک حصہ تھا۔

وسیع و عریض اور نہایت بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ ڈرائنگ روم میں جا کر دادی کچھ حواس باختہ ہوگئی تھیں۔ یہاں آتے ہی انہیں گھبراہٹ اور اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی اور وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ اگر وہ اس جگہ ہونے کے بجائے شوکت حسین اور شمسن کے سعود آباد والے کوارٹر میں بیٹھی ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہاں کی تو ہر چیز اپنی تھی' لوگ اپنے تھے مگر یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس طلسمی ماحول میں جب اشیائے خورد و نوش سے بھری ہوئی ٹرالی مہمانوں کے سامنے لائی گئی تو دادی اور بھی زیادہ پریشان ہوگئیں۔ وہ اس طرح کی محفلوں میں کھانے پینے کے آداب سے قطعی طور پر ناواقف تھیں۔ میزبانوں کے بہت زیادہ اصرار کے باوجود انہوں نے ایک پیالی چائے کے علاوہ کچھ نہیں لیا' بڑے لوگوں کی محفل تھی' نہ جانے کون سی غلطی ہوجائے اور بعد میں یہ لوگ مذاق اُڑانا شروع کردیں۔

شمس الدین نے بڑی وضاحت کے ساتھ دادی کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے پوتے فیضان علی کے لیے منصور علی اور رابعہ بیگم کی بیٹی ناہید کا رشتہ مانگا اور تائید طلب نظروں سے دادی کی طرف دیکھا' دادی نے جلدی سے گردن ہلادی۔

منصور علی کے دونوں بیٹے بھی بعد میں آگئے تھے۔ گھر کے سب لوگ موجود تھے سوائے ناہید کے..... دادی کو ناہید کو دیکھنے کا بڑا تجسس تھا لیکن ان کا یہ حوصلہ نہ ہوا کہ وہ میزبانوں

سے یہ کہیں کہ وہ لڑکی کو بلائیں۔

یہ طے ہوگیا کہ اتوار کے دن منگنی کی رسم ادا کردی جائے اور شادی تقریباً چھ ماہ کے بعد اس وقت جب ناہید اپنے امتحانات سے فارغ ہوچکی ہو..... وہ لوگ آپس میں ہی باتیں طے کرتے رہے اور دادی خون روتے ہوئے دل کے ساتھ صرف تائید میں گردن ہلاتی گئیں۔ اس سارے عمل کے دوران انہیں کہیں بھی اپنائیت اور حقیقی یگانگت کا کوئی عنصر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ انہیں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ایسی تقریب میں ایک مہمان کے طور پر شریک ہیں جس کا ان سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔

دادی' فیضو کے ساتھ واپس گھر آگئیں۔ ان کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

''دیکھا تم نے دادی؟'' فیضو نے دادی کو رجھانے کی کوشش کی۔ ''ان لوگوں کا رہن سہن دیکھا تم نے دادی! کیا بادشاہوں کی سی زندگی ہے اور اب یہی زندگی ہم کو بھی ملے گی دادی! ہم کو بھی..... تم کو بھی!''

''ہاں بھیا!'' دادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''تمہیں یہ نئی زندگی مبارک ہو۔ ہم تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کررہے ہیں' لیکن ہم تمہارے ساتھ چل نہیں سکتے۔ ہمیں وہیں سعود آباد کے کوارٹر میں چھوڑ آنا۔''

فیضو تو دادی کی اس خواہش کو پورا کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا۔

''اور اب ایسا کرو کہ شوکت حسین اور شمسن کو بتادو۔'' دادی نے کہا۔ ''اے ہاں! وہ اب کاہے کو بلاوجہ آسرے میں رہیں کہ ان تلوں میں اب تیل نہیں رہا ہے تاکہ وہ پھر کوئی اور گھر دیکھیں۔''

''بتادیں گے دادی.....! بتادیں گے۔'' فیضو نے لاپرواہی سے کہا۔ ''ایسی کیا مصیبت ماری جارہی ہے۔''

شوکت چچا اور شمسن چچی کو اس بارے میں بتانے کے لیے فیضو کو ایک کڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا اور وہ اس سے اس وقت تک بچنا چاہتا تھا جب تک کہ ممکن ہو' لیکن حالات نے بالکل ہی دوسرا رخ اختیار کرلیا۔

فیضو اور ناہید کی منگنی مقررہ تاریخ کو انجام پائی۔ فیضو کی طرف سے اس رسم میں صرف دو مہمان تھے' دادی اور ان کے علاوہ شمس الدین جو لڑکے والوں کی نمائندگی کررہا تھا۔ البتہ لڑکی والوں کی طرف سے کافی لوگ تھے۔ ناہید کے گھر والے دولہا کا مہمانوں سے تعارف کراتے ہوئے اس کی تعلیمی قابلیت کا حوالہ ضرور دیتے تھے' دادی ایک کمرے میں گم صم

خاموش بیٹھی تھیں، فیضو نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

اس روز دادی نے پہلی بار دلہن کو دیکھا اور اسے بے حد معمولی شکل وصورت کا پایا۔ اس کے مقابلے میں شاکرہ تو جیسے سچ مچ چاند کا ٹکڑا تھی۔

اور اس وقت تو ان پر جیسے بجلی گر پڑی جب انہوں نے دلہن کو چلتے ہوئے دیکھا..... دلہن لنگڑی تھی۔

ان کے دل ودماغ میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔ فیضو کو لازماً یہ بات معلوم ہوگی کہ لڑکی لنگڑی ہے اور پھر بھی اس نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

گھر واپس آتے ہی دادی، فیضو پر برس پڑیں۔

''تم نے بتایا ہی نہیں کہ وہ لڑکی لنگڑی ہے؟'' دادی نے سخت غم وغصے کے عالم میں کہا۔ ''اگر ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا تو.....''

''اس میں کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے دادی!'' فیضو نے ان کی بات کاٹتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ ''ہاں اس کے پیر میں تھوڑا سا لنگ ہے۔ جلد ہی آپریشن ہونے والا ہے اس کے بعد یہ خرابی ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گی۔''

''ذرا سا لنگ ہے۔'' دادی نے اس کے بیان کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''اے پورا ایک طرف کو دہری ہو کر چلتی ہے، ٹوٹی ہوئی ڈالی کی طرح..... تمہیں معلوم تھا اس میں یہ خرابی ہے اور پھر بھی تم.....!''

''وہ ایک لنگڑی ہزاروں دو ثابت ٹانگوں والیوں پر بھاری ہے دادی!'' فیضو نے کہا۔ ''یہ بھی تو دیکھو وہ کس خاندان سے!'' دادی بڑی دیر تک آپ ہی آپ کچھ بڑبڑاتی رہیں لیکن فیضو نے ان کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

☆======☆======☆

ایم ڈی صاحب کی بیٹی کی کوالٹی کنٹرول آفیسر فیضان علی کے ساتھ منگنی کی خبر ساری فیکٹری کے لوگوں میں پھیل گئی۔ اس خبر کو چھپانے کی قطعی کوشش نہیں کی گئی تھی بلکہ اکثر کارکنوں کو تو منگنی سے پہلے ہی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ان دونوں کی منگنی ہونے والی ہے اور جب یہ منگنی ہوگئی تو پھر سب ہی کو معلوم ہوگیا۔ ان لوگوں میں فیکٹری میں کام کرنے والا ایک مزدور آفتاب بھی شامل تھا۔ آفتاب خود تو لانڈھی میں رہتا تھا لیکن اس کی ایک بہن جمیلہ اپنے میاں قربان بیگ کے ساتھ سعود آباد میں رہتی تھی اور ان لوگوں کے شوکت حسین کے خاندان سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ آفتاب اکثر اپنی بہن بہنوئی سے ملنے کے لیے وہاں

جایا کرتا تھا اس روز بھی وہ اپنی بہن کے گھر گیا تھا۔

پچھلے دنوں پڑوس کی ایک لڑکی بس سے گر گئی تھی اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ باتوں باتوں میں اس حادثے کا ذکر نکل آیا تھا اور جمیلہ اس بات پر اظہار افسوس کر رہی تھی کہ نہ جانے بے چاری کی ٹانگ ٹھیک ہوگی یا نہیں! اگر وہ لنگڑی ہوگئی تو پھر اس کی شادی بھی کہیں نہیں ہو سکے گی۔

''قسمت ہونی چاہئے آپا!'' آفتاب نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنی بہن سے کہا۔ ''ہماری فیکٹری کا جو مالک ہے نا اس کی بیٹی بھی لنگڑی ہے اور ابھی چند دن پہلے اس کی منگنی فیکٹری کے ایک نوجوان افسر سے ہوئی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس کی شادی ہے۔ وہ آدمی پہلے اپنی دادی کے ساتھ یہیں کہیں سعود آباد میں رہتا تھا۔ اب تو بھئی بڑے ٹھاٹھ ہیں اس کے..... دفتر کی طرف سے شاندار بنگلہ بھی ملا ہوا ہے۔''

یہ حوالہ سن کر جمیلہ کا ماتھا ذرا ٹھنکا۔ ''کیا نام ہے تمہارے افسر کا؟'' اس نے اپنے بھائی سے پوچھا۔

''فیضان علی۔'' آفتاب نے جواب دیا۔ ''بس وہ اور اس کی دادی..... دو افراد ہیں، ماں باپ اس کے مر چکے ہیں۔''

آفتاب کے جانے کے فوراً بعد جمیلہ اور قربان بیگ، شوکت حسین کے گھر پہنچے۔ ان لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ شوکت حسین اور شمسن کی بڑی بیٹی شاکرہ کی بات چیت ان کے پڑوسی فیضان علی عرف فیضو کے ساتھ عرصے سے طے ہے۔ جمیلہ نے اپنے بھائی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس سے اس منگنی کے بارے میں ساری تفصیلات معلوم کر لی تھیں اور اس امر کا یقین حاصل کر لیا تھا کہ یہ وہی فیضان علی ہے جو اپنی دادی کے ساتھ شوکت حسین کے برابر والے کوارٹر میں رہتا تھا اور سال بھر سے کچھ کم عرصہ پہلے اسے لانڈھی میں نوکری مل گئی تھی اور وہ اپنی دادی کے ساتھ دفتر سے ملنے والے مکان میں لانڈھی منتقل ہو گیا تھا۔

''اے شمسن..... یہ بتاؤ کہ فیضو اور اس کی دادی سے تم لوگوں کی کب سے ملاقات نہیں ہوئی؟ کچھ خیر خبر ہے ان لوگوں کی؟'' جمیلہ نے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' شمسن نے گھبرا کر کہا۔ ''کوئی مہینہ بھر پہلے تو ہم گئے تھے اُدھر..... کیوں؟ کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟''

''اے وہ آفتاب ہے نا ہمارا چھوٹا بھائی۔'' جمیلہ نے کہا۔ ''وہ اسی فیکٹری میں کام کرتا ہے جس میں فیضو کو نوکری ملی ہے۔ وہ ابھی آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ فیضو کی فیکٹری کے

مالک کی لنگڑی بیٹی سے منگنی ہوگئی ہے۔"

"اے ہے کیا کہہ رہی ہو جمیلہ آپا!" شمسن اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ "اے آفتاب کچھ پاگل تو نہیں ہوگیا ہے؟ کیا واہی تباہی بک رہا ہے؟"

"شمسن..... جلدی سے وہاں جاؤ۔" جمیلہ نے کہا۔ "آفتاب پاگل نہیں ہے۔ وہ فیضو کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا کہ وہ پہلے یہاں کہاں رہتا تھا اور اس کا کسی سے رشتہ طے تھا۔ ہم نے اسے کچھ بتایا بھی نہیں۔"

"یا اللہ..... ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" شمسن کی آواز بھرا گئی۔ "فیضو ایسا کیسے کرسکتا ہے؟"

"ارے لالچ بری بلا ہے شمسن!" قربان بیگ نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "تم اس چکر کو چھوڑو کہ آفتاب صحیح کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے۔ خود فوراً وہاں جاؤ اور فیضو کی دادی سے پوچھو اصلیت کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر سمجھ لو کہ فیضو نے دولت کے لالچ میں اپنے آپ کو لنگڑی دلہن کے ہاتھ بیچ دیا۔"

"خدا نہ کرے ایسا ہو بھیا!" شمسن نے لرز کر کہا۔ "ہم کل ہی جائیں گے۔"

شاکرہ کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی طاری تھی جو کچھ اس نے سنا تھا' اس پر اس کو یقین نہیں آرہا تھا..... کیا فیضو ایسا بھی کرسکتا ہے؟

"اگر فیضو نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا تو ہم اسے کبھی معاف نہیں کریں گے آپا!" مسعودہ نے غصے کے عالم میں دانت پیستے ہوئے اپنی بڑی بہن سے کہا۔ "یہ مرد ذات..... یہ ہوتی ہی کمینی ہے۔"

"کیوں بے وقوفی کی باتیں کررہی ہو؟" شاکرہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "کچھ لوگ کمینے ضرور ہوتے ہیں ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے ہیں' خدا جانے حقیقت کیا ہے۔"

اس رات گھر میں شدید ماتمی فضا طاری رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں کسی کی موت واقع ہوگئی ہے..... کسی نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔

"لگتا ہے اونچی جگہ ہاتھ مارنے کی کوشش میں اپنی اوقات بھول گیا ہے وہ۔" شوکت حسین نے آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن وہ اپنے صدمے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلے دن شوکت حسین اور شمسن' مسعودہ کے ساتھ فیضو کے گھر پہنچے۔ دادی گھر میں

اکیلی تھیں۔ فیضو دفتر میں تھا۔ ان لوگوں نے دادی کی صورت دیکھی اور بات تقریباً ان کی سمجھ میں آگئی۔ دادی ان لوگوں کو ایک ساتھ دیکھ کر پہلے کی طرح بے انتہا خوش ہونے کی بجائے ایک دم پریشان ہوگئی تھیں' ان کے چہرے پر پہلے ہی ویرانی برس رہی تھی جس میں اب اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ انہوں نے اپنی گدلی گدلی آنکھوں سے مہمانوں کو دیکھا۔ "ارے تم لوگ اس وقت..... آؤ آؤ بیٹھو۔" دادی کی آواز گرم جوشی سے بالکل خالی تھی۔

"سب خیریت تو ہے فخرن خالہ؟" شمسن نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "تم اور فیضو ٹھیک تو ہونا؟"

"ہاں..... ہاں.....!" دادی نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں جواب دیا۔ "ہم لوگ..... ہاں ٹھیک ہیں..... ٹھیک ہیں۔" دادی کی آواز ان کے الفاظ کی مخالفت پر کمربستہ تھی۔

"ہم نے کچھ عجیب سی باتیں سنی ہیں فخرن خالہ!" شمسن نے شدید اضطراب کے عالم میں مزید وقت ضائع کئے بغیر تیزی سے کہا۔ "یہ..... فیضو کی فیکٹری کے مالک کی لنگڑی بیٹی کا کیا چکر ہے؟"

دادی کے چہرے پر مردنی چھا گئی اور اگلے ہی لمحے انہوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔

"ارے ہمارے منہ پر سو جوتے مارلو شمسن!" دادی نے زاروقطار روتے ہوئے کہا۔ "ہم ہیں اسی قابل..... ہم تمہارے قصوروار ہیں شمسن..... ہم نے تو بہت کوشش کی مگر ان لوگوں نے لگتا ہے فیضو کو اُلو کا گوشت کھلا دیا ہے' جادو کی چھڑی گھما دی ہے' فیضو نہیں مانے..... وہ ان لوگوں کے بھرے میں آگئے۔"

"تو کیا..... کیا! اب فیضو کی شادی.....؟" شمسن اپنی بات ٹھیک سے نہیں کہہ پارہی تھی۔

"فیضو کی شادی طے ہوگئی ہے۔" دادی نے آہستہ سے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ وہاں شادی نہیں کریں گے تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔"

"اور ہمارا کیا ہوگا فخرن خالہ؟" شوکت حسین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمارے منہ پر جو کالک لگے گی' اسے کون دھوئے گا؟ ہماری لڑکی پر جو گالی چڑھ گئی ہے' وہ کیسے اُترے گی فخرن خالہ؟"

دادی رو رہی تھیں' گڑگڑا رہی تھیں' وہ فیضو کی قطعی مدافعت نہیں کررہی تھیں' وہ صرف اپنے آپ کو مجبور' بے بس اور بے قصور ظاہر کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔

اسی وقت دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے فیضو بھی گھر آ گیا اور اس نے غیر متوقع طور پر ان لوگوں کو یہاں موجود پایا۔ دادی کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا گویا آنے والوں کو سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ فیضو سنبھل گیا۔

''ارے..... ہم تو خود تمہاری طرف آنے والے تھے۔'' اس نے سلام دعا کے بعد شوکت حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بتانے کے لیے کہ تم ہماری بیٹی کی بجائے کسی مالدار لنگڑی لڑکی کے ساتھ شادی کر رہے ہو؟'' شوکت حسین نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''بات کو سمجھنے کی کوشش کرو شوکت چچا!'' فیضو نے مستحکم آواز میں کہا۔ ''بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ ہماری فیکٹری کے مالک خود ہمیں اپنا داماد بنانا چاہتے ہیں تو ہم کیسے انکار کر دیں؟ ہم نے اس نئے رشتے کو قبول کر لیا ہے اور تم شاکرہ کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کر لو۔''

وہ لوگ فیضو کے اس لب و لہجے پر حیران رہ گئے۔ اس کی گفتگو میں معذرت' تاسف' پشیمانی یا دل جوئی کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں تھا۔ بڑا سفاک اور دوٹوک انداز تھا۔ اس نے اپنی زبان کی تلوار سے آن کی آن میں ان سب لوگوں کے ٹکڑے اُڑا کر رکھ دیئے تھے۔

''تم سے ایسی نیچ حرکت کی امید تو نہیں تھی فیضو!'' شوکت حسین نے شدید غم و غصے کے عالم میں کہا۔ ''ارے ہم نے تو تمہیں اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا' کیا کچھ نہیں کیا تمہارے لیے..... ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تمہاری آنکھ میں سؤر کا بال ہے۔''

''وہ سچ کہا ہے بڑوں نے اصل سے خطا نہیں' کم اصل سے وفا نہیں۔'' شمسن نے سخت کڑوے لہجے میں کہا۔ ''تم نے خوب صلہ دیا ہے ہماری محبتوں کا..... ارے غلطی تو ہماری ہی تھی کہ ہم نے تمہیں سر پر چڑھایا۔''

''اب ان گئی گزری باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے شمسن چچی!'' فیضو نے برا مانے بغیر یا کسی غصے کا اظہار کیے بغیر سپاٹ اور خشک لہجے میں کہا۔ ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ہم نے تم لوگوں کو بتا دیا ہے کہ اب ہمارا رشتہ دوسری جگہ ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی پرانے قصے ختم ہو چکے ہیں۔''

اچانک مسعودہ جو اب تک بالکل خاموش تھی' جیسے پھٹ پڑی۔ ''پرانے قصے کبھی ختم نہیں ہوتے' انہیں ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔ تم اپنی وہ اوقات کس طرح بھول سکتے ہو جب تم گجر نالہ بستی میں پھٹے ہوئے پاجامے پہن کر گھوما کرتے تھے اور ہماری اماں تم پر ترس کھا کر

تمہیں کپڑے بنوا دیتی تھیں۔ اگر ہمارے ابا نے تمہاری مدد نہ کی ہوتی تو تم اس وقت فیکٹری میں افسر لگے ہونے کی بجائے ٹائر کی کسی دکان پر پنکچر لگا رہے ہوتے..... اور وہیں گجر نالہ کی بستی میں پڑے سڑ رہے ہوتے۔ تم آج اگر کچھ ہو تو ہمارے ابا کی بدولت ہو اور آج تم نے کسی زہریلے سانپ کی طرح کینچلی بدلی ہے۔''

فیضو یہ سب کچھ سننے کے باوجود مصلحت اندیشی کی راہ کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسے بہر حال اس قصے کو ختم کرنا تھا' کسی لڑائی جھگڑے کے بغیر ابھی اور اسی وقت سب کچھ ختم کر دینا تھا تاکہ ابھی یا آئندہ کوئی اور تماشا نہ کھڑا ہو۔

''شوکت چچا نے ہمارے ساتھ بہت کچھ کیا ہے' ہم مانتے ہیں۔'' فیضو نے کہا۔ ''لیکن اس کے بدلے میں تم لوگ جو چاہتے ہو' وہ ہم نہیں دے سکتے اور ہم اس معاملے کو یہیں ختم کر رہے ہیں۔ اس پر اب مزید کسی بات چیت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری دعا ہے کہ شاکرہ کی شادی کسی اچھی جگہ ہو جائے اور وہ ہمیشہ خوش رہے۔''

''میری بہن کو تمہارے جیسے منحوس کی دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔'' مسعودہ نے گرج کر کہا۔ ''تم جیسوں کی تو دعائیں بھی بددعاؤں سے کم نہیں ہوتیں۔''

فیضو نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا اس کا مطلب تھا کہ گفتگو ختم ہو چکی ہے۔

دادی اس دوران بالکل خاموش رہی تھیں۔ البتہ ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ان کے بوڑھے اور جھریوں سے بھرے ہوئے رخساروں پر برابر گرتے رہے تھے۔

''ہم جاتے ہیں فخرن خالہ!'' شمسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم لوگوں نے ہمارا دل بہت خوش کیا۔''

''ہمیں الزام نہ دو شمسن!'' دادی نے روتے ہوئے کہا۔ ''خدا گواہ ہے فیضو نے جو کچھ بھی کیا ہے' وہ اپنی مرضی سے کیا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہے۔''

کسی نے دادی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سب لوگ وہاں سے چلے آئے۔ دادی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی' فیضو تو پہلے ہی کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

شاکرہ نے جب گھر واپس آنے والوں کی شکلیں دیکھیں تو وہ بغیر بتائے ہی سمجھ گئی کہ جمیلہ کے بھائی آفتاب نے جو خبر دی تھی' وہ بالکل صحیح ہے' ان لوگوں کے جانے کے بعد سے گزرنے والا ہر لمحہ جیسے اس نے دوزخ کی آگ میں جلتے ہوئے گزارا تھا' یہ انتظار کی' امید و بیم کی ایک ایسی وحشت ناک کیفیت تھی جس کا شاکرہ کو اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔

زندگی کے ایسے اذیت ناک لمحات تو اس نے کبھی نہیں گزارے تھے لیکن وہ لوگ واپس آئے تو اس کو معلوم ہوا کہ اصل اذیت ناک لمحات کا سلسلہ تو اب شروع ہوا ہے۔

''اس نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے آپا..... تم بھی اسے ٹھکرا دو۔'' مسعودہ نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ ''خبردار جو اس لالچی کتے کے غم میں ایک آنسو بھی بہایا تم نے..... اس ذلیل آدمی نے اپنے آپ کو دولت کی خاطر دو کوڑی کے غلام کی حیثیت سے بیچ دیا ہے۔'' مسعودہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

شمسن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے' شوکت حسین کا چہرہ جیسے پتھرا کر رہ گیا تھا اور شاکرہ تو جیسے مُردہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس موقع پر اس کو سب سے زیادہ سہارا دینے والی اس کی چھوٹی بہن مسعودہ تھی جو اس کے دل سے فیضو کی محبت کو نکالنے اور اس کی جگہ نفرت کو پروان چڑھانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

معروضی حالات کے تحت جذبے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں اور گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ساتھ شاکرہ کے دل و دماغ میں بھی ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ شروع کے دنوں میں تو اس کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ زندہ ہی نہ رہ سکے گی۔ محبت میں ناکامی کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو ٹھکرائے جانے اور اپنی بے توقیری تذلیل کا احساس اس کو کھائے جا رہا تھا۔

وہ اور فیضو دونوں ساتھ ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے' وہ دونوں ایک ہی جیسے لوگ تھے' جھگیوں میں اور کوارٹروں میں رہنے والے لوگ..... گنی بوٹیوں اور نپے شوربے کے ساتھ زندگی گزارنے والے لوگ..... دونوں کے لیے ایک دوسرے کے سامنے شرمندہ ہونے والی کوئی چیز کبھی تھی ہی نہیں..... انہیں ایک دوسرے سے شرمانے یا ایک دوسرے سے کچھ چھپانے کی ضرورت کبھی نہیں پیش آئی تھی لیکن پھر فیضو چند چھلانگوں میں اتنی اونچی سطح پر جا بیٹھا تھا کہ اس جگہ سے اس کو شاکرہ صرف ایک پستہ قد' حقیر' بونی طرح کی نظر آنے لگی جو کسی طرح سے بھی اس کے قابل نہیں تھی..... شاکرہ کو استرداد اور تذلیل کے اس شدید صدمے نے نڈھال کر دیا تھا۔ چونکہ اس صدمے کا کوئی مداوا بھی نہیں تھا۔ اس لیے اسے اب اس کے ساتھ ہی جینا تھا۔

شاکرہ کی بات ٹوٹ جانے کی خبر ایسی نہیں تھی جسے چھپایا جا سکتا' جبکہ اس واقعہ کی سب سے پہلے خبر لانے والے پڑوسی ہی تھے۔ تمام متعلقہ لوگوں اور پڑوسیوں وغیرہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ شاکرہ کے منگیتر نے رشتہ توڑ کر اپنے کارخانے کے مالک کی لنگڑی بیٹی سے منگنی کر لی ہے اور چھ ماہ بعد شادی ہے۔

دوسرے تمام لوگوں کے لیے یہ ایک سنسنی خیز اور چٹ پٹی سی خبر تھی اور اس کی اہمیت ایک خبر سے زیادہ کی نہیں تھی' لیکن عمران کے لیے یہ ایک خبر سے بڑھ کر بہت کچھ تھی..... اس کے تو خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ شاکرہ کی بات ٹوٹ جائے گی۔

عمران کا باپ ذیشان درزی کا کام کرتا تھا۔ سعود آباد کے کوارٹر میں آنے سے پہلے وہ مختلف دکانوں پر کاریگر کے طور پر کام کرتا تھا اور پھر سعود آباد میں اس نے اپنی چھوٹی سی دکان کھول لی تھی۔ ایک بیوی تھی' زاہدہ اور صرف ایک بیٹا تھا عمران..... عمران سے پہلے زاہدہ کے کئی بچے ہوئے تھے' لیکن وہ سب مر گئے' عمران آخری بچہ تھا' وہ زندہ رہا اور اس کے بعد زاہدہ کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔

عمران نے اسی سال بی ای کیا تھا۔ وہ مکینیکل انجینئر تھا اور اسے فوراً ہی ایک ہوائی کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔

عمران کو شاکرہ بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس خوبصورت اور نازک نازک سی لڑکی کو بہت پسند کرتا تھا' لیکن اس نے اپنی پسند کو اپنے دل کے نہاں خانے میں ہی قید رکھا اور اسے کبھی باہر نہیں آنے دیا' کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ شاکرہ کی شادی اس کے پڑوسی فیضو کے ساتھ طے ہے اور شاکرہ خود بھی اس رشتے کو دل سے پسند کرتی ہے۔ البتہ ایک بار اس نے یوں ہی رواداری میں اپنی اماں سے یہ ضرور کہا تھا کہ اگر شاکرہ کی شادی فیضو کے ساتھ طے نہ ہو گئی ہوتی تو وہ خود شاکرہ سے شادی کر لیتا کیونکہ وہ اسے بہت اچھی لگتی ہے۔

شاکرہ کی بات ٹوٹنے سے عمران کو خفیہ طور پر بے حد خوشی ہوئی۔ حالات نے ایسا رخ اختیار کیا تھا کہ اب اس بات کا امکان نہیں رہا تھا کہ یہ ٹوٹا ہوا رشتہ بحال ہو سکے..... عمران اب قسمت آزمائی کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شاکرہ فیضو سے محبت کرتی تھی اور شاید وہ اب بھی کرتی ہو' لیکن اب تو یہ سب کچھ بے معنی ہو گیا تھا۔ شاکرہ کو تو اب فیضو کو اپنی زندگی سے نکالنا ہی ہوگا کیونکہ فیضو نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

شاکرہ کی بات چیت ٹوٹنے کے تین ماہ کے بعد عمران کی ماں زاہدہ' شاکرہ کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر پہنچی۔

یہ سب کچھ عمران کی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ عمران اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور انہوں نے بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی تھی۔ عمران کے باپ ذیشان کو اگرچہ یہ اعتراض تھا کہ لڑکی کا باپ حیثیت میں ان سے کم ہے' کیونکہ وہ کبھی سبزی کا ٹھیلا لگایا کرتا تھا' تاہم خود لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور ایم اے کر رہی تھی۔ وہ اسکول میں پڑھاتی تھی اور چھوٹی

بہن تو ڈاکٹر بننے جا رہی تھی اور پھر اب تو کافی عرصے سے شوکت حسین نے ٹھیلا لگانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سبزی کی سپلائی کا کام کرتا تھا۔ زاہدہ کو تو وہ لڑکی پہلے ہی پسند تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس کا بیٹا ایک عرصے سے اس کو چاہتا ہے۔

عمران نے بھی اگرچہ غریبی میں ہی آنکھ کھولی تھی' لیکن پھر بھی اس کا کنبہ نسبتاً خوشحال تھا۔ ابا اچھا کما لیتے تھے اور گھر میں صرف تین کھانے والے تھے۔ کوارٹر اپنا تھا۔ عمران پڑھنے سے کبھی نہیں بھاگا اور کبھی فیل نہیں ہوا' یہاں تک کہ اس نے بآسانی بی ای کر لیا اور اسے ابھی حال ہی میں نوکری بھی مل گئی تھی۔

''نوکری تو ماشاءاللہ ہو ہی گئی ہے۔'' زاہدہ نے شمسن سے کہا۔ ''گھر کا کرایہ بھی دفتر کی طرف سے ملا کرے گا۔ پھر ہم اگر چاہیں تو کسی اور جگہ کرائے کا زیادہ بڑا مکان بھی لے سکیں گے۔ اے ہمارے آگے پیچھے اور ہے ہی کون.....؟ بس لے دے کے یہی ایک بیٹا ہے اور ہم اسے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دل سے چاہتا ہے کہ شاکرہ کے ساتھ اس کی بات طے ہو جائے۔''

شوکت حسین اور شمسن کے لیے یہ بات بڑی حیرت اور خوشی کا باعث تھی۔ جن لڑکیوں کی بات چیت ٹوٹ جاتی ہے' ان کو پھر دوسرا رشتہ ملنے میں خاصی مشکل درپیش آتی ہے' لیکن یہاں تو ابھی صرف تین ماہ گزرے تھے کہ اتنا اچھا رشتہ آ گیا اور وہ بھی ایسے لوگوں کی طرف سے جنہیں گذشتہ رشتے کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا اور ان سے کوئی بھی بات ڈھکی چھپی نہیں تھی.....عمران میں ہر وہ خوبی موجود تھی جس کی ضرورت تھی۔

''ہاں کر دو اماں!'' ان لوگوں کے جانے کے بعد مسعودہ نے شاکرہ کی موجودگی میں اپنی ماں سے کہا۔ شوکت حسین بھی موجود تھا۔ ''اس رشتے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا.....لڑکا انجینئر ہے' آگے بہت ترقی کرے گا' آپا بھی ایم اے کر لیں گی تو کسی نہ کسی کالج میں جگہ مل جائے گی۔''

جہاں تک شاکرہ کا تعلق تھا تو اس کے لیے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کی شادی کس کے ساتھ ہو۔ شادی تو بہر حال ہونی ہی تھی اور جب فیضو نے دغا دے دی تھی تو پھر کسی کے ساتھ بھی زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ بس یہ تھا کہ آدمی تعلیم یافتہ' برسر روزگار اور خوشحال ہو۔ عمران میں یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔

شاکرہ نے اپنی گم گشتہ محبت کو دل کے نہاں خانے میں دفنا کر اس پر خون کی بوندوں سے بنے ہوئے پھولوں کی چادر چڑھائی اور زندگی کے نئے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

شوکت حسین اور شمسن اس بار بہت محتاط تھے۔ وہ ایک دفعہ بہت گہری چوٹ کھا چکے تھے اور اب مزید خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ باہمی مشورے کے بعد انہوں نے لڑکے والوں کا پیغام منظور کرتے ہوئے ان کے سامنے ایک شرط رکھی تھی' اس شرط کی تشکیل میں مسعودہ کا بہت دخل تھا۔ لڑکے والوں نے سب کچھ بخوشی منظور کر لیا۔

اس شرط کے مطابق یہ طے پایا کہ منگنی کی رسم کے ایک ہفتے کے بعد سادگی سے نکاح کر دیا جائے گا' جس میں فریقین کی طرف سے صرف بعض خاص خاص رشتے دار شرکت کریں گے اور رخصتی بعد میں اس وقت ہو گی جب شاکرہ ایم اے فائنل کے امتحان سے فارغ ہو گی۔ گھر والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ شاکرہ کی تعلیم میں خلل پڑے اور ساتھ ہی وہ رشتے کو بھی ہر طرح سے پکا اور محفوظ کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ عمران اور شاکرہ کی منگنی ہو گئی۔ شاکرہ نہ تو خوش تھی اور نہ ناخوش.....اس نے بس ایک سمجھوتہ کیا تھا اور جس طرح سمجھوتہ کرنے والے فریق اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں' اسی طرح شاکرہ بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ سمجھوتے کا تعلق تو جذبات سے نہیں' مفادات سے ہوتا ہے۔

منگنی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد شاکرہ اور عمران کا نکاح ہو گیا' جس میں دونوں طرف کے چند منتخب رشتے داروں نے شرکت کی۔

''خدا کا شکر ہے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔'' مسعودہ نے اپنی بڑی بہن سے تنہائی میں کہا۔ ''اب کوئی بھی اپنی بات سے مکر نہیں سکتا' پیچھے نہیں ہٹ سکتا' یہ نہیں برسوں تک لٹکائے رکھا اور پھر کسی مالدار گھرانے میں اپنے آپ کو دو ٹکے میں بیچ دیا۔''

''دو ٹکے میں نہیں.....'' شاکرہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بے جان آواز میں کہا۔ ''بھاری قیمت میں بیچا ہے اپنے آپ کو' ایسی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے کہ ساری زندگی عیش کرے گا۔''

''عیش کرے گا اور جوتیاں کھائے گا۔'' مسعودہ نے نفرت کے ساتھ کہا۔ ''ایسے لوگوں کی تو سسرال میں دو کوڑی کی عزت نہیں ہوتی اور بیویاں بھی ایسے شوہروں کو جوتے کی نوک پر مارتی ہیں۔ کیا وہ لنگڑی لڑکی جس کے بارے میں سنا ہے کہ بدصورت بھی ہے' کبھی بھی سچے دل سے فیضو کی عزت کرے گی؟''

''ارے کرے نہ کرے' جہنم میں جائے۔'' شاکرہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''فیضو کو بہت ساری دولت چاہیے تھی' سو وہ اس کو مل جائے گی۔''

لیکن فیضو کو سیٹھ منصور علی کی دولت میں سے ایک پائی بھی نہ مل سکی۔

☆======☆======☆

سعود آباد سے کبھی کبھار کوئی پرانے بھولے بھٹکے پڑوسی دادی سے ملنے کے لیے آجاتے تھے اور دادی ان سے مل کر بہت خوش ہوتی تھیں اور ان کو رخصت کرتے وقت بار بار تاکید کرتی تھیں کہ وہ دوبارہ ضرور آئیں۔ فیضو کو اپنے پرانے پڑوسیوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ ان کا آنا جانا پسند بھی نہیں کرتا تھا' لیکن دادی تو ان میں سے کسی کے آنے پر بچھ بچھ جاتی تھیں۔ وہ خود تو کہیں آجا نہیں سکتی تھیں' البتہ آنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھیں۔

ایسی ہی ایک پڑوسن کی آمد سے دادی کو شاکرہ کی منگنی اور نکاح کا علم ہوا اور انہوں نے فیضو کو بھی یہ بات بتادی۔ فیضو کو اس خبر سے نہ کوئی خوشی ہوئی نہ غم..... اس کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ شاکرہ کی کہیں شادی ہو جائے یا وہ ساری زندگی کنواری بیٹھی رہے۔ اس نے تو اس کے بارے میں کچھ بھی سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے اور بہت سی چیزیں موجود تھیں۔

البتہ دادی بہت روئیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ آنسو بہاتی رہیں' انہوں نے تو کبھی یہ بات سوچی بھی نہیں تھی کہ شاکرہ کی شادی کی کوئی تقریب ان کے بغیر ہو سکتی ہے' لیکن ایسا ہو چکا تھا..... منگنی اور نکاح کے موقع پر انہیں کسی نے نہیں پوچھا تھا کیونکہ اب وہ اس قابل نہیں رہی تھیں کہ ان کو پوچھا جائے۔ شوکت حسین اور شمسن پھر کبھی ان کے پاس نہیں آئے۔ اس دن وہ ملاقات ان لوگوں کے ساتھ آخری ملاقات تھی۔

بی ایس سی کے امتحانات ہو چکے تھے اور ناہید کے سارے پرچے اور پریکٹیکلز بہت اچھے ہوئے تھے۔ فیضو نے اس کو بہت اچھی تیاری کروائی تھی اور اب پڑھائی کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اگلے چند ماہ کے بعد ناہید اور فیضو کی شادی ہونے والی تھی۔

شادی کی تیاریاں بہت زور و شور کے ساتھ جاری تھیں۔ رابعہ آنٹی کئی بار فیضو کو اپنے ساتھ لے کر صدر گئیں اور وہاں اس کی مرضی اور پسند سے اس کے لیے کپڑے اور جوتے وغیرہ خریدے' وہ فیضو کو پہلے ہی بتا دیتی تھیں کہ وہ قیمت کے بارے میں کچھ نہ سوچے' صرف اپنی پسند کی چیزوں کا انتخاب کرے۔ وہ جب بازار سے لدا پھندا آتا اور دادی کو وہ بیش قیمت چیزیں دکھاتا تو دادی کی آنکھوں میں خوشی کی کوئی چمک نمودار نہ ہوتی' وہ صرف رسمی سی تعریف کر کے اپنا فرض پورا کر دیتی تھیں۔ دادی جیسے بالکل بجھ کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے کسی بھی چیز میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا تھا۔ فیضو کی شادی کے سلسلے میں بھی وہ کوئی تیاری نہیں کر رہی تھیں' بلکہ

یہ کام بھی خود فیضو کی ہونے والی سسرال کے لوگ ہی انجام دے رہے تھے۔ دادی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ان کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ ساری عمر خوشی کے چند لمحات کی تلاش میں پُر خار راہوں پر دھکے کھاتے کھاتے اپنے لہولہان پیروں کے ساتھ دادی اب زندگی کے اس مرحلے میں داخل ہو گئیں جہاں خوشی کی تلاش کا ہر جذبہ دم توڑ چکا تھا..... وہ سارا سارا دن اس ڈھنڈار سے گھر میں اکیلی پڑی رہتیں اور طرح طرح کے اذیت ناک خیالات کے پیچ و خم میں الجھی رہتیں۔

فیضو اور ناہید کی شادی میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ بڑے زور و شور کے ساتھ تیاریاں جاری تھیں۔ دعوت نامے شائع ہو چکے تھے اور تقسیم ہو رہے تھے۔ شمس الدین کی مصروفیات میں بہت اضافہ ہو گیا تھا' وہ فیکٹری میں ضروری خدمات انجام دینے کے علاوہ میڈم رابعہ اور ناہید کے ساتھ شاپنگ کے لیے بھی جاتا تھا' گاڑی ڈرائیور چلاتا تھا۔

اس روز دوپہر کے کھانے کے بعد وہ میڈم رابعہ اور ناہید کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ ان لوگوں کو صدر جانا تھا جہاں رابعہ نے کچھ زیورات بننے کے لیے دیئے ہوئے تھے۔ وہ وہاں سے لینے تھے اور کچھ بنارسی ساڑھیاں خریدنی تھیں۔

گاڑی لانڈھی کے علاقے سے نکل کر ملیر سے گزرتی ہوئی ڈرگ روڈ پر ائیر پورٹ سے تھوڑی ہی آگے تھی کہ پیچھے سے آنے والے ایک بھاری بھرکم ٹرک نے گاڑی کو ٹکر ماردی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ٹرک کے بریک اچانک فیل ہو گئے تھے اور وہ ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے ٹرک کو سنبھال لینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

حادثہ اتنا شدید تھا کہ گاڑی چُور چُور ہو گئی اور اس کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ شدید طور پر زخمی اور ہلاک ہوئے۔

شمس الدین ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی نشست پر دائیں جانب یعنی ڈرائیور کے عین پشت پر ناہید بیٹھی تھی اور اس کے برابر اس کی ماں..... ٹرک نے دائیں جانب سے گاڑی کو ٹکر ماری تھی اور اس کے نتیجے میں گاڑی بائیں جانب گھوم گئی۔ دائیں جانب کا حصہ چکنا چُور ہو گیا اور اس طرف بیٹھے ہوئے ڈرائیور اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ناہید مہلک طور پر زخمی ہو گئے۔ شمس الدین اور رابعہ دائیں جانب تھے۔ وہ دونوں بھی زخمی ہوئے لیکن مہلک طور پر نہیں۔

اس خوفناک حادثے کے نتیجے میں ناہید اور ڈرائیور ہلاک ہوگئے' رابعہ بچ گئی اور شمس الدین بھی کچھ دنوں کے بعد ٹھیک ہوگیا سارے زخمیوں کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا جہاں ڈاکٹروں کی تمام تر کوششوں کے باوجود ناہید اور ڈرائیور کی جان نہیں بچائی جاسکی۔

حادثے کی خبر سے منصور علی کے گھر میں ایک زبردست قیامت برپا ہوگئی' منصور علی اور اس کے دونوں بیٹے پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے اور فیضو بھی ان کے ساتھ تھا۔

ناہید کی تدفین کے دن فیکٹری بند رہی اور بڑی سوگوار فضا طاری رہی۔ ڈرائیور کی لاش اس کے ورثا کے حوالے کردی گئی تھی' رابعہ کو اس کے گھر والوں نے اسپتال منتقل کردیا تھا' جہاں چند روز کے بعد اس کو چھٹی دے دی گئی وہ ٹھیک ہوگئی تھی۔

ناہید کے گھر والوں کے لیے اس کی اچانک اور ناگہانی موت ایک بہت بڑا صدمہ تھی' مگر فیضو کے لیے اس صدمے میں کچھ اور صدمات بھی شامل تھے' یہ اچانک مل جانے والے غیر متوقع خزانے سے بالکل غیر متوقع طور پر مکمل محرومی کا صدمہ تھا' تاہم اس صدمے میں شاکرہ کو کھو دینے کا صدمہ کہیں بھی شامل نہیں تھا۔ شاکرہ تو اب بھولی ہوئی داستان تھی جو سعود آباد کے کوارٹروں کی بستی میں کہیں گم ہوگئی تھی۔

ناہید کی موت فیضو کے لیے کسی محبوب اور دلنواز ہستی کی موت نہیں تھی۔ ناہید کبھی بھی اس کی محبوبہ نہیں تھی اور نہ ہی ایسا تھا کہ وہ اس کے بغیر اپنی زندگی کو سرتاسر زخموں سے چُور چُور پائے..... ایسا بالکل نہیں تھا' ناہید اس کے لیے خزانے کی ایک کنجی تھی' جسے پا کر وہ اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر خوش قسمت انسان سمجھنے لگا تھا' لیکن پھر قسمت کے ظالم ہاتھوں نے اس سے وہ کنجی چھین لی اور وہ خالی ہاتھ رہ گیا۔ اس کی مایوسی اور دکھ کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ قسمت اب اسے دوبارہ ایسا موقع نہیں دے سکتی تھی' ہر سیٹھ کو اپنی لنگڑی بیٹی کے لیے غریب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شوہر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دادی اپنی نہ ہوسکنے والی بہو کی موت پر تعزیت کے لیے رابعہ کے پاس گئیں' جوان لڑکی حادثاتی موت کا انہیں دکھ تھا' لیکن یہ صرف ایک جوان لڑکی کی موت کا دکھ تھا' اس میں کسی رشتے کا بندھن شامل نہیں تھا۔ دادی نے تو ان لوگوں کے ساتھ ذہنی طور پر کوئی رشتہ جوڑا ہی نہیں تھا۔

ناہید کی موت کے بعد فیکٹری میں فیضو کے لیے حالات بالکل بدل گئے۔ اب وہ دوسرے ملازمین کی طرح فیکٹری کا ایک ملازم تھا' ایک افسر اور بس..... اس کے ساتھ کوئی

خصوصیت وابستہ نہیں تھی۔ مالکوں کی نظریں بھی بدل گئی تھیں۔ فیضو داماد بنتے بنتے محض ایک ملازم بن کر رہ گیا تھا اور اب اسے ایک بار پھر پہلے جیسی احتیاط اور ہوش مندی کے ساتھ کام کرنا تھا۔ شمس الدین کو خوش رکھنا تھا' کوئی ایسی بات نہیں کرنی تھی جو مالکوں کی یا شمس الدین کی ناراضگی کا سبب بن سکے۔ وہ جس فیکٹری کے مالکوں میں شامل ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا' وہاں وہ ایک بار پھر صرف ملازم بن کر رہ گیا تھا۔

ناہید کی حادثاتی موت کی خبر سعود آباد بھی پہنچ گئی' آفتاب کے ذریعے۔

''اب دیکھیں کتنی دولت ملتی ہے اس لالچی کتے کو۔'' مسعودہ نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس دن کیسا پھنپھنا رہا تھا کہ کمپنی کے مالک اسے اپنا داماد بنانا چاہتے ہیں..... اب ذرا بن کے دکھائے داماد!''

''ان لوگوں کی کوئی اور لولی لنگڑی بیٹی نہیں ہے جو اس کے پلے باندھ دیں۔'' شمسن نے کہا۔ ''ان کے تو سرے سے کوئی اور بیٹی ہی نہیں ہے۔''

''چھوڑو اماں..... ہمیں کیا۔'' شاکرہ نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''جو ہونا تھا ہو چکا۔''

''ہمیں تو بس کبھی کبھی فخرن خالہ کا خیال آتا ہے۔'' شمسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''اس دن بے چاری کس قدر پھپھک پھپھک کر رو رہی تھیں' ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی تھیں..... ان کا واقعی اس سارے معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔''

''ان کی تو ساری زندگی دکھ سہتے ہی گزری۔'' مسعودہ نے کہا۔ ''اولاد ایسی نکمی اور نابکار..... اور اولاد کی اولاد نے بھی انہیں کوئی سکھ نہیں دیا' حالانکہ انہوں نے اپنے آپ کو فیضو کے لیے مٹا کر رکھ دیا..... اس بڑھاپے میں کس قدر محنت کی ہے انہوں نے اس کے لیے۔''

دادی کبھی کبھی سوچتی تھیں کہ ناہید کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' وہ اگر کچھ پہلے ہو جاتا تو..... اور اس کے ساتھ ہی ان کا سارا وجود کانپ اٹھتا..... اور اب تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا' شاکرہ کسی اور کی امانت ہو چکی تھی دادی اب بھی اس کے بارے میں سوچتی تھیں لیکن فیضو کو شاکرہ کے کھو جانے کا کوئی ملال نہیں تھا۔

☆======☆======☆

فیکٹری میں کام جاری تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا' فیکٹری میں ہونے والا کوئی بھی کالا دھندا ایسا نہیں تھا جس کی تمام باریکیوں سے فیضو واقف نہ ہو چکا ہو۔ طرح طرح کے کالے دھندوں کے میٹر تیزی سے گھومتے رہتے تھے اور فیکٹری کے مالکان سونا بناتے رہتے تھے' فیکٹری میں بننے والی کوئی ایک دوا بھی ایسی نہیں تھی جس میں درج شدہ فارمولے کے

مطابق تمام اجزائے ترکیبی پوری مقدار میں استعمال کیے جاتے ہوں' جبکہ خریداروں سے قیمت پوری وصول کی جاتی تھی۔ طرح طرح کے بھتہ خوروں کے ماہانہ وظیفے بندھے ہوئے تھے اور فیکٹری کے مالکان کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں ہوتی تھی۔ کئی اسپتالوں کو دوا کی سپلائی کے ٹھیکے بھی فیکٹری کے ہی پاس تھے اور ان ٹھیکوں کی آڑ میں اسپتالوں کی انتظامیہ اور فیکٹری کے مالکان اپنی ملی بھگت کے ذریعے جو ہاتھ کی صفائی دکھاتے تھے۔ فیضو اس سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس کے پاس کتابی علم تو پہلے سے موجود تھا اور اب وہ یہ ''کالا علم'' بھی حاصل کر رہا تھا کہ اندھی کمائی کس طرح کی جاتی ہے منصور علی کی دوا ساز فیکٹری اس کے لیے بہترین درس گاہ ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے اب تک علمی درس گاہیں اور لیبارٹریز دیکھی تھیں۔ یہ عملی درس گاہ جہاں مختلف طریقوں سے پیسہ بنانے کے گُر سکھائے جاتے تھے۔ وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ فیضو یہاں سے ''کالے علم'' کے بیش قیمت موتی چن چن کر اپنے دل و دماغ کے خزانے میں بھر رہا تھا۔

فیکٹری میں اس کی خصوصی اہمیت قطعی طور پر ختم ہو چکی تھی اور اب تو یہ حال تھا کہ سپر وائزر شمس الدین بھی بعض اوقات اس سے سخت کھردرے لہجے میں بات کر گزرتا تھا' جبکہ اس سے پہلے تو وہ اس کے آگے سراپا عجز و نیاز بنا رہتا تھا' مالک لوگ بھی اس کے ساتھ ایک تنخواہ دار ملازم کا سا ہی سلوک کرتے تھے جسے کوئی خصوصی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ فیضو اس صورتِ حال سے دلبرداشتہ تھا' لیکن پھر بھی اس بات کا شکر کرتا تھا کہ اس کو دی گئی مراعات اپنی جگہ پر موجود تھیں' انہیں واپس نہیں لیا گیا تھا تاہم مزید کوئی نئی مراعات جلد ملنے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔

فیضو نے اس فیکٹری میں کام کرتے ہوئے دو سال کا عرصہ مزید گزار دیا۔ ناہید کی حادثاتی موت کے بعد کچھ دن تک وہ مزید ایک موہوم سی امید کے دامن کو تھامے رہا تھا۔

رابعہ کی ایک بھانجی تھی جو ناہید سے ایک سال چھوٹی تھی' اس کا نام پروین تھا' پروین کے باپ کا مشینوں اور ان کے پُرزوں کی درآمد کا بہت بڑا کاروبار تھا اور اس کا دفتر بولٹن مارکیٹ میں تھا۔ منصور علی کی فیکٹری کے لیے ضروری مشینیں اور پرزہ جات پروین کے باپ کی کمپنی سے ہی حاصل کیے جاتے تھے۔ پروین اکثر اپنی خالہ کے گھر آتی رہتی تھی اور اس کی ناہید سے بہت دوستی تھی۔ وہ اکثر ناہید کی پڑھائی کے دوران بھی آتی تھی اور فیضو سے اس کی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی' پروین شکل و صورت میں مرحومہ ناہید سے بھی گئی گزری تھی اور وہ صرف میٹرک پاس تھی۔ اس نے آگے پڑھنے میں کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا' لیکن

فیضو کے لیے یہ ساری چیزیں بے معنی تھیں' اسے تو صرف یہ یاد رکھنا تا کہ پروین بھی ایک بہت مالدار گھرانے کی لڑکی ہے۔

ناہید کے منگنی کے موقع پر پروین کے والدین بھی مہمانوں میں شامل تھے اور ان لوگوں نے فیضو کو دیکھا تھا اور اس کو بہت سراہا تھا' انہیں لڑکا بہت پسند آیا تھا۔

ناہید کی موت کے بعد فیضو کے دل کے ایک گوشے میں یہ خواہش ایک امید کی شکل میں نمودار ہوئی کہ شاید ناہید کی خالہ فیضو کو اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لیں۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ پروین کے والدین اس کے لیے لڑکے کی تلاش میں ہیں اور وہ جلد ہی اس کی شادی کر دینا چاہتے ہیں' لیکن ابھی تک پروین کی شادی کہیں طے نہیں ہوئی تھی۔ ''شاید رابعہ آنٹی خود ہی اپنی بھانجی کے لیے مجھے چن لیں۔''

دو ایک بار اس کے دل و دماغ میں یہ خیال آیا کہ وہ شمس الدین سے اس سلسلے میں اشارتاً کچھ بات کرے لیکن پھر اس نے اس خیال کو فوراً ہی جھٹک دیا..... نہیں..... ہو سکتا ہے رابعہ آنٹی اس بات کو پسند نہ کریں۔ پروین پوری طرح صحت مند اور نارمل لڑکی تھی اور اس کے اندر کوئی جسمانی نقص موجود نہیں تھا۔

فیضو کا اب منصور علی کے گھر آنا جانا بالکل موقوف ہو چکا تھا۔ وہاں جانے کی اب اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ اب رابعہ سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوتی تھی اور پروین سے ملاقات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ امید کا ایک ٹمٹماتا ہوا دیا اپنے دل میں روشن کیے ہوئے بیٹھا تھا۔

لیکن اس وقت یہ دیا ہمیشہ کے لیے بجھ گیا جب ناہید کی موت کے کوئی چھ ماہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ سیٹھ منصور علی کی بھانجی پروین کی شادی سوت گولے کا کاروبار کرنے والے ایک تاجر کے بیٹے سے طے ہو گئی ہے۔

''نہیں.....!'' فیضو نے گہری افسردگی کے ساتھ دل ہی دل میں کہا۔ ''اب ایسا کچھ نہیں ہوگا..... وہ ایک موقع تھا جو ہاتھ سے جاتا رہا..... اب تو سب کچھ خود ہی کرنا ہوگا۔''

فیضو کو بہت اچھی تنخواہ مل رہی تھی' اسے رہنے کے لیے مکان ملا ہوا تھا اور دیگر خاصی مراعات بھی حاصل تھیں' وہ ایک بہت اچھی اور خوشحال زندگی گزار رہا تھا لیکن جب وہ اپنی کمائی کے مقابلے میں مالکوں کی کمائی کو دیکھتا تھا تو جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا تو اس کا دل ڈولنے لگتا۔ مالکوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا' دولت تھی کہ آسمان سے برس رہی تھی اور زمین سے اُگ رہی تھی اور یہ دولت صرف ایمانداری کے ساتھ دوائیں بنانے اور ان کو بیچنے

سے حاصل نہیں ہو رہی تھی' ایمانداری کی کمائی تو زیادہ نہیں تھی' دولت کا جو اصل سیلِ رواں تھا' اس کے منبع تو کہیں اور ہی تھے جن کا فیضو کو پوری طرح علم تھا۔ فیضو جب مالکوں کی کمائی سے اپنی تنخواہ کا مقابلہ کرتا تھا تو اپنے آپ کو بالکل فقیر محسوس کرتا تھا اور اس کا فقیر بن کر رہنے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔

ناہید کی موت کے بعد فیضو نے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ فیکٹری میں خاموشی سے اور حسبِ سابق احتیاط سے کام کرتے ہوئے گزارا تھا' اس عرصے کے دوران پروین کی بھی شادی ہوگئی اور اب فیضو کے لیے کوئی موہوم سی بھی امید باقی نہ رہی تھی کہ وہ کسی وجہ سے اس خاندان کا حصہ بن سکے گا۔ تو پھر اس نے اپنی ''فقیری'' پر غالب آنے کے لیے آہستہ آہستہ لیکن بڑی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ نئے راستوں کی تلاش شروع کر دی۔ مالک تو خود ہی سرتاسر بے ایمان تھے اور حرام کی کھا رہے تھے تو پھر اس میں سے اپنا حصہ نکال لینا کون سی غلط بات تھی۔

فیضو کوالٹی کنٹرول آفیسر ہونے کے ناتے دواؤں کی تیاری کے لیے بعض کیمیکلز کی مقامی خریداری سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ بہت سارے کیمیکلز تو ایسے تھے جو فیکٹری خود باہر سے امپورٹ کرتی تھی اور اس کے لیے اس کے پاس باقاعدہ لائسنس تھا' بہت سے کیمیکلز اور دیگر اشیاء ایسی تھیں جنہیں مقامی مارکیٹ سے خریدنا پڑتا تھا۔ خریداری سے پہلے ان کی کوالٹی وغیرہ سے مطمئن ہونا ضروری تھا۔ پہلے یہ کام کرامت اللہ کیا کرتا تھا' لیکن اس کے جانے کے بعد سے یہ شعبہ بھی مکمل طور پر فیضو کے ہی پاس تھا۔ شمس الدین نے اسے ان پارٹیوں سے ملا دیا تھا جن سے مال خریدا جاتا تھا۔

فیضو نے جب اپنی ''فقیری'' پر غالب آنے کی کوشش شروع کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تو پھر اس نے اس کے لیے راہیں بھی تلاش کرنا شروع کر دیں اور انسان جب کچھ ڈھونڈنا شروع کرتا ہے تو پھر اسے پا بھی لیتا ہے۔

فیضو اس روز فیصل امپورٹرز کے اسٹور میں اسٹور انچارج مقبول احمد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فیصل کیمیکلز کا امپورٹر تھا اور ایک زمانے سے منصور علی کی فیکٹری کو مختلف کیمیکلز سپلائی کرتا تھا۔ فیضو کو یہاں سب لوگ جانتے تھے وہ اسٹور جا کر مقبول احمد سے براہِ راست مال کی ڈلیوری لیتا تھا۔ اس روز جس کیمیکل کی منصور علی کی فیکٹری کے لیے ضرورت تھی' وہ مطلوبہ مقدار میں موجود نہیں تھا بلکہ کچھ کم تھا۔

''کم ہی دے دیجیے۔'' فیضو نے مقبول احمد سے کہا۔ ''کیا فرق پڑتا ہے' کوئی بہت

زیادہ کم بھی نہیں ہے' بل پوری مقدار کا بنا دیجیے میں دستخط کر دوں گا' ہماری ذات سے آپ کو اگر تھوڑا سا فائدہ پہنچ جائے تو کیا برا ہے؟'' وہ ہنسنے لگا۔

مقبول احمد ایک کائیاں آدمی تھا اور پکا مفاد پرست۔ اس کو فیضو کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا کہ کس طرح وہ منصور علی کا داماد بنتے بنتے رہ گیا۔ فیضو نے اس قسم کی بات اس سے پہلے آج تک کبھی نہیں کہی تھی کیونکہ وہ اس کمپنی کو بھلا کس طرح نقصان پہنچا سکتا تھا' جس کے مالکوں میں وہ خود بھی شامل ہونے والا تھا لیکن آج پہلی بار فیضو نے جو بات کہی' مقبول احمد اس کا مطلب فوراً ہی سمجھ گیا..... فیضو کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

''فائدہ صرف میرا ہی کیوں فیضان صاحب!'' اس نے شاطرانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''فائدہ آپ کا بھی ہونا چاہیے' آپ بل پر سائن کر دیجیے' کم ہونے والے مال کی جو فالتو رقم بنتی ہے' اس میں سے آدھی آپ کی۔''

اور یوں اس سلسلے کا آغاز ہو گیا۔

فیضو نے اس بات کی خصوصی کوشش کی کہ فیکٹری کے لیے خریدے جانے والے سارے کیمیکلز فیصل امپورٹرز سے ہی خریدے جائیں۔ اگر کوئی آئٹم فیصل امپورٹر کے پاس موجود نہیں ہوتا تھا تو مقبول احمد فوراً اس کا کسی دوسری جگہ سے بندوبست کروا دیتا تھا۔ دونوں کی ملی بھگت سے اب مال کی مقدار کم ہوتی جا رہی تھی' جبکہ کاغذات پر سپلائی پوری دکھائی جاتی تھی اور قیمت بھی پوری وصول کی جاتی تھی۔ نتیجتاً دواؤں میں استعمال ہونے والا کیمیکل کم ہوتا جا رہا تھا۔ فالتو رقم مقبول احمد اور فیضان علی کے درمیان برابر تقسیم ہو جاتی تھی۔

یہ کاروبار بڑی کامیابی کے ساتھ چلنے لگا۔ فیضو بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے صورتِ حال کو اس طرح سے قابو میں لیے ہوا تھا کہ شمس الدین سمیت کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہونے پائے۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ تو شمس الدین کی طرف سے ہی تھا۔ ویسے اتنے دنوں تک ایمانداری اور مستعدی کے ساتھ کام کرتے رہنے کے باعث شمس الدین اس پر مکمل بھروسا کرتا تھا اور اس نے کئی خفیہ کاموں میں فیضو کو شریک بھی کر رکھا تھا۔ اب پہلے کی طرح فیضو کو بعض کاموں سے دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مال میں کمی کرنے سے اگرچہ خاصی کمائی ہو رہی تھی' لیکن اس میں خطرہ بھی زیادہ تھا۔ کسی وقت بھی' گنتی' پیمائش یا تول کے نتیجے میں یہ چوری پکڑی جا سکتی تھی۔ مقبول احمد اور فیضو دونوں ہی اس سلسلے کو زیادہ عرصے تک جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھے' چنانچہ اب ایک دوسرا متبادل راستہ اختیار کیا گیا جو پہلے راستے کے مقابلے میں بہت زیادہ محفوظ ہونے کے ساتھ

ساتھ کہیں زیادہ منافق بخش بھی تھا۔

ان لوگوں نے اب خام مال اور کیمیکلز وغیرہ میں ملاوٹ کرنا شروع کردی۔ اب صورت یہ بنی کہ مال خواہ پاؤڈر کی شکل میں ہو' لیکوئڈ کی شکل میں ہو' دانے کی شکل میں ہو یا کسی بھی دوسری شکل میں' ناپ تول' پیمائش اور گنتی وغیرہ میں بالکل پورا ہوتا تھا' لیکن اس کے اندر ملاوٹ ہوتی تھی جس کا کسی کو پتہ نہیں چل پاتا تھا۔ کوالٹی کنٹرول آفیسر تو فیضو خود تھا۔ خریدے جانے والے خام مال کی چیکنگ وہ خود ہی کرتا تھا۔

فیضو کا میٹر اب زیادہ تیزی کے ساتھ گھومنے لگا۔ اس کی اور مقبول احمد کی مشترکہ آمدنی میں اچانک بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ فیضو بہت خوش تھا' اسے وہ رقم خاصی بڑی مقدار میں حاصل ہورہی تھی جس کے حصول کے لیے اسے کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ ''بغیر محنت کے حاصل ہونے والی رقم ہی تو دولت مند بننے کا اصل راز ہے۔'' وہ اپنے آپ سے کہا کرتا۔

اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ خام مال میں ملاوٹ کے نتیجے میں تیار ہونے والی دواؤں کی کوالٹی تیزی سے گر رہی ہے۔ ایک تو پہلے ہی یہ ڈنڈی ماری جارہی تھی کہ قیمتی اجزاء مطلوبہ مقدار سے کم ہی استعمال کیے جاتے تھے جس کے باعث دواؤں کی اثر انگیزی گھٹ جاتی تھی' اب ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اصلی اجزاء کی مقدار اور بھی کم ہوگئی کیونکہ ان میں بھاری ملاوٹ کی جارہی تھی۔

ان دنوں کراچی میں پیہم بارشوں کے باعث مچھروں کی افزائش کے نتیجے میں ملیریا بری طرح پھیلا ہوا تھا اور بچے خاص طور پر اس کا شکار ہورہے تھے۔ ملیریا کے علاج کے لیے جو دوائیں مارکیٹ میں موجود تھیں' ان میں منصور علی کی کمپنی کی تیار کردہ دوا بھی شامل تھی اور اس دوا کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی غرض سے منصور علی کی کمپنی نے خصوصی کوششیں کی تھیں۔ کئی بڑے بڑے اسپتالوں کے عملے کو خوش کرکے وہاں سے اس دوا کے بڑے بڑے آرڈر لیے گئے تھے' پرائیویٹ ڈاکٹروں میں بھی اس کی پبلسٹی کی گئی تھی اور اس دوا کی فروخت بہت اچھی جارہی تھی کیونکہ بیماری بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔

لیکن اچانک دوا کے غیر مؤثر ہونے کی شکایت آنے لگی۔ پورا ڈوز دیئے جانے کے باوجود بھی دوا اثر نہیں کررہی تھی' اس کے بجائے اس فارمولے کے تحت دوسری کمپنیوں کی تیار کردہ دوا یا امپورٹیڈ دوا پوری طرح سے مؤثر ثابت ہورہی تھی۔ کئی اسپتالوں سے دوا کا پورا اسٹاک منصور علی کی کمپنی کو واپس بھیج دیا گیا۔

منصور علی کا دماغ چکرا گیا۔ ایسا کیا ہوگیا تھا؟ دوا کو اثر تو ضرور کرنا چاہئے تھا۔ ساری کی

ساری لاٹ کس طرح غیر مؤثر ہوگئی تھی؟

''کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے ابو.....!'' بڑے بیٹے منظور علی نے تشویش کے ساتھ کہا۔ ''اس طرح تو ہمارا کاروبار تباہ ہوجائے گا دیر سے سہی لیکن ہماری دوائیں اثر تو کرتی تھیں۔ اگر انہیں زیادہ عرصے تک استعمال کیا جاتا رہے' یہ دوا تو بالکل اثر ہی نہیں کررہی ہے..... ایسا کیا ہوا ہے؟'' تینوں باپ بیٹوں کی اس میٹنگ میں شمس الدین نے بھی شریک تھا۔

''فیضان علی کو بلواؤ۔'' منصور علی نے شمس الدین سے کہا۔ ''ذرا اس سے بھی بات کرکے دیکھتے ہیں۔''

''نہیں سر! ابھی نہیں۔'' شمس الدین نے کہا۔ ''فیضان علی سے ابھی کچھ نہ پوچھئے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں ان سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا پڑے۔''

''کیا مطلب؟'' منصور علی نے چونک کر پوچھا۔

''مطلب یہ سر کہ پہلے ہمیں اس دوا کا لیبارٹری میں پورا تجزیہ کرواکے دیکھنا ہے کہ اس میں کیا کمی ہے۔ میرے حساب سے اس میں جو معمولی سے کمی ہے اس کی وجہ سے افاقے کی مدت میں ذرا اضافہ تو ہوسکتا ہے' لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ بالکل افاقہ نہ ہو..... صاف بات یہ ہے کہ دوا کی تیاری میں کوئی بڑا ہیر پھیر کیا گیا ہے۔''

دوا کا لیبارٹری میں تجزیہ کروایا گیا' اس کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل ہی بیکار تھی' اس میں موجود بیشتر اجزاء بالکل جعلی تھے۔

''یہ کیسے ہوا؟'' منصور علی نے آنکھیں نکال کر شمس الدین سے پوچھا۔ ''یہ کس طرح ہوا؟ یہ سارے کے سارے اجزاء جعلی کیسے ہوگئے؟''

''مجھے شبہ تھا کہ کوئی گڑبڑ ہورہی ہے۔'' شمس الدین نے کہا۔ ''بعض اجزا کے رنگ اور بو مجھے کچھ بدلی بدلی لگ رہی تھی۔'' اور اس نے اس بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا۔ ''پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید مال کی نئی لاٹ ہے اس وجہ سے یہ فرق ہوگا اور یہ صرف میرا وہم ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ اجزاء میں ملاوٹ کی گئی تھی..... بڑے پیمانے کی ملاوٹ!''

''اور وہ کون کرسکتا ہے؟'' محمود علی نے جلدی سے پوچھا۔

''صرف ایک آدمی!'' شمس الدین نے کہا۔ ''فیضان علی..... مال کی پرچیزنگ وہی کرتا ہے اور خود چیک کرکے مال لاتا ہے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ فیصل کی فرم سے ملاوٹ والا مال فراہم کیا جاتا ہو۔''

"نہیں ..... سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" منصور علی نے اس سے فوراً اتفاق کیا۔ "کتنے برسوں سے وہ ہمیں مال سپلائی کر رہے ہیں۔"

"بلاؤ اس کمینے کو۔" منصور علی نے گرج کر کہا۔ "ابھی بلاؤ ..... ہم اس کو ابھی نوکری سے نکالیں گے اور اس کو پولیس کے حوالے کریں گے۔ یہ چار سو بیسی کا کیس ہے ..... چوری اور غبن کا کیس ہے۔"

"ایسا کچھ نہ کیجیے سر!" شمس الدین نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "صرف یہ کیجیے کہ اس سے باز پرس کیجیے اور حقیقت کی تصدیق ہو جانے کے بعد اس سے استعفیٰ لے لیجیے اور اس کو باہر کر دیجیے۔ ہم اگر اس معاملے کو اچھالیں گے تو اسکینڈل بنے گا' کمپنی کی شہرت کو پہلے ہی کافی نقصان پہنچ چکا ہے' اب اور زیادہ بدنامی ہوگی۔ آپ اگر اسے جان سے بھی مروا دیں گے تو بھی آپ کے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ وہ تو اپنا کام کر گزرا۔"

مالکوں کی سمجھ میں بات آ گئی۔ فیضان علی کو اسی وقت بلوایا گیا اور فیضو پر جب چاروں جانب سے کوڑے برسنے لگے تو وہ گھبرا گیا۔ وہ اپنا دفاع نہیں کر سکا۔ اس نے بات بنانے کی کوشش کی لیکن صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"تمہارے جیسے بدمعاش' نمک حرام اور ذلیل انسان کا علاج تو یہی ہے کہ اسے پچاس جوتے مارنے کے بعد پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔" منصور علی نے نفرت بھری آواز میں کہا۔

"ہم نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا اور تم کس قدر نیچ اور کمینے نکلے' اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ فوراً استعفیٰ دے کر یہاں سے اپنا منہ کالا کر جاؤ ..... پندرہ دن کے اندر اندر تمہیں مکان بھی خالی کرنا ہے ورنہ سامان اٹھوا کر باہر پھینکوا دوں گا۔ آج کے بعد سے تمہاری شکل دفتر کے اندر نظر نہ آئے ..... ابھی لکھو استعفیٰ اور شکر کرو ہم تم کو ہتھکڑی نہیں لگوا رہے ہیں۔"

فیضو سے اسی وقت استعفیٰ لکھوا لیا گیا اور وہ وہاں سے سیدھا اپنے گھر آ گیا جو کبھی بھی اس کا اپنا نہ تھا اور اب بھی اپنا نہیں تھا۔

اگلی صبح کو شمس الدین اس سے ملنے کے لیے اس کے گھر آیا۔ اب وہ نہ شمس الدین کا باس تھا اور نہ شمس الدین اس کا ماتحت۔ شمس الدین اس سے کسی بھی لہجے میں بات کر سکتا تھا۔

"شکر کرو میاں جان بچ گئی۔" شمس الدین نے اس سے کہا۔ "ایم ڈی صاحب تو تمہیں سیدھا سیدھا پولیس کے حوالے کر رہے تھے لیکن میں نے انہیں روک دیا' بچا لیا

تمہیں .....!"

"اس کی کوئی خاص وجہ .....؟" فیضو نے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہیں ڈسمس کر دیا جاتا تو تمہارا کیریئر تباہ ہو جاتا۔" شمس الدین نے کہا۔ "کسی دوسری جگہ نوکری بھی آسانی سے نہ ملتی۔ ابھی نوجوان آدمی ہو' زندگی برباد ہو جاتی' میں بھی نوکر آدمی ہوں' تم بھی نوکر تھے اور آئندہ بھی نوکر رہو گے۔ نوکری کرو تو سنبھل کر ورنہ کسی دن پھر اگر برے پھنس گئے تو ساری عمر جیل میں چکی پیستے رہو گے۔ بدمعاشی کرنے کے لیے سونے کی چھتری کا سایہ چاہیے۔ غریب آدمی کی گردن تو فوراً دبوچ لی جاتی ہے۔"

فیضو کو بڑا زبردست جھٹکا لگا تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا تھا۔ اگر وہ سنبھل کر چلتا جیسا کہ مقبول احمد بار بار اس سے کہتا تھا تو شاید معاملہ اتنی جلدی خراب نہ ہوتا۔

پندرہ دن کے اندر اندر گھر چھوڑنا تھا' کہاں جائے' ایک بات فیضو نے طے کر لی تھی کہ وہ سعود آباد کے کوارٹر میں دوبارہ واپس نہیں جائے گا۔ اس کے پاس خاصی رقم جمع ہو گئی تھی جس سے کافی عرصے تک اچھی طرح گزارہ ہو سکتا تھا' لیکن اسے اس پیسے کو بہت سنبھال کر خرچ کرنا تھا۔ آگے پیچھے مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا' اسے پہلی بار بری شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے اور ساتھ شمس الدین کے یہ الفاظ تو اس کے دل پر جیسے نقش ہو کر رہ گئے تھے کہ بدمعاشی کرنے کے لیے سونے کی چھتری کا سایہ چاہیے اور غریب آدمی کی گردن تو فوراً ہی دبوچ لی جاتی ہے۔ مالک لوگ کیسی ہی اندھی بے ایمانی کرتے تھے اور ان کے سامنے بھتہ خوروں کی لائن لگتی رہتی تھی ..... ان سے تو کبھی کوئی نہیں پوچھتا تھا۔

فیضو بہت اونچائی سے ایک دم نیچے گر گیا تھا اور اب اسے دوبارہ سنبھالا لینے کی ضرورت تھی۔ اس نے ناظم آباد میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور دادی کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا۔ دادی نے اس بات کی بہت زیادہ کرید نہیں کی کہ فیکٹری سے اس کی نوکری اچانک کیوں ختم ہو گئی۔ فیضو نے انہیں بس یہی بتایا تھا کہ مالکوں کی کسی بات پر اس کی ناراضگی ہو گئی تھی اور اب وہ ان کی نوکری چھوڑ رہا ہے۔

ناظم آباد میں دو سو گز پر بنا ہوا یہ مکان اگرچہ سعود آباد کے کوارٹر کے مقابلے میں بہت بڑا تھا لیکن اس مکان کے مقابلے میں چھوٹا تھا جس میں فیضو ابھی تک رہ رہا تھا لیکن نہ تو وہ اپنا تھا نہ یہ اپنا تھا۔ وہ تو اپنا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور فیضو کے دل میں گہرے زخم ڈال گیا تھا۔

فیضو اب نو آموز نہیں تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی دوا ساز کمپنی میں ذمہ دار عہدے پر

کام کرنے کا دوسالہ تجربہ تھا۔اس نے فوراً ہی دوسری نوکری کے لیے جدوجہد شروع کردی۔شمس الدین نے اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا اور اس کو ڈسمس ہونے سے بچالیا تھا' ورنہ دوسری جگہ نوکری ملنا بہت مشکل تھا۔دوماہ کی جدوجہد کے بعد اس کو دوسری دواساز کمپنی میں نوکری مل گئی۔ یہ فیکٹری سائٹ میں واقع تھی اور ایک غیر ملکی دواساز کمپنی کے لائسنس کے تحت پاکستان میں دوائیں بناتی تھی۔یہاں فیضو کو اسسٹنٹ مارکیٹنگ مینجر کی پوسٹ ملی۔کام کی نوعیت الگ تھی۔اس کا دواؤں کی تیاری' مال کی خریداری اور کوالٹی کی جانچ پڑتال وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔یہاں فیضو کا تعلق مارکیٹ سے تھا اور جلد ہی اس نے اس میدان میں تعلقات بڑھانے شروع کردیئے۔وہ اپنے علمی اور عملی تجربے اور اپنے بڑھتے ہوئے تعلقات کے باعث کمپنی کے لیے بہت مفید ثابت ہورہا تھا۔اس بار جو اسے ایک اچھی نوکری کا موقع ملا تھا تو وہ اسے پہلے کی طرح ضائع نہیں کردینا چاہتا تھا۔شمس الدین کی بات اس کے دل پر پوری طرح نقش ہوچکی تھی۔سونے کی چھتری کے سائے کے بغیر چھوٹے موٹے ہاتھ مارنے میں کچھ نہیں رکھا تھا۔ایک بار گرفت میں آگئے تو کوئی ضمانت کروانے والا بھی نہیں ہوگا۔

فیضو نے اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے تین سال گزار دیئے۔اس کو اچھی خاصی معقول تنخواہ مل رہی تھی۔دیگر مراعات بھی کافی تھیں۔وہ دلجمعی اور لگن کے ساتھ کام کرتے ہوئے اپنے مالکوں کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔اندرونی حالات یہاں بھی تقریباً وہی تھے جو منصور علی کی فیکٹری میں تھے۔فیضو نے گویا ان کی جانب سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں لیکن ذہن کے دریچوں کو ایک لمحے کے لیے بھی بند نہیں کیا تھا۔وہ اس پورے کاروبار کی رگ رگ سے واقف ہوتا جارہا تھا۔

فیضو نے اپنا فیڈرل بی ایریا والا پلاٹ اور سعود آباد کا کوارٹر فروخت کردیا اور اس مکان کو خرید لیا جس میں وہ رہ رہا تھا۔وہ مکان بک رہا تھا فیضو کے پاس کافی رقم موجود تھی۔وہ کرائے کے عذاب سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دادی اب زیادہ تر بیمار رہتی تھیں اور بہت کمزور ہوگئی تھیں۔ان کا مسلسل اصرار تھا کہ فیضو شادی کرلے۔اسے نوکریاں کرتے ہوئے تقریباً ساڑھے پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور دادی بڑی شدت کے ساتھ یہ چاہتی تھیں کہ ان کی زندگی میں ہی فیضو کی شادی ہوجائے۔

فیضو کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ دادی اب زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گی اور ان

کے گزر جانے کے بعد وہ بالکل اکیلا رہ جائے گا' گھر میں کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں ہو گا۔

شادی کی سیڑھی پر چڑھ کر کسی بہت اونچی اٹاری پر پہنچ جانے کا اس کا خواب پہلے ہی کرچی کرچی ہوچکا تھا اور اب وہ اس جستجو میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ بہت اونچی اٹاری تک پہنچنے کے لیے راستوں اور سیڑھیوں کی کمی نہیں تھی اور اپنی پانچ سال سے زیادہ کی مدت ملازمت میں وہ ان سے بخوبی واقف ہوچکا تھا۔

یاسمین ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر کی بیٹی تھی۔وہ بی اے' بی ٹی تھی اور ایک سرکاری اسکول میں پڑھاتی تھی۔یاسمین کا صرف ایک بڑا بھائی تھا اور وہ کسی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔فیضو اپنی شادی کے لیے کوئی ایسی لڑکی چاہتا تھا جو ذمہ داریوں کا کوئی بوجھ اپنے ساتھ نہ لائے۔وہ کسی لمبی چوڑی سسرال کا چکر نہیں پالنا چاہتا تھا۔یاسمین کا گھرانہ اس کے پڑوس میں ہی رہتا تھا۔یاسمین پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت اور پرکشش بھی تھی' چنانچہ جب کچھ پڑوسیوں نے اس سلسلے میں دلچسپی کا اظہار کیا اور فیضو سے اور اس کی دادی سے بات کی تو فیضو اس شادی کے لیے تیار ہوگیا۔دادی بہت خوش ہوئیں اور وہ ان پڑوسیوں کو لاکھوں دعائیں دیتی تھیں جنہوں نے یہ رشتہ لگایا تھا۔اصل میں تو اس رشتے کے لیے خفیہ جبنانی خود یاسمین کے گھر والوں کی طرف سے ہوئی تھی۔فیضو پڑھا لکھا' کماؤ پوت تھا اور اس خاندان میں ایک بوڑھی دادی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔سسرال نہ ہونے کے برابر تھی اور اس لیے سسرال سے وابستہ عمومی مسائل کا بھی کوئی وجود نہیں تھا۔

فیضو اور یاسمین کی شادی ہوگئی۔فیضو اس شادی سے خوش تھا۔یاسمین نہ تو لنگڑی تھی نہ بدصورت.....اور نہ وسیع کاروبار اور جائیداد میں حصہ دار.....تاہم وہ خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھی اور خود بھی برسرِ روزگار تھی۔

شادی کے وقت ایک عرصہ دراز کے بعد فیضو کے دل میں شاکرہ کی یاد نے ہولے سے سر ابھارا۔یہ فرقتوں کی آنچ میں جلتی ہوئی کوئی غم انگیز یاد نہیں تھی' فیضو کی زندگی میں تو غم ہجر جیسی کسی چیز کا کوئی تصور بھی نہیں تھا اور شاکرہ کو تو اس نے خود ہی مسترد کردیا تھا۔شاکرہ کی یاد تو اتنے عرصے کے بعد شادی کے موقع پر خود بخود یوں ہی اس کے دل میں ابھر آئی تھی۔

اسے ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ وہ کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ برسوں گزر گئے تھے ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔

''شاکرہ تو کب کا ایم اے کرچکی ہوگی۔'' اس نے دل میں سوچا۔''اس زمانے میں

بھی وہ کسی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ شاید اب بھی پڑھا رہی ہو اور مسعودہ.....؟ شاید وہ ڈاکٹر بن چکی ہوگی۔''

یاسمین کے ساتھ فیضو کی ازدواجی زندگی کا انداز بالکل میکانکی قسم کا تھا' جس میں کسی غیر معمولی گرم جوشی اور جاں فروشی جیسے جذبوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یاسمین اس کی بیوی تھی اور اب اسے اس کے ساتھ رہنا تھا وہ مطمئن تھا کہ دادی اب اکیلی نہیں رہی ہیں اور اگر کل کلاں کو ان کی آنکھ بند ہو جائے تو اسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ گھر میں ایک عورت موجود تھی جو گھر کو سنبھال سکتی تھی۔ یہ فیضو کی ضروریات کا ایک حصہ تھا۔

دادی' فیضو کی شادی سے بہت خوش تھیں۔ انہوں نے رو رو کر فیضو سے کہا کہ انہیں اس شادی سے سچی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ ''اے بھیا.....! اب تک تو بس روتے' بھنکتے اور اکیلے پن کی مار سہتے ہی گزری ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہاری دلہن آ گئی۔ اب وہ گھر کی مالکن ہوں گی اور ہمیں ذرا کمر سیدھی کرنے کا موقع ملے گا۔ ہماری تو ساری عمر گزر گئی اپنی ہڈیاں پیلتے ہوئے۔''

''ہم نے تو تم سے کتنا کتنا کہا دادی کہ اوپر کے کام کاج کے لیے کوئی عورت رکھ لو۔'' فیضو نے کہا۔ ''مگر تم خود ہی تیار نہیں ہوئیں۔''

''لو بھلا اے ساری زندگی کام کیا ہے بیٹا.....! جب اپنے ہاتھ پیر چلتے ہوں تو پھر آدمی دوسرے کی محتاجی کیوں مول لے؟ اور پھر نوکروں کا کیا بھروسا جانے کیسا کام کریں اور کیسا نہ کریں۔ اب تمہاری دلہن آ گئی ہیں وہ سنبھال لیں گی اپنا گھر.....!''

لیکن یاسمین کے لیے اس طرح گھر کو سنبھالنا ممکن نہیں تھا جس طرح دادی چاہتی تھیں۔ یاسمین صبح اسکول چلی جاتی تھی اور پھر دوپہر کے ڈیڑھ بجے کے قریب واپس آتی تھی۔

دادی کو بڑی مشکل سے اس بات کے لئے تیار کیا گیا کہ گھر میں ایک کام کرنے والی ملازمہ رکھ لی جائے تاکہ دادی اور یاسمین پر کام کا زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ چنانچہ ایک جان پہچان کی اور قابلِ اعتماد ملازمہ رکھ لی گئی۔ اس عورت کی بہن یاسمین کے والدین کے گھر میں کام کرتی تھی۔ اب وہ عورت صبح ہی آ جاتی تھی اور سب کو ناشتہ تیار کر کے دیتی تھی۔ یاسمین اور فیضو تو اپنے اپنے کام پر چلے جاتے تھے اور پھر دادی اس عورت کے ساتھ مل کر کام میں لگ جاتی تھیں۔ ملازمہ انہیں بہت منع کرتی تھی کہ وہ آرام کریں اور وہ سارا کام خود کر لے گی لیکن دادی کو اس وقت تک چین نہیں پڑتا تھا جب تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے کام نہ کر لیں۔

''کیا کریں.....!'' وہ مسکرا کر کہتیں۔ ''اے ساری عمر کی عادت پڑی ہوئی ہے نگوڑ ماری..... کبھی نچلا بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا تو اب بھی اگر کچھ نہ کریں تو جی کو چین نہیں ملتا۔''

دادی کے جی کو چین صرف اس وقت ملا جب فیضو کی شادی کے چھ ماہ بعد ان پر فلو کا زبردست حملہ ہوا اور وہ بستر سے لگ گئیں۔ شروع میں تو معمولی سا نزلہ' بخار تھا لیکن پھر اس میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں۔ ان کا بخار نمونیہ میں بدل گیا اور انہیں اسپتال میں داخل کروانا پڑا جہاں ایک ہفتہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ انتقال کر گئیں۔ انہیں زندگی میں خوش اور مطمئن ہونے کا جو وقت ملا تھا' وہ بہت مختصر تھا۔

فیضو اس بات سے بہت مطمئن تھا۔ دادی کی موت اس وقت واقع ہوئی جبکہ فی الحقیقت اسے ان کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اتنی کمزور اور بوڑھی ہو چکی تھیں کہ اب ان سے کوئی کام ٹھیک سے ہو نہیں پاتا تھا۔ فیضو نے ملازمہ کو رکھنے پر آمادگی بھی اس لیے ظاہر کی تھی کہ اب اس کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ دادی کو چھوٹے موٹے کاموں میں بہت دیر لگ جاتی تھی اور پھر کام بھی مناسب طور پر نہیں ہو پاتے تھے..... دادی اب محض ایک فاضل شے بن کر رہ گئی تھیں۔ یاسمین کے آ جانے کے بعد تو ان کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

دادی رخصت ہوئیں تو فیضو کے اپنی پرانی دنیا سے گویا سارے رشتے ناتے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ دادی زندہ تھیں تو اس وقت جبکہ یاسمین موجود نہیں ہوتی تھیں' کبھی اماں کا ذکر نکال بیٹھتیں اور انہیں گالیاں اور کوسنے دینے شروع کر دیتیں۔ انہوں نے ابھی تک نہ تو اماں کو بھلایا تھا اور نہ انہیں معاف کیا تھا۔ کبھی وہ ابا کو یاد کر کے رونے لگتیں اور ان کی ناوقت موت کا ماتم کرنے لگتیں۔ کبھی وہ شوکت چچا اور شمسن چچی وغیرہ کے بارے میں باتیں کرنے لگتیں جن کے ساتھ ان کی آخری ملاقات کو ایک طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ دادی کی موت کے بعد فیضو سے اس کے ماضی کے بارے میں باتیں کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ ماضی کے سارے قصے وقت کے ویران قبرستان میں دفن ہو چکے تھے' جہاں کوئی دیا جلانے والا یا پھول چڑھانے والا موجود نہیں تھا۔

''اگر کہیں دادی میری شادی سے پہلے مر جاتیں تو بڑی مشکل ہو جاتی۔'' اس نے دل ہی دل میں مطمئن انداز میں کہا۔ ''اچھا ہوا کہ وہ اس وقت مریں جب گھر کو سنبھالنے کے لیے یاسمین موجود تھی اور ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔''

اس روز فیضو بندر روڈ پر اپنے دفتر کی گاڑی سے اترا۔ اسے میریٹ روڈ جانا تھا جہاں دواؤں کی ایک ہول سیل کی دکان کے مالک سے کچھ بات کرنی تھی۔ وہ ابھی راستے میں ہی

تھا کہ اچانک وہ اچھل پڑا کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اس نے جلدی سے پلٹ کر پیچھے دیکھا..... ایک مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے تھا جس کے نقوش میں شناسائی کی واضح جھلک موجود تھی لیکن وہ فوری طور پر اس چہرے کو پوری طرح سے پہچان نہیں سکا تھا۔

''نہیں پہچانا.....؟'' اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا اور فیضو کو اس کی آواز سنتے ہی اس کی شناخت یاد آ گئی۔ وہ جلدی سے اس سے بغل گیر ہو گیا۔

''پہچان لیا..... بالکل پہچان لیا۔'' فیضو نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔ ''لیکن! تم کافی بدل گئے ہو..... پہلے تمہارے چہرے پر داڑھی تو نہیں تھی۔''

''ہاں!'' اس شخص نے کہا۔ ''گزشتہ سال حج پر گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو پھر یہ چھوٹی سی داڑھی رکھ لی..... تمہارے بارے میں مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تم سائٹ کی ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کر رہے ہو۔''

''ہاں!'' فیضو نے کہا۔ ''اور تم؟''

''میں..... میں بھی بس کچھ چھوٹے موٹے دھندے کر لیتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کمیشن پر کیمیکلز کی خرید و فروخت اور سپلائی وغیرہ کا کچھ کام کرتا ہوں' بس بھائی گزارہ ہو جاتا ہے کسی طرح!''

''چلو ٹھیک ہے۔'' فیضو نے کہا۔ ''گزارہ ہونا چاہئے کسی نہ کسی طرح!''

''بس بھائی! گاڑی کھینچ رہے ہیں۔'' اس شخص نے کہا۔

''اور..... وہ تمہارے خلاف پولیس کیس کا کیا ہوا؟'' فیضو نے محتاط انداز میں رک رک کر اس سے پوچھا۔

''پولیس کیس.....؟'' اس نے زہر خند کے ساتھ کہا۔ ''ان کی کیا مجال کے میرے خلاف پولیس کیس بناتے۔ میری ایک ہی دھمکی میں ان کی سٹی گم ہو گئی اور انہوں نے کیس واپس لے لیا۔''

اس شخص کا نام مقبول احمد تھا اور وہ فیصل خان کی امپورٹ فرم کا وہ انچارج تھا جو فیضو کے ساتھ مل کر ان دنوں کیمیکلز میں ملاوٹ کرتا تھا جب فیضو' منصور علی کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ حقیقت کا انکشاف ہو جانے کے بعد فیضو کو منصور علی نے اپنی فیکٹری سے اس طرح نکال دیا تھا کہ اس سے استعفیٰ لکھوا لیا تھا' لیکن مقبول احمد فرار ہو گیا تھا۔

فرم کے مالک فیصل خان نے مقبول احمد کے خلاف غبن' چوری اور مال میں ملاوٹ کے

الزام میں ایف آئی آر درج کرا دی تھی اور پولیس مقبول احمد کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارتی پھر رہی تھی۔

اس سلسلے میں پولیس نے فیضو سے رابطہ قائم کیا تھا اور اس سے پوچھا کہ آیا وہ مقبول احمد کے بارے میں کچھ جانتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا؟ فیضو نے یہی کہا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا ہے۔ فیضو کے خلاف کسی نے بھی کوئی کیس درج نہیں کرایا تھا' لیکن چونکہ فیضو مقبول احمد سے مال لے کر جاتا تھا' اس لیے پولیس نے اس سے بھی پوچھ گچھ کی تھی۔

لیکن مقبول احمد کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ فیضو کو اگرچہ اس کے مالکان نے بچا لیا تھا' تاہم اس کے دل میں یہ خوف رہتا تھا کہ گرفتاری کی صورت میں مقبول احمد اس کا نام بھی لے سکتا ہے اور اس طرح اس کے لیے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ فیضو نے حالات پر نظر رکھی تھی لیکن مقبول احمد پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔ معلوم نہیں وہ کدھر نکل گیا تھا۔

اور آج تقریباً ساڑھے تین سال کے بعد مقبول احمد اس کو اچانک مل گیا تھا کہ اس نے داڑھی رکھ لی تھی کیونکہ وہ حج کر کے آیا تھا۔

فیضو اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اسے ایک قریبی ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل میں وہ دونوں ایک الگ تھلگ میز پر بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس کوئی نہیں تھا انہوں نے دھیمی آوازوں میں بات چیت شروع کر دی۔

''تم پولیس سے کس طرح بچے؟'' فیضو نے اس سے پوچھا۔

''ان لوگوں نے تو میرے خلاف پوری کارروائی کر ڈالی تھی۔'' مقبول احمد نے کہا۔ ''پولیس میں ایف آئی آر درج کرا دی تھی اور میں چھپتا پھر رہا تھا۔ پھر میں نے مالکوں کو پیغام بھجوایا کہ میں خود کو پولیس کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔''

''اچھا؟'' فیضو نے تعجب سے کہا۔ ''تو کیا تم واقعی ایسا کرنے جا رہے تھے؟''

''بالکل.....'' مقبول احمد نے کہا۔ ''دیکھو نا' میں یوں چھپ چھپ کر کب تک بھاگتا پھرتا؟ میری تو زندگی عذاب ہو گئی تھی' اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ہم تو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ میرے پاس اس بات کے دستاویزی ثبوت موجود تھے کہ یہ لوگ اجازت یافتہ کیمیکلز کی آڑ میں مہنگی ممنوعہ اشیاء سستے داموں درآمد کرتے تھے اور انہیں مارکیٹ میں بھاری قیمت پر بیچتے تھے۔ انڈر وائسنگ کرتے تھے' مال کی قانونی امپورٹ کے پردے میں بہت سے غیر قانونی دھندے ہوتے تھے اور میں نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھی تھیں۔ میں نے اسی دن کے لیے سارے ثبوت اکٹھے کر کے رکھے تھے کہ کہیں کسی دن یہ لوگ

میری گردن میں پھندا ڈالنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ میں خود تمہارے جیسے دوستوں کے ساتھ مل کر دو پیسے کمانے کے چکر میں رہتا تھا اور یہ کام خطرے سے خالی نہیں تھا۔"

"اوہ..... تو تم پہلے ہی سے ہوشیاری برت رہے تھے۔" فیضو نے حیرت سے کہا۔

"تو کیا میں اپنی گردن ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتا؟" مقبول احمد نے ہنس کر کہا۔ "بس جناب' میں نے فیصل خان کو پیغام بھجوایا کہ میں خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہوں اور ان کا بھی کچا چٹھا پولیس کو مع دستاویزی ثبوت کے بتا دوں گا۔ اس پر وہ لوگ گھبرا گئے اور فوراً کمپرومائز پر آمادہ ہو گئے۔ اصل میں انہیں خوف پولیس کا نہیں تھا بلکہ کاروبار کی تباہی کا خوف تھا۔ میں نے ان سے کہا سب سے پہلے تو وہ میرے خلاف اپنی ایف آئی آر واپس لیں۔ چنانچہ انہوں نے ایف آئی آر واپس لے لی۔ میرے خلاف کوئی کیس نہ رہا اور میں آزاد ہو گیا لیکن میرے لیے کسی دوسری جگہ نوکری ملنا مشکل تھا' کیونکہ میرے خلاف کیس کی خبر تو سب ہی جگہ پھیل چکی تھی۔ کچھ عرصہ تک میں ایک کمپنی میں کمیشن پر سیلز مین کا کام کرتا رہا' لیکن وہ کمپنی بیٹھ گئی کیونکہ مالکوں میں آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ میرے پاس اچھے خاصے پیسے جمع تھے۔ میں نے سوچا کہ ابھی جوانی میں حج کر لوں تو اچھا ہے' بہت سارے گناہ دُھل جائیں گے۔ اللہ معاف کرنے والا ہے وہ آئندہ بھی معاف کر دے گا۔ چنانچہ میں نے حج کے لیے درخواست دے دی۔ خوش قسمتی سے میرا نام نکل آیا اور میں حج کرنے چلا گیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد بس یہی چھوٹے موٹے دھندے کرتا رہتا ہوں۔ اب اس کوشش میں ہوں کہ کہیں کوئی موقع کی دکان کرائے پر لے کر یا خرید کر ایک چھوٹا سا میڈیکل اسٹور شروع کروں۔ بڑی زبردست کمائی ہے اس دھندے میں' بشرطیکہ ہوشیاری کے ساتھ اور سمجھ بوجھ کر کیا جائے۔"

"ہاں۔" فیضو نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "خیال تو بہت اچھا ہے۔ ہم دونوں اس کے بارے میں مل کر بھی سوچ سکتے ہیں۔"

"تو پھر سوچو برادر!" مقبول احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں پہلے بھی مل کر کام کرتے رہے ہیں اور اگر مل جل کر کام کرنے کی کوئی نئی صورت نکل آتی ہے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"بالکل نکالیں گے۔" فیضو نے کہا۔

دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے' انہوں نے ایک دوسرے کے پتے لے لیے اور اگلی ملاقات کے بارے میں طے کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

منصور علی کی فیکٹری سے نکال دیئے جانے کے بعد فیضو بہت محتاط ہو گیا تھا اور اس وقت تک کوئی بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جب تک وہ اس کے لیے پوری طرح تیار نہ ہو جائے اس نے تین سال تک نئی فیکٹری میں بڑی احتیاط کے ساتھ کام کیا اور مالکوں اور ساتھیوں کا اعتماد حاصل کرتا رہا' نیز اپنے حلقۂ اثر و رسوخ اور تعلقات عامہ کے دائرے کو بھی برابر وسیع کرتا رہا۔ اس نے بہت سے اہم لوگوں تک کسی نہ کسی طرح رسائی حاصل کر لی۔

اپنے پرانے ساتھی مقبول احمد سے ملاقات کے بعد اس نے نئے اقدامات کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ وہ ساری زندگی ایک کمپنی کا نوکر بن کر نہیں گزار سکتا تھا۔ اسے تو منصور علی اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی سطح تک پہنچنا تھا۔

مقبول احمد سے اس کی ملاقاتوں اور بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے۔ جلد ہی ان دونوں نے مل کر ایک منصوبے کا آغاز کر دیا۔

اس منصوبے کے پہلے مرحلے میں تو ایک چھوٹا سا میڈیکل اسٹور قائم کیا گیا' جیسا کہ مقبول احمد کی خواہش تھی۔ فیضو دودھ کا جلا تھا اور اب وہ چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا وہ ٹھوس اور محفوظ ترین منصوبہ بندی کے ساتھ کرنا تھا۔

میڈیکل اسٹور میں کچھ پیسہ تو مقبول احمد نے لگایا اور اس سے زیادہ پیسہ فیضو نے لگایا کیونکہ مقبول احمد کے پاس تو زیادہ رقم تھی بھی نہیں' لیکن فیضو کو بھی بہت زیادہ پیسہ لگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے اپنے اثر و رسوخ اور تعلقات عامہ سے کام لیتے ہوئے میڈیکل اسٹور کے لیے زیادہ تر دوائیں کریڈٹ پر حاصل کر لیں۔ میڈیکل اسٹور مقبول احمد کے نام پر تھا۔ دکان کا کرایہ نامہ بھی مقبول احمد کے نام سے بنوایا گیا تھا۔ کسی بھی سند پر کہیں بھی فیضان علی کا نام نہیں تھا۔ ہر جگہ صرف مقبول احمد کا نام تھا۔ مقبول احمد خود ہی دکان پر بیٹھتا تھا لیکن طے شدہ منصوبے کے تحت مقبول احمد کے ایک قابل اعتماد رشتہ دار لڑکے کو جس کا نام سرفراز تھا ساتھ رکھ لیا گیا تھا۔ سرفراز میٹرک پاس تھا اور کچھ دنوں تک کسی ڈسپنسری میں کام کر چکا تھا۔ وہ دواؤں وغیرہ کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت جانتا تھا۔ مقبول احمد اس کو بڑی تیزی کے ساتھ ٹریننگ دے رہا تھا۔

کچھ دنوں میں میڈیکل اسٹور اچھا خاصا چلنے لگا اور اس سے آمدنی ہونے لگی۔ مقبول اور فیضو دونوں خوش تھے۔ لیکن یہ پھٹیچر سا میڈیکل اسٹور فیضو کی منزل نہیں تھا۔ اسے ابھی بہت آگے جانا تھا۔ تاہم آغاز تو ہو چکا تھا' تنخواہ کے علاوہ ایک اور ذریعہ آمدنی ہاتھ آ گیا تھا۔ فیضو جس کمپنی میں کام کرتا تھا وہ ایک مشہور غیر ملکی کمپنی کے لائسنس کے تحت اس کمپنی

کی بعض دوائیں مقامی طور پر پاکستان میں تیار کرتی تھی۔ ان میں سے بعض بہت مہنگی دوائیں بھی تھیں کیونکہ ان کی تیاری میں شامل ہونے والے اجزاء بہت مہنگے تھے۔

فیضو اس تکنیک سے بخوبی واقف تھا کہ مہنگے اجزاء کے بغیر یا ان کی مطلوبہ مقدار میں کمی کر کے، جعلی دوائیں کس طرح تیار کی جائیں اور خود مقبول احمد بھی اس بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

لالوکھیت کی گھنی آبادی میں کارخانوں اور طرح طرح کے چھوٹے موٹے کارخانوں سے اَٹے ہوئے ایک علاقے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر حاصل کیا گیا۔ مالک مکان کو بتایا گیا کہ اس مکان میں بچوں کے لئے میٹھی گولیاں اور چاکلیٹ وغیرہ بنانے کے لیے مشینیں لگائی جائیں گی۔

یہ جگہ بھی مقبول احمد کے نام سے کرائے پر لی گئی۔ کرایہ نامے میں فیضان علی کا کوئی ذکر، کوئی حوالہ نہیں تھا۔ مشینوں وغیرہ کی خریداری کے سلسلے میں بھی صرف مقبول احمد کا نام استعمال کیا گیا اور ان ساری باتوں کے لیے فیضو کے پاس ایک ٹھوس جواز موجود تھا۔ وہ ایک دواساز کمپنی کا باقاعدہ ملازم تھا اور اس کے لیے الگ سے ذاتی کاروبار کرنا مناسب نہیں تھا۔

لالوکھیت کے اس چھوٹے سے مکان میں، جو تنگ و تاریک گلیوں کے اندر گھرا ہوا تھا اور ایسے علاقے میں واقع تھا جہاں گھروں اور دکانوں میں طرح طرح کی چیزیں بنائی جاتی تھیں۔ خفیہ طور پر دواسازی کا کاروبار شروع کر دیا گیا۔

لیکن صرف دواسازی ہی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے اور بھی بہت سے لوازمات تھے۔ پیکنگ، لیبل، ڈبے، شیشیاں اور بوتلیں وغیرہ..... ان سب چیزوں کا بھی مناسب طور پر بندوبست کر لیا گیا۔ مطلوبہ شکل وصورت اور جسامت کی شیشیاں اور بوتلیں وغیرہ تیار کروانا تو مشکل نہیں تھا، لیکن لیبل چھپوانا اور پیکنگ کے ڈبے وغیرہ چھپوانا ایک خطرناک اور دشوار کام تھا لیکن فیضو اپنے تجربے سے خوب جانتا تھا کہ خطرناک اور دشوار کام کس طرح اور کس جگہ کئے جاتے ہیں اور ان کو کرنے والے لوگ کہاں پائے جاتے ہیں۔ فیضو اور مقبول احمد نے مل کر تمام انتظامات مکمل کر لئے، لیکن فیضو نے ان کاموں میں بھی مقبول احمد کو ہی آگے رکھا اور خود سامنے نہیں آیا۔ اس کا ٹھوس جواز موجود تھا کہ وہ ایک بڑی دواساز کمپنی سے تعلق رکھتا ہے اور اس فیلڈ سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ اس کو جانتے ہیں، اس لیے اس کا سامنے آنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ مقبول احمد کو خود بھی اس بات سے پورا اتفاق تھا۔ اس نے سارے عملی کام کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔ فیضو پیسہ لگاتا رہا، فنی مدد کرتا رہا تھا اور منصوبہ سازی میں شریک

تھا۔ ان دونوں کے درمیان یہ بھی طے پا چکا تھا کہ اگر دونوں میں سے کبھی کوئی ایک پکڑا گیا تو وہ دوسرے کا نام نہیں لے گا، تاکہ دوسرا شخص باہر رہ کر اس کی قانونی اور غیر قانونی مدد کر سکے۔

سب سے پہلے فیضو کی کمپنی میں تیار کی جانے والی ایک قدرے کم مہنگی غیر ملکی دوا کا انتخاب کیا گیا۔ یہ دوا چھوٹے پیمانے پر امپورٹ بھی ہوتی تھی، لیکن بڑے پیمانے پر اس کی تیاری کراچی میں ہونے لگی۔

فیضو اس بار پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اترا تھا۔ وہ پہلے کی طرح کسی حماقت کا ارتکاب کر کے اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ دواؤں کی تیاری کا کام شروع کرنے سے پہلے ہی اس نے علاقے کے تھانے والوں کا بھتہ مقرر کر دیا۔ بھتے کی ادائیگی اور پولیس والوں کے ساتھ لین دین اور تعلقات کے معاملے کو فیضو نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ تاہم اس نے اپنے دوست اور ''رشتے کے بھائی'' کی حیثیت سے مقبول احمد کا پولیس والوں سے تعارف ضرور کروا دیا۔ چنانچہ اب اس امر کا پورا اطمینان تھا کہ پولیس کا چھاپہ کبھی نہیں پڑے گا اور اگر کبھی ایسی نوبت آنے والی ہوگی تو فیضو یا مقبول احمد کو پہلے ہی اس کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔

جعلی دوا کی پہلی کھیپ، جو مختصر مقدار میں تیار کی گئی تھی ''مقبول میڈیکل اسٹور'' میں رکھی گئی اور اس کی فروخت شروع کر دی گئی۔ مقبول احمد اب دو جگہ کام کر رہا تھا۔ وہ میڈیکل اسٹور میں بھی بیٹھتا تھا اور جعلی دوائیں بنانے والے مکان میں بھی، جسے یہ لوگ ''کارخانہ'' کہتے تھے۔ سرفراز ایک قابلِ اعتماد اور ہوشیار لڑکا تھا اور مقبول احمد کی عدم موجودگی میں میڈیکل اسٹور کو پوری طرح سے سنبھال لیتا تھا۔

مقبول احمد میڈیکل اسٹور میں رکھی گئی جعلی دوا جلد ہی ساری کی ساری فروخت ہو گئی۔ وہ دونوں اس کامیابی پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ان کو زبردست اور حیرت انگیز منافع حاصل ہوا تھا۔ جعلی دوا کی تیاری میں انہوں نے سابقہ غلطی نہیں دہرائی تھی۔ یعنی اس میں کم کئے جانے والے اجزاء کو اتنا کم نہیں کیا تھا کہ دوا بالکل ہی بے اثر ہو جائے، بلکہ اس کی اثر انگیزی کو اس حد تک باقی رکھا گیا تھا کہ وہ فوری طور پر مارکیٹ میں ایک دم فیل نہ ہو جائے۔ اس ہیر پھیر میں بھی انہیں بہت بھاری منافع حاصل ہوا تھا۔

''اب ہوئی ناکام کی بات!'' مقبول احمد نے فرطِ مسرت سے سرشار ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے خالص اپنا کام..... جس میں کسی کا دخل نہیں۔ سب کچھ اپنے ہاتھ میں ہے۔ کیا شاندار منافع ہو رہا ہے۔''

سب سے پہلے تو اس منافع سے ہم دونوں اپنے اپنے انویسٹ منٹ کی رقم واپس حاصل کرلیں۔'' فیضو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جب ہماری لگائی ہوئی ساری رقم ہمیں واپس مل جائے' اس کے بعد جو منافع ہو تو اس کو سمجھو کہ منافع ہے..... اس سے پہلے کچھ بھی نہیں.....''

''بات بڑے پتے کی کہتے ہو استاد۔'' مقبول احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''واقعی .....ابھی تو کوئی منافع سمجھنا ہی نہیں چاہیے۔''

کچھ ہی دنوں کے بعد اس جعلی دوا کی سپلائی کا دائرہ مقبول احمد میڈیکل اسٹور سے کچھ آگے بڑھا دیا گیا۔ اس کام میں بھی فیضو نے مقبول احمد کو ہی آگے رکھا۔ اس نے مقبول احمد کو بعض ایسے سیلز مینوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کیں جو زیادہ کمیشن کے لالچ میں اصلی دواؤں کے ساتھ ملا کر جعلی دوائیں بھی دکانوں پر سپلائی کرتے تھے۔ ان سیلز مینوں کی مدد سے ان لوگوں کے کارخانے کی تیار کردہ دوا آہستہ آہستہ دوسرے میڈیکل اسٹوروں تک بھی پہنچنے لگی۔ فیضو بالکل الگ تھلگ ''باہر'' کھڑا ہوا تھا اور مقبول احمد ہی ان سیلز مینوں سے رابطہ رکھتا اور انہیں مال سپلائی کرتا تھا۔ جسے وہ آگے پھیلا دیتے تھے۔

منافع کی شرح اس قدر زیادہ ہوگئی کہ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ دونوں مل کر کیمیکلز چراتے تھے اور ان سے حاصل ہونے والی رقم کو آپس میں بانٹ لیتے تھے' اب معاملہ صرف کیمیکلز چرانے کا نہیں تھا اب تو بے حد سستی دوا تیار کر کے بے حد مہنگی بیچ رہے تھے۔ کمیشن وغیرہ نکال کر بھی بھاری بچت ہو رہی تھی۔

چند ماہ کے اندر اندر ہی انہوں نے ایک اور مہنگی دوا بھی تیار کرنی شروع کردی۔ مقبول احمد نے اپنی مدد کے لیے ایک اور قابلِ اعتماد آدمی کو بھی رکھ لیا تھا کیونکہ کام بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس آدمی کو اس کام کی ساری تفصیلات سے واقفیت نہیں تھی۔

دو سال کے اندر اندر ان کا کاروبار کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ اندھی کمائی ہو رہی تھی' غیر ملکی برانڈ کی کئی مہنگی دوائیں بے حد کم لاگت سے تیار کر کے بھاری قیمت پر بیچی جا رہی تھیں۔ جو رقم ان دونوں نے اس کاروبار میں مل کر لگائی تھی اور جس میں میڈیکل اسٹور میں لگائی جانے والی رقم بھی شامل تھی وہ ساری کی ساری واپس مل چکی تھی اور اب تو صرف منافع ہی منافع تھا' کھرا منافع..... تھوڑی سی پیداواری لاگت اور متفرق اخراجات کے بعد دواؤں کی نیم جان اور نیم مردہ گولیاں ان کے لیے سونا اگلنا شروع کردیتی تھیں۔

مقبول احمد میڈیکل اسٹور میں بھی توسیع کرنا چاہتا تھا اور اسے زیادہ بڑا کرنا چاہتا تھا' لیکن فیضو نے اس تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔

''اس کو چھوٹا ہی رہنے دو۔'' اس نے مقبول احمد سے کہا۔ ''خواہ مخواہ دوسروں کی نظروں میں آنے سے کیا فائدہ؟ ہمارا اصل کام تو اپنی تیار کردہ دواؤں کو زیادہ سے زیادہ بیچنا ہے۔ عام دواؤں کی فروخت سے ہمیں کون سا غیر معمولی منافع مل جاتا ہے؟''

مقبول احمد کی سمجھ میں بات آگئی۔

اس روز کمپنی کے جنرل منیجر نے فیضو سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ ''فیضان صاحب بعض ڈاکٹروں کی جانب سے ہماری بعض دواؤں کے ناقص اور غیر معیاری ہونے کی شکایتیں مل رہی ہیں۔ حالانکہ ہمارے یہاں تو یہ دوائیں پہلے کی طرح تیار ہو رہی ہیں' لیکن ادھر چند ماہ سے شکایات کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں ایم ڈی صاحب نے رپورٹ مانگی ہے۔ وہ پوری انکوائری کروانا چاہتے ہیں۔ شاید پولیس کی بھی مدد لیں۔ آپ ذرا مارکیٹ میں چیک تو کیجیے۔ کہیں کوئی ہمارے نام سے نقلی مال تو نہیں سپلائی کر رہا ہے۔''

''مجھے خود بھی شبہ ہے سر کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔'' فیضو نے فوراً کہا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ بعض دوائیں ہم جتنی مقدار میں سپلائی کر رہے ہیں مارکیٹ میں وہ اس سے کچھ زیادہ ہی مقدار میں موجود ہیں۔ آپ ایم ڈی صاحب کو بتا دیجیے کہ میں اب اس مہم پر لگ رہا ہوں' وہ فکر نہ کریں' میں جلد ہی سب کچھ معلوم کرلوں گا۔''

فیضو کے لیے حکمتِ عملی تبدیل کرنے کا وقت آگیا تھا۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس سے نمٹنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھا تھا۔

وہ اسی شام کو علاقے کے تھانے کے ایس ایچ او شہباز خان کے پاس گیا جس کے ساتھ اس کا مستقل معاملہ طے تھا۔

''آیئے فیضان صاحب۔'' شہباز خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کچھ دن پہلے نہیں آگئے؟''

''جی ہاں!'' فیضو نے کہا۔ ''میں چند دن پہلے ہی آیا ہوں۔'' اس نے اپنی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر ایس ایچ او کی طرف بڑھا دیا جسے ایس ایچ او نے فوراً ہی اپنی جیب میں منتقل کردیا۔

''بات یہ ہے کہ ہم لوگ جگہ بدل رہے ہیں۔'' فیضو نے ہلکی سرگوشی میں کہا۔ ''فی الحال کچھ دنوں کے لیے کام بند کریں گے۔ کچھ شک ہوگیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بات بہت اوپر تک پہنچ جائے اور پھر آپ کے لیے بھی سنبھالنا مشکل ہوجائے۔ اس لیے احتیاط لازمی ہے۔''

''آپ بالکل [illegible] ہیں۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''اگر کچھ دنوں کے لیے کام

روک دیں تو کوئی حرج نہیں اور پھر جب بھی دوبارہ شروع کریں میرے علاقے میں ہی شروع کریں اور آرام سے کرتے رہیں۔"

"آپ ہی کے علاقے میں کریں گے۔" فیضو نے کہا۔ "بلکہ آپ خود ہی کوئی دوسری موقع کی جگہ دلوا دیجئے گا۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ایس ایچ او نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کو بالکل بھروسے کی جگہ دلوا دیں گے۔"

"شکریہ خان صاحب۔" فیضو نے کہا "بس آپ کا تعاون چاہئے۔ ہم تو جو کچھ بھی کریں گے، آپ کے تعاون سے ہی کریں گے اور آپ کا حصہ پہلے آئے گا، ہمارا بعد میں۔"

دو دن کے بعد فیضو اپنی کمپنی کے ایم ڈی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ جنرل منیجر اور مارکیٹنگ منیجر بھی موجود تھے۔

"سر، جان پر کھیل کر انفارمیشن حاصل کی ہے۔" فیضو نے ایم ڈی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بس اب آپ لوگوں کو دست بستہ گزارش یہی ہے کہ میرا نام کہیں نہ آئے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مقامی تھانے کے کچھ لوگ بھی ملوث ہوں۔ مجھے جان سے مروا دیں گے وہ لوگ سر..... ایسا کام کرنے والے بڑے خطرناک ہوتے اور عام طور سے انہیں پولیس کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔"

"آپ کی جان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے فیضان صاحب!" ایم ڈی نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھئے۔ آپ کا نام کہیں نہیں آئے۔ بتایئے کیا انفارمیشن ہے آپ کی؟"

"انفارمیشن یہ ہے کہ سر لالوکھیت میں ایک جگہ ہماری کمپنی کے نام سے جعلی دوائیں بن رہی ہیں اور مارکیٹ میں چلائی جا رہی ہیں۔" فیضو نے کہا۔ "یوں سمجھئے کہ جیمز بانڈ کی طرح جاسوسی کر کے میں نے اس جگہ کا پتہ لگایا ہے اور اب آپ یوں کیجئے سر کہ پولیس کے کسی بڑے افسر سے رابطہ قائم کیجیے۔ میرا مطلب ہے کہ تھانے کو نظر انداز کر کے..... کیونکہ تھانے والے کیس خراب بھی کر سکتے ہیں، لیکن جب اوپر سے حکم آئے گا تو پھر مجبور ہوں گے کہ ٹھیک طرح سے کام کریں۔ اس جگہ چھاپہ پڑوا دیجئے۔"

"وہ تو میں ڈی آئی جی صاحب سے ڈائریکٹ بات کر لوں گا۔" ایم ڈی نے کہا۔ "لیکن اس بات کی پوری گارنٹی ہونی چاہئے کہ آپ کی حاصل کردہ انفارمیشن درست ہے۔ اگر اطلاع غلط نکلی تو ہماری بڑی سبکی ہوگی۔"

"آپ مجھ پر بھروسا کیجئے سر!" فیضو نے کہا۔ "میری اطلاع سو فیصد درست ہے،

لیکن میری آپ سب لوگوں سے یہی درخواست ہے سر، کہ نہ اس وقت اور نہ بعد میں..... میرا نام کہیں بھی، کبھی بھی نہ آنے پائے۔ ورنہ میں بے موت مارا جاؤں گا۔"

"آپ بے فکر رہیے۔" ایم ڈی نے کہا۔ "آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔ میں اعلیٰ حکام کو یہی بتاؤں گا کہ مجھے اپنے ذرائع سے اطلاع ملی ہے۔"

اگلے ہی دن پولیس کی ایک خصوصی چھاپہ مار ٹیم نے لالوکھیت میں اس کارخانے پر چھاپہ مارا مقبول احمد وہاں موجود تھا اور تیار کردہ جعلی دوائیں بھی بڑی مقدار میں موجود تھیں۔ مقبول احمد کو مع تمام ثبوتوں اور شہادتوں کے گرفتار کر لیا گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا۔ سارا ساز و سامان بھی تحویل میں لے لیا گیا۔

اس روز تقریباً آدھی رات کے بعد فیضو نے ایس ایچ او کے کمرے میں مقبول احمد سے ملاقات کی۔ مقبول احمد سخت گھبرایا ہوا تھا۔ پولیس اس کا ابتدائی بیان لے چکی تھی اس کے لیے اپنے دفاع میں کچھ کہنا مشکل تھا۔

"فکر نہ کرنا میرے دوست....." فیضو نے مقبول احمد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ایس ایچ او سے بات ہو چکی ہے۔ ہم لوگ مل کر سارے معاملے کو سنبھال لیں گے۔ بہت اچھا وکیل کریں گے؟"

"وکیل کچھ کر سکے گا؟" مقبول احمد نے کمزور آواز میں کہا۔

"پولیس کی کوشش ہوگی کہ وہ کیس کو کمزور کر دے۔" فیضو نے کہا۔ "کیس کمزور ہوگا تو وکیل بہت کچھ کر سکتا ہے اور تم میرا نام درمیان میں مت لانا۔ اگر ایک اور نام درمیان میں آ گیا تو معاملہ زیادہ سنگین ہو جائے گا۔"

"ہم لوگوں کے درمیان یہ بات پہلے سے طے ہے کہ اگر کبھی کوئی ایک پکڑا جائے گا تو دوسرا اس کا نام ہرگز زبان پر نہیں لائے گا۔" مقبول احمد نے کہا۔ "میں تمہارا نام نہیں لوں گا، مگر..... یہ ہوا کیسے؟ سب کچھ تو ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ پولیس کا حصہ بھی پہنچ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک دم....."

"اوپر سے گڑبڑ ہوئی ہے۔" فیضو نے کہا۔ "تھانے والوں کو پہلے سے کچھ علم نہیں تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ خود ہی پہلے سے بتا دیتے۔ آخر وہ ہم سے بھتہ کس بات کا لیتے ہیں؟"

مقبول احمد کے خلاف نقلی اور جعلی دوائیں بنانے کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ اسے موقع واردات سے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ کرائے کی جگہ اس کے اپنے نام سے ہی لی گئی تھی، اس

کا ایک میڈیکل اسٹور بھی تھا' جس کا وہ واحد مالک تھا۔ وہ اس میڈیکل اسٹور پر اپنی تیار کردہ جعلی دوائیں فروخت کرتا تھا' نیز یہ دوائیں مارکیٹ میں بھی سپلائی کرتا تھا۔

فیضو کا نام کہیں نہیں تھا۔ کوئی دستاویز اس کے نام کی نہیں تھی۔ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو اس معاملے میں فیضو کے ملوث ہونے کی گواہی دیتا ہو۔ مقبول احمد کی زبان پر بھی فیضو کا نام نہیں آیا۔ فیضو کا باہر اور محفوظ رہنا ضروری تھا تاکہ وہ خفیہ طور پر اپنے دوست کی مدد کرتا رہے۔

لیکن پولیس کے لیے مقبول احمد کے خلاف کیس کو کمزور کر دینا ممکن نہیں تھا۔ جب پولیس کی خصوصی ٹیم نے کارخانے پر چھاپہ مارا تو اس ٹیم کے ساتھ شکایت درج کرانے والی کمپنی کے نمائندے بھی شامل تھے۔ جنہوں نے اپنی کمپنی کی جعلی دواؤں کے لیبلوں' شیشیوں اور تیار شدہ دواؤں کو پہچانا اور ان کی تصدیق کی۔ پولیس کے اعلیٰ حکام اور عدالتی حکام بھی ساتھ میں تھے اور ان سب کی موجودگی میں یہ ساری چیزیں تحویل میں لی گئی تھیں۔

اس رات کو ملاقات کے بعد سے فیضو پھر کبھی مقبول احمد سے ملنے نہیں آیا' نہ حوالات میں' نہ جیل میں۔ ایس ایچ او نے اپنے طور پر مقبول احمد کو سمجھا دیا تھا کہ فیضو باہر رہ کر خفیہ طور پر اس کی مدد کر رہا ہے اور اس کا سامنے آنا مناسب نہیں ہے۔

فیضو کی کمپنی کے ایم ڈی صاحب نے فوراً ہی فیضو کا پروموشن کر دیا اور اس کی تنخواہ میں خاصا اضافہ کر دیا۔ فیضو نے واقعی ایک شاندار کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس کی وہ انفارمیشن جو اس نے ''جان پر کھیل کر'' حاصل کی تھی' سو فیصد درست ثابت ہوئی تھی۔ جعلی کاروبار کرنے والا پکڑا گیا تھا اور علاقے کی پولیس نے اپنی تفتیش کے بعد یہ کہا تھا کہ مقبول احمد اکیلا ہی کام کر رہا تھا۔ اس کا کوئی گینگ نہیں تھا۔ پولیس کے اس ''تعاون'' کی فیضو پہلے ہی سے معقول قیمت ادا کر چکا تھا۔

مقدمہ چلا' مقبول احمد کے وکیل نے اپنے مؤکل کو بچانے کی بہت کوشش کی' لیکن مقبول احمد کے خلاف اتنے مضبوط اور ٹھوس ثبوت موجود تھے کہ اس کا بری ہونا ناممکن تھا۔ عدالت سے اس کو چار سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔

مقبول احمد کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی ایسا ہو گیا ہے۔ وہ آخر وقت تک بہت پُرامید تھا۔ ایس ایچ او کے ذریعے اسے فیضو کا یہ پیغام ملا تھا کہ منصف کو رشوت دے کر اپنی مرضی کا فیصلہ کروایا جائے گا لیکن ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا جج نے اسے سیدھا سیدھا چار سال کے لیے اندر کر دیا۔

اس رات جیل کی بیرک میں اپنے تھڑے پر لیٹ کر کروٹیں بدلتے ہوئے جب مقبول احمد نے اس ساری صورتِ حال پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کیا تو یکایک اس پر انکشاف ہوا کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے' اس سودے میں وہ سراسر خسارے میں رہا ہے اور سارا فائدہ تو فیضان علی کے حصے میں آیا ہے۔ وہ خود تو سزا یافتہ ہونے کے بعد تباہ ہو گیا تھا' لیکن فیضان علی کی نوکری بھی بحال تھی اور عزت بھی' اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ وہ دو سال تک بے تحاشہ اندھی کمائی میں سے حصہ لیتا رہا تھا..... اور مقبول احمد کی کمائی کا خاصہ حصہ کورٹ کچہری اور وکیلوں کے چکر میں ختم ہو گیا تھا اور پھر بھی حاصل کیا ہوا تھا؟ چار سال قید بامشقت!

مقبول احمد کی ایک ہی اولاد تھی اور وہ تھا اس کا بیٹا جو ابھی چھوٹا تھا اور اسکول جاتا تھا۔ مقبول احمد کے لیے ساری بھاگ دوڑ کرنے والا اور حوالات اور جیل میں برابر اس کی خبر گیری کرنے والا' اس کا وہ نوجوان رشتہ دار سرفراز تھا جسے مقبول احمد نے میڈیکل اسٹور میں ملازم رکھا تھا۔ سرفراز ہی حوالات اور جیل کے چکر لگاتا رہا تھا اور پیشیوں کے دوران عدالت میں بھی جاتا رہا۔ اس کے علاوہ وہ میڈیکل اسٹور کو بھی چلانے کی کوشش کرتا رہا تھا اور اس نے اسے بالکل بند نہیں ہونے دیا تھا۔ جس دن مقبول احمد کو سزا ہوئی' اس کے ایک ہفتے بعد مقبول احمد کو ایک اور بھاری صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

سرفراز جیل میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے آیا اور اس نے اس کو ایک منحوس خبر سنائی اس نے بتایا کہ رات کو کسی وقت میڈیکل اسٹور کا تالا کھول کر وہاں موجود ساری دوائیں اٹھا لی گئیں اور اسٹور خالی کر دیا گیا۔ سرفراز پورے یقین کے ساتھ یہ بات کر رہا تھا کہ ایک بڑی گاڑی کی مدد کے بغیر ساری دوائیں وہاں سے نہیں لے جائی جا سکتی تھیں اور اس کام کو پورا کرنے کے لیے کافی وقت درکار تھا چوری کرنے والوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ اپنا کام کیا تھا اور وہ اسٹور کو خالی کر کے چلے گئے تھے۔

''سوائے فیضان علی کے اور کون ایسا کر سکتا ہے؟'' مقبول احمد کے دل میں نفرت کی ایک تیز و تند لہر اٹھی۔ ''اس نے پولیس والوں کے ساتھ مل کر میڈیکل اسٹور کی دوائیں بھی چرا لی ہوں گی۔'' سرفراز نے رپورٹ درج کرا دی تھی' لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

مقبول احمد کو اس بات کا شدید قلق تھا کہ اسے دوستی کے نام پر دھوکا دیا گیا۔ فیصل امپورٹرز کے مالکان نے اس کے خلاف جب کارروائی کرنے کی کوشش کی تھی تو مقبول احمد پوری طرح ہوشیار تھا اور وہ پہلے سے اپنا بندوبست کیے بیٹھا تھا۔ اس نے ایک ہی دھمکی میں فیصل خان کا دماغ درست کر دیا تھا' لیکن یہاں فیضان علی کے ساتھ وہ دوستی کے نام پر مارا کھا

گیا تھا وہ خوش فہمی اور خوش گمانی نے اس کی جان لے لی تھی۔

فیضو کی بیوی یاسمین اب ایک بیٹی کی ماں تھی۔ جس کا نام تزئین تھا اور وہ بہت خوبصورت بچی تھی۔ یاسمین کو فیضو کی گھر سے باہر کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی دفتری مصروفیات بہت زیادہ ہیں اور کمائی بھی بہت ہے۔ فی الحقیقت اسے اپنے شوہر کی اصل کمائی کا کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔

میڈیکل اسٹور میں موجود لاکھوں روپے کی دواؤں پر قبضہ کر لینے کے بعد فیضو نے مقبول احمد کو اپنی زندگی سے نکال باہر پھینکا۔

☆======☆======☆

زندگی بہت مختصر تھی، کرنے کو بہت کچھ تھا اور فالتو چیزوں کے لیے بالکل گنجائش نہیں تھی۔

گزشتہ برسوں کے دوران جعلی دواؤں کی تیاری اور فروخت سے فیضو نے اتنی بھاری رقم کمائی تھی کہ اب وہ باقاعدہ اپنا ذاتی کاروبار شروع کر سکتا تھا، وہ کاروبار جس کے بارے میں وہ ایک طویل عرصے سے سوچتا چلا آیا تھا۔ اس نے جب لانڈھی میں واقع منصور علی کی فیکٹری میں کام شروع کیا تھا اور وہاں کام کرتے ہوئے مالکوں کی کمائی کا اندازہ لگایا ہوا تھا۔ اسی دن سے وہ اپنے دل میں اس خواب کو بسائے ہوئے تھا کہ وہ بھی ایک دن ایسی ہی فیکٹری کا مالک ہوگا اور اس کی بھی کمائی ویسی ہی ہوگی جیسی کہ سیٹھ منصور علی کی تھی۔ سیٹھ منصور علی کی کمائی کے طریقوں پر اس نے خاص طور پر نظر رکھی تھی اور جلد ہی وہ سارے اسرار و رموز سے واقف ہو گیا تھا۔ پھر جب اس نے دوسری فیکٹری میں نوکری کی، تو بھی اس نے سیکھنے کا عمل جاری رکھا اور ساتھ ہی، موقع پاتے ہی مقبول احمد کی مدد سے زبردست اضافی کمائی کا ایک دھندہ بھی شروع کر دیا۔ اس دھندے میں اس نے خوب کمائی کی اور اس کے پاس بہت بڑی رقم جمع ہو چکی تھی۔ جس کا اس کی بیوی کو کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے شروع سے یاسمین کے ساتھ اپنا رویہ ایسا رکھا تھا کہ اسے اپنے دفتری اور کاروباری معاملات سے بالکل دور رکھا تھا۔

پیسہ بہت جمع ہو گیا تھا، لیکن اتنا کافی نہیں تھا۔ اس پیسے کو مزید پیسہ بنانے کے لیے استعمال کرنا تھا اور پھر جو مزید پیسہ حاصل ہو جاتا، اس سے بھی زیادہ پیسہ بنانے کے لیے استعمال کرنا تھا اور پھر اور.....اور.....اور.....اس اور کی کوئی حد ہوتی ہی نہیں ہے، یہاں تک کہ آدمی زندگی کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے۔

فیضو نے چھوٹے پیمانے پر خود اپنی ایک دواساز کمپنی قائم کرنے کی کوشش شروع کردی۔ وہ ان تمام راستوں سے بخوبی واقف تھا جن سے گزر کر یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے میں اس کے سسر نے بھی کافی حد تک اس کی مدد کی' جو ایک ریٹائرڈ اعلیٰ سرکاری افسر تھا اور جس کے کراچی اور اسلام آباد کے سرکاری حلقوں میں کافی گہرے مراسم تھے۔ اس نے تو فیضو کو یہاں تک پیشکش کی تھی کہ فیکٹری قائم ہوجانے کے بعد وہ وہاں خود بھی بیٹھا کرے گا اور رضا کارانہ طور پر خدمات سرانجام دیے گا' کیونکہ وہ تو زیادہ تر خالی رہتا تھا لیکن فیضو نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس بات کو ٹال دیا۔ وہ فیکٹری کے اندرونی معاملات میں اپنے کسی بھی رشتے دار کی مداخلت سے بچنا چاہتا تھا۔ بہت سے محکموں اور وزارتوں کے چکر کاٹنے اور متعلقہ لوگوں کی خواہشات اور مطالبات کو پورا کرنے کے بعد فیضو ایک دواساز کمپنی کا لائسنس حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے کورنگی انڈسٹریل ایریا میں ایک بڑا انڈسٹریل پلاٹ سستے داموں خرید لیا تھا۔ اس پلاٹ پر پہلے سے تھوڑا بہت ڈھانچہ بنا ہوا تھا۔ فیضو کو کام فوراً شروع کردینے کی ضرورت تھی' تاکہ میٹر چالو ہوجائے اور حاصل ہونے والی آمدنی سے فیکٹری کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جاسکے۔

فیکٹری میں کام شروع ہوگیا۔ فیضو پروڈکشن سے لے کر ڈسٹری بیوشن تک' ہر کام کا ماہر تھا اور اپنی غیر معمولی ذہانت کو استعمال کرتے ہوئے سارے کام پوری طرح کنٹرول کرسکتا تھا۔ اب وہ آئے دن بڑے بڑے ہوٹلوں میں بڑے بڑے حکام اور افسران کو شاہانہ انداز کی ضیافتیں دیا کرتا تھا' جن کا سلسلہ کراچی سے اسلام آباد تک جاری رہتا تھا وہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہا تھا' کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ یہی پانی اس کے لیے سمندر میں تبدیل ہوتا جائے گا۔ لڑکیاں سپلائی کرنے والے کتنے ہی دلال اب اس کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے' جن کی خدمات کی اسے اکثر و بیشتر ضرورت پیش آتی رہتی تھی۔ افسران اور حکام کو صرف کمیشن کی ہی نہیں اور بھی بہت سی ''مراعات'' کی ضرورت تھی جن سے فیضو بخوبی واقف تھا۔

وہ دواؤں کے کئی پیکج اسلام آباد سے منظور کروانے میں کامیاب ہوگیا اور پرانی دواؤں کے ساتھ بہت سی نئی دواؤں کی پروڈکشن بھی شروع ہوگئی۔ شروع شروع میں ان دواؤں کی کوالٹی کو بالکل درست رکھا گیا تھا' البتہ قیمتیں اصل لاگت سے کئی گنا زیادہ رکھی گئیں' لیکن مارکیٹ میں ان دواؤں کو مقبول بنانے کے لیے سیلز مینوں اور ڈاکٹروں کی با معاوضہ خدمات حاصل کی گئیں۔

ہر گزرتے ہوئے سال کے ساتھ فیضو کا ستارہ عروج پر پہنچتا گیا۔ اس کی کمپنی اب

دھڑلے سے غیر معیاری دوائیں بنا رہی تھی۔ جو کچھ اس نے سیکھا تھا اس کا نہ صرف یہ کہ وہ مکمل طور پر استعمال کررہا تھا بلکہ اس میں اپنی طرف سے بھی بہت سارے اضافے کررہا تھا' وہ صرف دوائیں ہی نہیں بنا رہا تھا' بلکہ اس نے بہت سارے قیمتی کیمیکلز کا امپورٹ لائسنس بھی حاصل کرلیا تھا۔ درآمد کیے جانے والے کیمیکلز اس کی ضرورت سے بہت زیادہ ہوتے تھے اور وہ ان کو بلیک مارکیٹ میں بیچ دیتا تھا۔ امپورٹ کی آڑ میں وہ اطمینان سے ممنوعہ اشیاء کی اسمگلنگ کرتا تھا اور بے تحاشہ کماتا تھا۔ ایک آکٹوپس کی طرح اس کے بہت سارے پنجے دور دور تک پھیلتے جارہے تھے۔

پانچ سال کے اندر اندر اس نے اپنی رہائش تبدیل کردی۔ ناظم آباد میں جو اس کا مکان تھا' اس کو اس نے اپنے ایک اضافی گودام میں تبدیل کردیا' جہاں کیمیکلز' دوائیں اور مختلف اشیاء رکھی جاتی تھیں۔ اور ڈیفنس سوسائٹی میں ایک پلاٹ خرید کر اس پر مکان بنوالیا۔ دو سو گز کے مقابلے میں ایک ہزار گز کا یہ مکان کسی محل کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

فیکٹری کو زبردست توسیع دی جاچکی تھی اور فیضو بہت سی نئی دواؤں کی منظوری حاصل کرچکا تھا اور ان کی قیمتوں کے تعین میں ان تمام سرکاری عمال کے مفادات کو پورے طور سے ملحوظ رکھا جاتا تھا جن کو قیمتوں کے کنٹرول کا اختیار تھا۔ فیضو کی کمپنی کی تیار کردہ دوائیں فیضو کے لیے سونا اُگل رہی تھیں۔ فیضو کے لیے بھی ان سارے سرکاری عمال کے لیے بھی' جن کا اس کاروبار میں عمل دخل تھا۔

اس روز فیضو چار افراد کے ساتھ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے سے وہ خاصا پریشانی کا شکار ہوگیا تھا۔ سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی زیادہ تر وہی دوائیں بنا رہی تھی جو فیضو کی کمپنی بنا رہی تھی۔ سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی ابھی حال ہی میں قائم ہوئی تھی اور وہ بہت کم شرح منافع کے ساتھ سستی دوائیں تیار کررہی تھی اور اس کی دوائیں بھی اعلیٰ اور معیاری ہوتی تھیں۔ فیضو کے آدمیوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس نئی کمپنی کی دوائیں بہت بڑی مقدار میں فروخت ہورہی تھیں۔ جبکہ انہی جیسی فیضو کی کمپنی کی تیار کردہ دواؤں کی مارکیٹ میں مانگ کم ہوتی جارہی تھی اور یہ رجحان بلاشبہ فیضو کے لیے بہت خطرناک تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے چاروں افراد کا تعلق مارکیٹنگ سے تھا اور یہ فیضو کے لیے ہر طرح کے جائز اور ناجائز کام کرتے تھے۔

''زیادہ تر ڈاکٹر تو اب بھی ہماری ہی دوائیں لکھ رہے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''لیکن سلیم والوں کی دوائیں عام لوگوں میں بہت مقبول ہوچکی ہیں۔ لوگ ان سے

واقف ہو چکے ہیں اور بہت سارے لوگ تو انہیں ڈاکٹری نسخوں کے بغیر استعمال کر رہے ہیں اور بہت سے ڈاکٹرز بھی وہی دوائیں لکھ رہے ہیں۔ یہ اس وقت مارکیٹ کا ٹرینڈ ہے سر....."

"یا تو ہم اپنی دواؤں کی قیمت کم کریں۔" ایک دوسرے شخص نے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی میڈیکل اسٹور والوں کے کمیشن میں اضافہ کریں' تاکہ وہ گاہکوں کو ہماری دوا کے بارے میں بتائیں اور اس کی خریداری پر اصرار کریں....."

"میڈیکل اسٹورز والوں کو ہم پہلے ہی کافی کمیشن دے رہے ہیں" فیضو نے کہا۔ "اس میں اب مزید اضافہ ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم نے کمیشن میں اضافہ کرنا شروع کر دیا تو میڈیکل اسٹورز والے روزانہ ہی منہ پھاڑے کھڑے رہیں گے۔ بس کوئی اور طریقہ سوچنا ہوگا۔"

ان دنوں کراچی میں آشوبِ چشم کی بیماری بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک متعدی بیماری تھی اور عام طور سے ایک سے دوسرے کو لگ رہی تھی۔ سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کی تیار کردہ آنکھوں کی اس بیماری کی دوا بہت مؤثر اور مقبول تھی۔ فیضو کی کمپنی بھی یہ دوا تیار کرتی تھی لیکن وہ کافی مہنگی تھی۔

سلیم کمپنی کی تیار کردہ آنکھوں کی دوا کی مارکیٹ میں زبردست مانگ تھی اور اس مانگ میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا کیونکہ آشوبِ چشم کی متعدی بیماری پر ابھی قابو نہیں پایا جا سکا تھا اور خاص طور سے شہر کے غریب اور پسماندہ علاقوں میں اس بیماری کا زور بہت زیادہ تھا۔ مارکیٹ میں سلیم کمپنی کی تیار کردہ دوا کی قلت پیدا ہو گئی۔ بعض میڈیکل اسٹور والوں نے اس کو بلیک میں بیچنا شروع کر دیا۔ پھر اچانک مارکیٹ میں سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کی تیار کردہ آشوبِ چشم کی دوا کا جیسے سیلاب آیا۔ ایک دم سے بڑی تعداد میں دوا مارکیٹ میں آ گئی اور لوگ خوش خوش خریدنے لگے۔ دوا کی قلت ختم ہو چکی تھی۔

لیاری کے علاقے میں نسیمہ نامی ایک عورت نے اپنے دس سالہ بچے کی آنکھوں میں دوا ڈالی۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح نسیمہ کا بیٹا ظفر بھی آشوبِ چشم کا شکار تھا۔ نسیمہ ایک غریب بیوہ تھی اور وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں کے علاج کے لیے کسی مہنگے ڈاکٹر سے رجوع نہیں کر سکتی تھی۔ آشوبِ چشم کی بیماری بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی اور بہت سے لوگ اس کا شکار تھے۔ نسیمہ کے کسی پڑوسی نے اس کو یہ دوا بتائی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں وہی دوا ڈال رہی تھی۔ شیشی پر دوا کے استعمال کا طریقہ اُردو اور انگریزی میں درج تھا اور نسیمہ کو معلوم تھا کہ اسے کس طرح استعمال کیا جائے۔ اس دوا کے استعمال سے اس کے بیٹے کی آنکھوں کو فائدہ ہو رہا تھا۔

نسیمہ آج صبح ہی قریبی میڈیکل اسٹور سے دوا کی ایک نئی شیشی خرید کر لائی۔ اس کے لیے اسے کئی چکر لگانے پڑے تھے کیونکہ دوا مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے کل رات کو ہی نیا اسٹاک آ گیا تھا اور دوا کی قلت دور ہو گئی تھی۔

نسیمہ نے اپنے بیٹے ظفر کی آنکھوں میں دوا کا پہلا قطرہ ڈالا تھا کہ ظفر بری طرح چیخنے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں میں شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ نسیمہ برح طرح گھبرا گئی اس نے فوراً ہی ہاتھ روک لیا۔ ظفر کی تیز و تند چیخوں سے سارا گھر گونج اٹھا۔ کئی پڑوسی جمع ہو گئے اور ظفر کو اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کی آنکھ میں کوئی زہریلا مادہ ڈالا گیا ہے۔

ڈاکٹروں کی چھان بین کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ ظفر کی آنکھوں میں جو دوا ڈالی گئی تھی وہ سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کی بنی ہوئی دوا تھی اور اس میں زہریلا مادہ شامل تھا۔

یہ سانحہ صرف لیاری کے ظفر کے ساتھ ہی نہیں پیش آیا تھا۔ شیر شاہ کے ایک شخص محمود کے ساتھ بھی عین اسی روز ایسا ہی سانحہ پیش آیا۔ وہ آشوبِ چشم کی تکلیف میں مبتلا تھا اور اس نے بھی سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کی بنی ہوئی دوا استعمال کی تھی۔ وہ درد سے تڑپنے اور چیخنے لگا۔

شہر میں ایک ہی وقت میں ایسے بیسیوں واقعات پیش آئے اور پولیس حرکت میں آ گئی۔

اگلے دن کے اخبارات ان خبروں سے بھرے ہوئے تھے کہ سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کی دوا استعمال کرنے کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں زخم پڑ گئے اور وقتی طور پر ان کی بینائی بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کے خلاف پولیس نے کیس درج کر لیا اور فوری طور پر تحقیقات شروع کر دی گئی۔ پولیس اور وزارتِ صحت کے حکام نے عوام کو یقین دلایا کہ معاملے کی مکمل طور پر چھان بین کرائی جائے گی اور جو لوگ بھی اس مجرمانہ کارروائی کے ذمہ دار ہوں گے انہیں قرار واقعی سزا جائے جائے گی۔

فیضو نے اپنے دفتر میں بیٹھ کر اخبارات میں سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کی دوا کے اسکینڈل کے بارے میں خبریں پڑھیں اور اس کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنی میز کی دراز میں سے سلیم کمپنی کی بنی ہوئی آنکھ کی دوا کی دو شیشیاں نکالیں اور انہیں سامنے رکھ کر غور سے دیکھنے لگا۔ دونوں شیشیوں کی پیکنگ میں' ان کے لیبل میں' ان پر چھپی ہوئی انگریزی اور اُردو عبارت میں سرِ مُو کوئی فرق نہیں تھا۔ خود سلیم کمپنی کے مالکان بھی یہ تمیز نہیں کر سکتے تھے کہ ان میں سے کون سی دوا اصلی ہے اور کون سی دوا جعلی۔

سلیم کمپنی کی دوا مارکیٹ سے اٹھالی گئی اور اس کے ساتھ ہی دوسری کمپنیوں کی دواؤں کی، جن میں فیضو کی کمپنی کی دوا سرِ فہرست تھی، فروخت میں زبردست اضافہ ہوگیا۔ فیضو کی کمپنی کی دوسری دواؤں کا اعتبار بھی بڑھا اور مارکیٹ میں ان کی پوزیشن مزید مستحکم ہوگئی۔

سلیم کمپنی کی ایک دوا زہر قاتل ثابت ہوئی تو اس کی باقی تمام دوائیں بھی مارکیٹ میں بے اعتبار ہوگئیں۔ سلیم کمپنی کا نقصان ناقابل تلافی تھا۔

سلیم کمپنی کی دوا کا زہریلا نکلنا پولیس والوں اور محکمہ صحت کے حکام کے لیے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنا ثابت ہوا۔ کمپنی کے مالکوں کو خود جیل جانے سے بچانے کے لیے رشوت کی بھاری رقم پولیس والوں کو اور محکمہ صحت کے افسران کو کھلانا پڑی۔ کمپنی بند ہوگئی، کاروبار تباہ ہوگیا۔

ان لوگوں کے لیے اس موقف کو ثابت کرنا بے حد دشوار تھا کہ نقصان دہ دوا ان کی بنائی ہوئی نہیں ہے، بلکہ کسی نے ان کی کمپنی کا نام استعمال کر کے اندھا منافع حاصل کرنے کی غرض سے یہ جعلی دوا بنائی ہے۔

فیضو کی کامیابیوں میں ایک نئی اور تازہ کامیابی کا اضافہ ہو چکا تھا۔

اپنی تازہ کامیابی کے نشے میں سرشار فیضو اپنے کمرے میں اس وقت تنہا بیٹھا کسی حساب کتاب میں مصروف تھا کہ ایک شخص خاصی گستاخی اور بدتہذیبی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، حالانکہ ایم ڈی سے ملنے کے لیے پہلے اس کے سیکرٹری سے ملاقات کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ مگر وہ شخص سیکرٹری کو انظر انداز کرتا ہوا سیدھا کمپنی کے ایم ڈی فیضان علی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ فیضان علی اس وقت کمرے میں تنہا تھا۔

''مجھے معلوم تھا سر کہ اس وقت آپ کمرے میں تنہا ہیں۔'' آنے والے نے دانت نکال کر فیضو سے کہا۔ ''میں دراصل تنہائی میں ہی آپ سے ملنا چاہتا تھا۔''

فیضو نے ماتھے پر کئی بل ڈال کر اس شخص کو دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے اس شخص کی آمد پسند نہیں آئی ہے۔

اس شخص کا نام امتیاز تھا اور یہ فیضو کی فیکٹری میں سپروائزر تھا۔ یہ فیضو کے بہت خاص آدمیوں میں سے ایک تھا اور غیر معیاری دواؤں کی تیاری کے کام میں بھی اس کا خاص حصہ تھا۔ فیضو نے سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کے نام سے آنکھوں کی جو جعلی دوا بنوا کر مارکیٹ میں پھیلائی تھی اس کی خفیہ تیاری کا کام امتیاز کے ہی سپرد تھا۔ امتیاز نے لائنز ایریا کے ایک کوارٹر میں عارضی طور پر اس دوا کی تیاری کا سارا کام انجام دیا تھا جس میں دوا سازی سے لے

اس کی پیکنگ تک تمام مراحل شامل تھے۔ بعد میں اس دوا کو مارکیٹ میں پھیلا دیا گیا تھا۔

امتیاز کو اس خصوصی خدمت کا خاصا بڑا معاوضہ ادا کیا گیا تھا، جو پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا اور امتیاز نے خوشی خوشی اس کو قبول کیا تھا لیکن ہوا یوں کہ اس کام کے نتیجے میں فیضو کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اس کے مقابلے میں امتیاز کو اپنا معاوضہ بہت کم لگنے لگا۔ سلیم فارماسیوٹیکل کمپنی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ فیضو کی کمپنی کی دواؤں کی مانگ مارکیٹ میں بہت بڑھ گئی تھی اور فی الحال فیضو کو کوئی بڑا خطرہ نہیں تھا۔ امتیاز فیضو کو حاصل ہونے والے زبردست فائدے میں سے اپنا مزید حصہ چاہتا تھا۔ کچھ دنوں پہلے وہ فیضو سے اچھی خاصی اضافی رقم اینٹھ چکا تھا اور آج پھر وہ درانہ اس کے کمرے میں گھستا چلا آیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' فیضو نے اپنی ناگواری کو چھپانے کی کوشش نہ کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''سر..... وہ ایسا ہے کہ کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔'' امتیاز نے ہلکی لیکن مستحکم آواز میں کہا۔ ''اصل میں فیملی میں کچھ پرابلم ہے سر..... اور ایک بات اور بھی ہے سر..... لائنز ایریا میں جہاں میں نے یہ کام کیا تھا، ایک پڑوسی کو شاید کچھ شک ہوگیا ہے، کچھ الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا وہ..... اس کو بھی کچھ دے دلا کر اس کا منہ بند کرنے کی ضرورت ہے۔''

''میں طے شدہ معاوضے کے علاوہ پچھلی بار بھی تم کو مزید رقم دے چکا ہوں۔'' فیضو نے کہا۔

''آپ کی بہت مہربانی ہے سر۔'' امتیاز نے کہا۔ ''لیکن ابھی اگر کچھ اور ہو جائے تو میرا کام چل جائے گا اور میں اس آدمی کے بھی نکیل ڈال سکوں گا۔''

''کتنے پیسے چاہئیں؟'' فیضو نے اس کی تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں امتیاز نے جو رقم بتائی وہ بہت زیادہ تھی۔ پچھلی رقم سے بھی زیادہ۔

''ٹھیک ہے۔'' فیضو نے اس سے مزید کوئی سوال کیے بغیر کہا۔ ''ایک دو دن میں بندوبست کر دوں گا۔''

''تھینک یو سر!'' امتیاز نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

فیضو کو اندازہ ہوگیا کہ امتیاز ایک ناقابلِ علاج بیماری کی طرح چمٹ گیا ہے۔ یہ شخص مختلف حیلوں بہانوں سے اس کو بلیک میل کرتا رہے گا اور آئندہ بھی اس سے پیسے گھسیٹتا رہے گا۔ اس کا تدارک کرنے کی ضرورت تھی۔

فیضو نے اس رقم کا اندازہ لگایا جو امتیاز اس وقت اس سے مانگ رہا تھا اور امکانی طور

پر آئندہ نہ جانے کتنے عرصے تک مانگتا رہتا۔ پھر اس نے اس رقم کا اندازہ لگایا جو اسے اس صورت میں پولیس کو کھلانی پڑتی اگر امتیاز کوئی بدمعاشی کرتا اور اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا..... اور پھر اس نے اس رقم کا اندازہ لگایا جو اسے کمالو کو دینی پڑتی۔ ان تینوں الگ الگ رقوم کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کمالو کو دی جانے والی رقم ہی اس لحاظ سے سب سے کم ہوگی کہ اس کی افادیت بہت زیادہ اور مستقل نوعیت کی ہوگی۔

کمالو کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ اپنے چند قابلِ اعتماد دوستوں کے ساتھ کام کرتا تھا اور وہ بھی اس قدر احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ کہ اس کا یا اس کے کسی ساتھی کا پولیس میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا..... اور کمالو کبھی کوئی سوال نہیں کرتا تھا۔ ایک سال پہلے جب فیکٹری میں کچھ لوگوں نے ٹریڈ یونین کے پلیٹ فارم سے کچھ گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کی تھی تو ان کا لیڈر جاوید خان اچانک ایسا غائب ہوگیا تھا کہ کئی دن تک اس کا سراغ ہی نہیں مل سکا تھا اور پھر ایک دن کلفٹن کے ساحل پر اس کی کئی دن پرانی لاش ملی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فیکٹری میں ٹریڈ یونین سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔

فیضو نے فون کا ریسیور اٹھایا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆======☆======☆

امتیاز نے اس رقم کے بڑے حصے کو خرچ کرنے کا پہلے ہی سے منصوبہ بنا لیا تھا جو اسے فیکٹری کے مالک سے ملنے والی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس بات پر خوش تھا کہ اب ایک اضافی ذریعہ آمدنی بھی اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔

اگلے دن صبح کو وہ فیکٹری جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلا۔ اسے امید تھی کہ شاید آج اسے رقم مل جائے اس صورت میں اسے فیکٹری سے سیدھا صدر جانا تھا۔ اشیائے خریداری کی ایک فہرست اس نے رات کو ہی تیار کر کے جیب میں رکھ لی تھی۔

وہ اپنی گلی کی نکڑ پر پہنچا اور وہاں سے وہ سڑک کی طرف بڑھا۔ اسے سڑک پار کر کے دوسری طرف جانا تھا۔ اس وقت سڑک پر ٹریفک بہت کم تھا۔ امتیاز نے دونوں طرف احتیاط سے دیکھا۔ سڑک خالی تھی۔ البتہ گلی کے نکڑ پر ایک چھوٹی سی وین کھڑی ہوئی تھی، جس پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی اور اس وقت بھی اس نے غور نہیں کیا جب وہ وین اپنی جگہ سے اچانک چل پڑی۔ امتیاز کو تو ہوش اس وقت آیا جب اچانک وہ وین انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ عین اس کے سر پر آن پہنچی۔ وہ گھبرا گیا کیا ڈرائیور پاگل ہوگیا تھا جو اس قدر غیر ذمہ داری کے ساتھ گاڑی بھگا رہا تھا؟ لیکن اس کے بعد اسے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وین

اس کو ٹکر مار کر کچلتی ہوئی تیز رفتاری کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ سڑک خالی تھی کسی نے وین کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سڑک پر پڑا ہوا امتیاز کا زخموں سے چُور چُور بدن کچھ دیر تک پھڑکتا رہا اور اس کی جیب میں موجود خریداری کے لیے اشیاء کی فہرست خون میں بھیگتی رہی، یہاں تک کہ پوری طرح سے خون آلود ہوگئی۔

اگلے دن فیکٹری میں امتیاز سپروائزر کی ناوقت اور حادثاتی موت پر منعقد ہونے والے تعزیتی جلسے سے فیکٹری کے ایم ڈی فیضان علی نے خود بھی خطاب کیا اور مرحوم کی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اس کی موت کو فیکٹری کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔ چونکہ متوفی ڈیوٹی کے دوران حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ کسی خصوصی معاوضے کا مستحق نہیں تھا۔ پھر بھی ایم ڈی نے ازراہِ عنایت اس کے لواحقین کے لیے ایک خصوصی امدادی رقم کا اعلان کیا۔ فیضو پوری طرح سے مطمئن تھا۔ اس نے غیر معینہ مدت تک بلیک میل ہوتے رہنے کے خطرے سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لی تھی۔

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد ایک روز فیضو اپنی بیوی یاسمین کے ساتھ شہر کی ایک معروف گائنا کالوجسٹ کے کلینک جا رہا تھا جو صدر میں واقع تھا۔ اس لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ یاسمین کا اپائنٹ منٹ تھا اور یہ کوئی پہلی گائنا کالوجسٹ نہیں تھی جس کے پاس یاسمین جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ تو کئی برسوں سے جاری تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی کلینک کی عمارت سے کچھ فاصلے پر پارک کر دی۔ دائیں طرف کو پتلی گلی تھی جس میں پہلے ہی سے گاڑیوں کا اتنا زیادہ رش تھا کہ گاڑی اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لمبی اور پتلی گلی میں آگے جا کر اس لیڈی ڈاکٹر کا کلینک واقع تھا۔ فیضو، یاسمین کے ساتھ گاڑی سے اتر گیا اور اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی کو پارکنگ میں کھڑا کرنے کے بعد یہاں آ جائے۔

ڈرائیور گاڑی لے کر وہاں سے چلا گیا اور فیضو، یاسمین کے ساتھ گلی میں داخل ہوگیا۔

''ابے فیضان؟ ابے تُو فیضان ہے نا؟'' اچانک دائیں طرف سے نمودار ہونے والے ایک شخص نے اس کے تقریباً سامنے آتے ہوئے کہا۔ طرزِ تخاطب توہین آمیز حد تک بے حد تکلفانہ تھا۔

''ہاں.....'' فیضو کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور وہ شخص اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بھاری بھرکم اور مضبوط تن و توش کا ایک درمیانہ عمر کا آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا جسے فیضو نے فوراً پہچان لیا..... وہ مقبول احمد تھا۔

''ابے کمینے.....حرام کی اولاد!'' مقبول احمد نے زور زور سے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا کہ فیضو کو اپنی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹتی ہوئی لگی۔

''ابے تُو زندہ ہے اب تک۔ دھت تیرے کی سؤر کی اولاد.....ابے میں نے تو سمجھا تھا کہ تُو کب کا مر کھپ گیا ہوگا۔''

فیضو سے کہیں زیادہ یاسمین اس صورتِ حال سے گھبرا گئی۔ ''کون ہیں آپ؟ یہ کیا بکواس کر رہے ہیں؟'' اس نے خوف اور غصے کے عالم میں کہا۔

''ارے میں بکواس نہیں کر رہا ہوں بھابی۔'' مقبول احمد نے بلند آواز میں اور اسی لب و لہجے میں کہا۔ ''یہ گدھا تو میرا برسوں پرانا یار ہے۔ دوست ہے میرا یہ خبیث۔''

''دوستوں سے بات کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟'' یاسمین نے احتجاج کیا۔

''ارے آپ نہیں جانتیں بھابی صاحبہ۔'' مقبول احمد نے ایک زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''پکا بدمعاش ہے یہ.....سو بدمعاش مرے تھے تب یہ پیدا ہوا تھا۔''

فیضو کا سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ یاسمین اس کے ساتھ تھی اور مقبول احمد بھرے بازار میں یوں اس کی تذلیل کر رہا تھا۔ فیضو میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ مقبول احمد کے ایک تھپڑ رسید کر دیتا' کیونکہ ایک تو مقبول احمد کسرتی اور ٹھوس بدن والا آدمی تھا اور دوسرے یاسمین کے سامنے یہ رسوا کن تماشا تو اپنی مثال آپ ہی ہوتا۔

''بھاگو یہاں سے۔'' فیضو نے اسے ڈانٹنے کی کوشش کی اور یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے وہاں سے چل پڑا۔

''ابے باز آجا کمینے۔'' مقبول احمد نے چلا کر کہا۔ ''تُو جعلی دوائیں بنا بنا کر پبلک کو لوٹ رہا ہے۔ بے ایمان۔ سدھر جا شیطان کی اولاد' سدھر جا' کسی دن کتے کی موت مارا جائے گا' حرام کی کھا کھا کے سؤر ہو رہا ہے کتے۔''

کئی لوگ اس عجیب و غریب منظر کو دیکھنے کے لیے رک گئے تھے۔ ''یہ ہمارا آپس کی یاری دوستی کا معاملہ ہے صاحب۔'' مقبول احمد نے رک جانے والوں سے مخاطب ہو کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہو رہا ہے' پیار و محبت کی گفتگو ہے۔''

فیضو یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اسے دور لے گیا۔ مقبول احمد ان لوگوں کے پیچھے نہیں آیا اور وہیں رک گیا اور کھڑے کھڑے فیضو کو گالیاں دیتا رہا لیکن ہنس ہنس کر۔

یاسمین کا چہرہ خوف اور ذلت کے احساس سے سفید ہو رہا تھا۔ فیضو کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ یہ تو بڑا عجیب و غریب معاملہ تھا۔ مقبول احمد نے اس کو سرِ بازار جیسے ننگا

کر دیا تھا۔

''یہ.....یہ کون بے ہودہ آدمی تھا؟'' یاسمین نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''اس کی جرأت کیسے ہوئی تم سے اس انداز میں بات کرنے کی؟''

''نیم پاگل ہے۔'' فیضو نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ ''کبھی کسی گودام میں کام کرتا تھا۔ وہاں سے نکال دیا گیا۔ تب سے دماغ پر کچھ اثر ہو گیا ہے۔''

''لعنت ہو کمینے پر۔'' یاسمین نے سخت برہمی کے عالم میں کہا۔ ''ایسے آدمی کو تو پکڑ کر پاگل خانے میں بند کر دینا چاہئے۔''

گائنا کالوجسٹ کے کلینک کی طرف جاتے ہوئے فیضو سخت پریشان اور حواس باختہ تھا' لیکن اپنی اس کیفیت کو یاسمین سے چھپانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کتنے ہی مخالفین کا پتہ کتنی آسانی کے ساتھ کاٹ دیا تھا' لیکن مقبول احمد نے تو اس کی توہین کرنے کا ایک انوکھا ہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس کو سرِ بازار ذلیل کیا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکا تھا اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ مقبول احمد جیسے لوگوں کا علاج کس طرح کرنا چاہئے۔

گائنا کالوجسٹ نے یاسمین کی پچھلی تمام رپورٹیں دیکھنے اور اس کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد مزید کچھ ٹیسٹ لکھے اور کہا کہ یہ ٹیسٹ کروانے کے بعد ان کی رپورٹیں لے کر وہ دوبارہ اس کے پاس آئے۔ اپنی گفتگو میں وہ خاصی پُر اعتماد معلوم ہوتی تھی۔ فیضو کے دماغ پر بہت بوجھ تھا۔

گائنا کالوجسٹ کے کلینک سے باہر نکلتے ہی فیضو کو اپنا ڈرائیور سامنے ہی نظر آ گیا اور اس نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا۔ پھر بھی وہ محتاط اور چوکنا تھا اور چاروں طرف نظریں دوڑا دوڑا کر دیکھ رہا تھا' لیکن اسے مقبول احمد پھر بھی کسی طرف نظر نہیں آیا اور وہ یاسمین کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا گھر آ گیا۔ یاسمین کا ارادہ صدر میں کچھ شاپنگ کرنے کا تھا لیکن وہ اس اچانک افتاد سے اس قدر خوفزدہ ہو گئی کہ اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور سیدھی گھر واپس آ گئی۔

مقبول احمد سے فیضو کی آخری ملاقات برسوں پہلے اس وقت ہوئی تھی جب مقبول احمد کو پولیس گرفتار کر کے تھانے لے گئی تھی۔ اس کے بعد سے فیضو نے کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی تھی اور آج اتنے برسوں کے بعد اپنی سزا کی مدت پوری کر کے' وہ اچانک کسی بھوت کی طرح نمودار ہوا تھا اور اس پر پھٹ پڑا تھا۔ فیضو کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

اس نے مشتاق نامی ایک پولیس والے کو جس کی جیل میں ڈیوٹی رہتی تھی' اس کام پر مامور کیا کہ وہ سزا یافتہ' رہا شدہ قیدی مقبول احمد کے بارے میں اسے تفصیلی معلومات فراہم کرے۔ مشتاق نے معقول معاوضہ لینے کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر فیضو کو مقبول احمد کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر دیں۔

مقبول احمد پر صرف دو دن پہلے دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسپتال میں داخل تھا۔

فیضو ایک بار پھر کمالو کا نمبر ڈائل کر رہا تھا اسے بہت جلد اس کی خدمات کی دوبارہ ضرورت پیش آ گئی تھی۔

اس کے تین دن کے بعد ہی مقبول احمد نے اسپتال میں دم توڑ دیا۔ ڈاکٹروں کو حیرت تھی کہ اس کی موت کیونکر واقع ہو گئی۔ کیونکہ اس کی حالت تو بہتر ہو رہی تھی اور پوری امید تھی کہ وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ فیضو کو مقبول احمد کی موت کے بارے میں اطلاع مل گئی۔ اس نے خوشی اور اطمینان کے عالم میں آہستہ سے اپنی گردن ہلائی۔ فیضو کو ایک خاصے بڑے خطرے سے نجات مل گئی تھی۔

اگلے چند روز کے بعد فیضو اپنی بیوی یاسمین کے ساتھ ایک بار پھر اس گائنا کالوجسٹ کے پاس پہنچا۔ لیڈی ڈاکٹر کے بتائے ہوئے سارے ٹیسٹ ہو چکے تھے اور رپورٹیں مل گئی تھیں۔

گائنا کالوجسٹ کافی دیر تک بڑی توجہ کے ساتھ ان رپورٹوں کا مطالعہ کرتی رہی۔ اس نے یاسمین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ بس آپ کا ایک آپریشن کرنا پڑے گا۔ اس کے نتیجے میں ضرور کامیابی حاصل ہونے چاہئے۔''

''آپریشن تو اس سے پہلے اور بھی کئی بار ہو چکے ہیں ڈاکٹر صاحبہ۔'' یاسمین نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''لیکن اس کے بعد بھی.....''

''میں نے وہ سب رپورٹیں دیکھ لی ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔ میں بس ایک چھوٹا سا آپریشن کروں گی۔''

فیضو اور یاسمین کی بیٹی تزئین کی پیدائش کو تقریباً دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس عرصے کے دوران یاسمین کے پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ان دونوں کو ایک بیٹے کی شدید خواہش تھی اور وہ اس کی تکمیل کے لیے ایک اسپیشلسٹ سے دوسرے اسپشلسٹ کے

پاس بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ گزشتہ برسوں کے دوران انہوں نے لاکھوں روپیہ پھونک دیا تھا' لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔ یاسمین دوبارہ ماں ہی نہیں بنی اور اب وہ دونوں ایک اور لائق فائق گائنا کالوجسٹ کے پاس آئے تھے جو ایک طویل عرصہ امریکا میں گزارنے کے بعد حال ہی میں کراچی واپس آئی تھی۔

اگلے چند روز میں یاسمین کا ایک اور آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر نے اس بار بھی کہا کہ سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے ان دونوں کو ہی کچھ دوائیں اور مفید مشورے دیئے۔ لیکن تین ماہ کی مدت گزر جانے کے بعد بھی امید کی کوئی کرن نمودار نہیں ہوئی۔

فیضو کے پاس دولت کے انبار میں ہر روز کسی نہ کسی طور پر اضافہ ہوتا جا رہا تھا' لیکن اس ساری دولت' طمطراق' اثر و رسوخ اور بلند سماجی حیثیت کے باوجود وہ ایک بیٹے کا باپ نہیں بن سکا تھا۔

اگر کسی ایک ڈاکٹر نے بھی اس سے یہ کہا ہوتا کہ اس کی بیوی میں کوئی خرابی ہے اور وہ دوبارہ ماں نہیں بن سکتی تو فیضو نے دوسری شادی کرنے میں ایک لمحے کا تامل بھی نہ کیا ہوتا۔ اس کے پاس تو اس قدر دولت تھی کہ وہ بیسیوں بیویوں اور سینکڑوں بچوں کی پرورش کر سکتا تھا' لیکن کسی بھی اسپیشلسٹ نے یاسمین میں کسی قسم کی کمی کی نشاندہی نہیں کی تھی۔

پھر بھی اس نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے دوسری شادی کے بارے میں مشورہ کیا تھا اس نے اس کو صاف طور پر بتا دیا تھا کہ اس کو ایک بیٹے کی ضرورت ہے۔

''یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ دوسری شادی سے تمہارے ہاں بیٹا پیدا ہو۔'' اس کے دوست ڈاکٹر نے کہا۔ ''بچے کی جنس کے تعین کا کوئی تعلق ماں سے نہیں ہوتا' صرف باپ سے ہوتا ہے۔ دوسری شادی سے بیٹا پیدا ہونے کی گارنٹی نہیں ہے۔''

فیضو نے دوسری شادی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس امید کے ساتھ کہ یاسمین اسے ضرور ایک بیٹا دے گی' اپنی دولت کمانے کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان سرگرمیوں کی اب اتنی زیادہ متنوع شکلیں بن چکی تھیں کہ بعض اوقات تو ان کی فراوانی خود اس کے لیے پریشان کن بن جاتی تھی۔ کمائی کے درخت کی اتنی بہت ساری شاخیں پھوٹ نکلی تھیں اور ہر شاخ سے اتنے زیادہ پھل ٹپک رہے تھے کہ ان کا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اس کا تنہائی کا اور بیٹے سے محرومی کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ اسے ایک بیٹے کی اشد ضرورت تھی جو اس کی اس عظیم الشان سلطنت کا وارث بن سکے اور اس کی حفاظت کر سکے جس کی تعمیر میں استعمال ہونے والی ایک ایک اینٹ نہ جانے کس کس کے لہو میں

ڈوبی ہوئی تھی اور یہ سارا لہو نچوڑ کر اس نے اپنے وجود میں منتقل کر لیا تھا۔

یاسمین کو اپنے شوہر کے دھندوں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا' کیونکہ فیضو نے اپنی بیوی کو اپنے کاروباری معاملات سے ہمیشہ الگ رکھا تھا' یاسمین کو تو بس یہ معلوم تھا کہ دولت آ رہی ہے اور بے حد و حساب آ رہی ہے۔ وہ اور اس کی بیٹی شاہانہ انداز کی زندگی گزار رہے تھے اور جب یہ سب کچھ موجود ہو تو اس فکر میں گھلنے کی کیا ضرورت کہ یہ ساری نعمتیں کون سے آسمان سے اتر کر آ رہی ہیں۔

دواسازی کے لیے درکار مال کی آمد کی آڑ میں کروڑوں روپے کی مالیت کی ممنوعہ اشیاء کی اسمگلنگ بھی فیضو کی کمائی کے درخت کی ایک شاخ تھی۔ ان ممنوعہ اشیاء میں اعلیٰ درجے کی غیر ملکی شراب بھی شامل تھی جس کے سینکڑوں کریٹ آتے رہتے تھے۔ اعلیٰ درجے کی مہنگی غیر ملکی شراب کی بوتلوں کی تحفتاً ترسیل کراچی سے اسلام آباد تک' بڑے بڑے اعلیٰ سرکاری حکام' وزراء' رؤسا اور سیاست دانوں تک جاری رہتی تھی۔ کسٹم کے افسر کی کیا مجال کہ اس مال کو ہاتھ بھی لگائے..... لیکن اچانک ایک کسٹم افسر نے اس کے مال کو ہاتھ لگا دیا..... اس کسٹم افسر کا نام عرفان احمد تھا اور ابھی حال ہی میں کسی اور جگہ سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا تھا۔ فیضو کا اس سے ابھی تک باقاعدہ ''تعارف'' نہیں ہوا تھا۔

عرفان احمد نے فیضو کا کئی کروڑ روپے کی مالیت کا سامان پکڑ لیا۔ اس میں غیر ملکی شراب اور دیگر ممنوعہ اشیاء شامل تھیں۔ جن کو درآمد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

فیضو کو اس واقعے کی اطلاع اس کے کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹ سلطان مرزا نے دی۔ فیضو نے اس واقعے کو ذرا اہمیت نہیں دی۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال سے پہلے بھی کئی بار گزرتا رہا تھا۔ کسٹم کے تمام متعلقہ عملے کو معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور ایسی حرکتیں وہ لوگ صرف اپنا ریٹ بڑھانے کے لیے کیا کرتے تھے یا کبھی کبھار ''اضافی بونس'' کے حصول کے لیے۔ فیضو نے سلطان مرزا سے کہا کہ وہ متعلقہ کسٹم افسر سے اس کے مطالبے کے بارے میں معلوم کر کے اسے بتائے۔

''اس کا کوئی مطالبہ نہیں ہے سر۔'' سلطان مرزا نے پریشانی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں اپنی طرف سے تمام تر کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔ وہ کیس بنا رہا ہے' اس نے میری ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے' بڑا ہی ضدی اور وحشی قسم کا آدمی ہے۔''

''اچھا؟'' فیضو نے تعجب سے کہا۔ ''میں اس کے بڑے افسر سے بات کرتا ہوں.....''

''بے کار ہے سر۔'' سلطان مرزا نے کہا۔ ''میں وہ بھی کر کے دیکھ چکا ہوں۔ میں خلیق

صاحب سے بات کر چکا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ عرفان احمد متعلقہ منسٹر کا خاص آدمی ہے اور وہ اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ ویسے آپ چاہیں تو ان سے فون پر بات کر کے دیکھ لیجیے۔''

کسٹم کا بڑا افسر خلیق احمد خان بھی چاروں طرف پھیلے ہوئے ان بہت سارے لوگوں میں سے ایک تھا جو فیضان علی جیسے لوگوں کے دسترخوان سے ریزہ چینی کرتے تھے اور اس کے حکم سے باہر نہیں تھے۔ فیضو نے اسے فون کیا' لیکن خلیق احمد نے اس معاملے میں معذرت کر لی۔ اس نے وہی کچھ کہا جو سلطان مرزا اس سے پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ ساتھ ہی اس نے فیضو کو مشورہ دیا کہ وہ منسٹر سے براہِ راست بات کرے۔

فیضو جھلایا۔ وہ متعلقہ منسٹر سے بات کرنے سے گریزاں تھا اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ متعلقہ منسٹر اور دھندوں کے علاوہ انسانوں کی اسمگلنگ کا دھندا بھی کرتا تھا اور اس دھندے میں فیضو اس کی مدد کرتا تھا اور اپنا حصہ لیتا تھا۔ فیضو کی مدد سے متعلقہ منسٹر نے بڑی تعداد میں لوگوں کو لانچوں کے ذریعے ملک سے باہر اسمگل کیا تھا۔ کتنے ہی مر کھپ گئے تھے۔ کتنے ہی غیر ممالک کی جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے اور کتنوں کو واپس کراچی بھیج دیا گیا تھا' لیکن منسٹر نے تو کروڑوں روپے کما لیے تھے۔

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے فیضو ذرا محتاط ہو گیا تھا۔ اسلام آباد میں بڑی زبردست سیاسی اکھاڑ پچھاڑ چل رہی تھی اور متعلقہ منسٹر کی مخالف پارٹی کی نظریں فیضو پر تھیں۔ وہ لوگ موقع کی تلاش میں تھے۔ منسٹر کی جڑیں تو اقتدار کی جاگیر میں اتنی گہری تھیں کہ وہ اگر منسٹر نہ بھی رہتا تو بھی اسے کوئی ہلا نہیں سکتا تھا لیکن فیضو کراچی کا ایک کاروباری آدمی تھا۔ وہ اگر کسی لمبے سیاسی چکر میں آ جاتا تو اس کی کاروباری ساکھ خراب ہو جاتی اور اس کا دواسازی کا بزنس بری طرح متاثر ہو جاتا۔ ویسے بھی اس میدان میں مقابلہ روز بروز سخت تر ہوتا جا رہا تھا' کیونکہ نئی نئی دواؤں کی امپورٹ کے ساتھ مقامی طور پر بھی نئی نئی دواؤں کی تیاری اور نئی دواساز کمپنیوں کے قیام کا سلسلہ بڑھ رہا تھا۔

چنانچہ حکومت کی مخالف پارٹی کے خوف سے فیضو نے فی الحال انسانی اسمگلنگ کے کام میں متعلقہ منسٹر کے ساتھ تعاون سے معذرت کر لی تھی۔ اگرچہ منسٹر بار بار اسے یقین دلا رہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا اور یہ سیاسی خلفشار اس کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے کارندے لوگوں سے بھاری رقم لے چکے ہیں اور اب ان لوگوں کو باہر بھیجنا ضروری ہے لیکن فیضو اس کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک چھوٹے مفاد کے لیے بڑے مفاد کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ انسانی اسمگلنگ کے سلسلے میں بعض بین الاقوامی ایجنسیاں

بھی ان دنوں کچھ زیادہ ہی سرگرم عمل ہوگئی تھیں۔

اگرچہ پکڑے جانے والے مال میں فیضو کا کوئی نقصان ہو جاتا' تاہم وہ اس نقصان کو برداشت کرنے کی سکت رکھتا تھا لیکن اصل بات یہ تھی کہ اگر ایک مرتبہ اس کا بھرم ٹوٹ جاتا اور مارکیٹ میں اور اخبارات میں یہ خبر عام ہو جاتی تو پھر اسے دوبارہ سنبھلنے اور اپنی ساکھ کو بحال کرنے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جاتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہر قیمت پر اس واقعے کو رُونما ہونے سے روکا جائے۔

فیضو نے اسلام آباد فون کر کے متعلقہ منسٹر سے بات کرنی چاہی۔ آدھی رات تک کوشش کرنے کے باوجود اس کا منسٹر سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ اس کا موبائیل بھی اس کے سیکرٹری کے پاس تھا جو ہر بار صاحب کے ''مصروف ہونے'' کی اطلاع دے کر اور یہ وعدہ کر کے فون بند کر دیتا تھا کہ صاحب جیسے ہی فارغ ہوں گے وہ جوابی کال کروا دے گا' لیکن آدھی رات تک جوابی کال نہیں آئی۔ اگلے روز بھی فیضو کی انتھک کوشش کے باوجود منسٹر سے بات نہیں ہو سکی۔ فیضو کو اب اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ منسٹر جان بوجھ کر اس سے بات نہیں کرنا چاہتا اور اسے پھنسانا چاہتا ہے۔

آخری کال کے جواب میں فیضو کو یہ بتایا گیا کہ منسٹر اسلام آباد میں موجود نہیں ہے اور وہ کسی وفد کے ساتھ کھٹمنڈو چلا گیا ہے جہاں اسے انسانی اسمگلنگ کے خلاف ہونے والے ایک بین الاقوامی سیمینار میں پاکستان کی نمائندگی کرنی ہے۔

فیضو تو خود اسلام آباد جانے کا فیصلہ کر چکا تھا' لیکن اب اس کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ اب تو کوئی دوسرا ہی فیصلہ کرنے کی ضرورت تھی اور فیضو نے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دیر نہیں لگائی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد کسٹم کا بڑا افسر خلیق احمد فیضو کے کمرہ خاص میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں اکیلے تھے۔

''اب بتاؤ یار قصہ کیا ہے۔'' فیضو نے خلیق احمد سے کہا۔ ''منسٹر صاحب سے تو بات ہو ہی نہیں سکی۔ وہ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''ارے صاحب' میں فون پر آپ کو کیا بتاتا؟'' خلیق احمد نے کہا۔ ''ساری بدمعاشی تو منسٹر صاحب ہی کی ہے۔ انہوں نے ہی عرفان احمد کو سختی سے ہدایت دے رکھی ہے کہ مال پکڑ لیا جائے اور باقاعدہ کیس بنایا جائے۔''

''تم اپنے دستخطوں سے کلیرنس نہیں دے سکتے؟'' فیضو نے پوچھا۔

''نہیں سر!'' خلیق احمد نے لجاجت کے ساتھ کہا۔ ''میری نوکری چلی جائے گی۔ منسٹر

صاحب نے یہ کیس عرفان احمد کے حوالے کیا ہے اور جو کچھ بھی ہوگا وہ صرف اس کے دستخطوں سے ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' فیضو نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''پھر عرفان احمد کے دستخطوں سے ہی ہوگا' یہ بتاؤ کہ گاڑی واڑی بدل لی یا ابھی تک وہی پرانا ماڈل گھسیٹ رہے ہو؟''

''ارے کہاں سر؟'' خلیق احمد کے چہرے پر حرص اور طلب کی ایک اندھی روشنی کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔ ''آپ کو تو معلوم ہے' دو بیٹیوں کی شادی کر چکا ہوں لاکھوں روپے ہوا میں یوں اُڑ گئے کہ کچھ پتہ نہ چلا۔ دونوں بیٹیوں کو جہیز میں نئی گاڑیاں دیں اور خود تو ابھی وہی پرانی گھسیٹ رہا ہوں۔''

فیضو نے اپنی میز کی دراز میں ہاتھ ڈال کر چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا نکالا اور اسے خلیق احمد کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو..... نئی کرولا کی چابیاں ہیں اور باقی لوگوں کے لیے کیش کل پہنچ جائے گا۔''

کسٹم افسر عرفان احمد کو دفتر آئے ہوئے کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ اسے ایک فون کال موصول ہوئی۔ فون ایک مقامی اسپتال سے آیا تھا جو اس کے گھر کے قریب واقع تھا اسے اطلاع دی گئی کہ اس کی بیوی ایک حادثے میں زخمی ہوگئی ہے اور اسپتال داخل ہے۔

''کوئی تشویش کی بات نہیں ہے سر۔'' بولنے والے نے کہا' جس نے اپنا نام ڈاکٹر افتخار بتایا تھا۔ ''معمولی چوٹیں ہیں' لیکن وہ بہت زیادہ نروس ہو رہی ہیں۔ اگر آپ ذرا دیر کے لیے ان کے پاس اسپتال آسکیں۔''

''میں فوراً آ رہا ہوں۔'' عرفان احمد نے ڈاکٹر افتخار کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اس کے بعد وہ جلدی سے دفتر سے اسپتال کے لیے روانہ ہوگیا۔ روانگی سے پہلے اس نے اپنے بڑے افسر خلیق احمد کو اس واقعے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''میں فوراً اسپتال جا رہا ہوں سر.....''

''ہاں ہاں جاؤ..... ضرور جاؤ۔'' خلیق احمد نے اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

ایک سنسان موڑ پر وہ موٹر سائیکل اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آگئی۔ عرفان احمد نے جلدی سے گاڑی روک لی۔ فوراً ہی ایک آدمی جو موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا' اتر کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے عرفان احمد کو اپنی کنپٹی پر کسی سخت چیز کا دباؤ محسوس ہوا۔

''ذرا سا ادھر سرک جائیں سر۔'' اس شخص نے سرگوشی میں کہا۔ ''گاڑی بند نہ کیجئے گا۔اب ذرا مجھے چلانے دیجئے۔آپ آرام کیجیے۔''

''تمہیں.....تمہیں گاڑی چاہئے تو لے لو۔'' عرفان نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں کوئی مزاحمت.....''

''نہیں سر۔'' اس شخص نے اسی طرح مہذب لہجے میں کہا۔ ''ہمیں گاڑی نہیں چاہئے۔بس آپ ذرا ادھر سرک جائیے۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے عرفان احمد کو دوسری طرف دھکیلا۔عرفان جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سے سرک گیا اور برابر والی سیٹ پر آتے ہی اس نے اپنی گردن کے پچھلے حصے پر دباؤ محسوس کیا۔

''ہلنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کیجئے گا سر۔'' پچھلی سیٹ سے آواز آئی۔ ''اس ریوالور میں پوری چھ گولیاں ہیں۔بالکل خاموش بیٹھے رہئے۔''

''تم لوگوں کو جو کچھ چاہئے ہے لے لو۔'' عرفان نے گردن موڑے اور پیچھے دیکھے بغیر کمزور آواز میں کہا۔ ''مجھے جانے دو۔میری بیوی زخمی ہے اور اسپتال میں ہے۔''

''آپ کی بیوی کو کچھ نہیں ہوگا۔'' پیچھے سے ایک دوسری آواز بلند ہوئی۔ ''آپ بالکل خاموش بیٹھے رہئے۔'' اس کے ساتھ ہی گاڑی چل پڑی۔ڈرائیونگ سیٹ اس سے پہلے والے آدمی نے سنبھال لی تھی۔

وہ پرانا اور بوسیدہ مکان شہر کے پرانے علاقے میں واقع تھا گاڑی اس کے لکڑی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور پھر گیٹ کو بند کر دیا گیا۔

''آجایئے سر!'' پیچھے بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے نیچے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور چمک رہا تھا۔باقی دونوں آدمی بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ان کے ہاتھوں میں بھی ریوالور موجود تھے۔وہ تینوں اسے اس مکان کے اندر ایک کمرے میں لے آئے۔

خوف و دہشت کے عالم میں عرفان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔خدا جانے کون تھے اور اس سے کیا چاہتے تھے۔

''بیٹھئے سر۔'' ان میں سے ایک نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس کمرے میں ایک میز کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔میز اور کرسی دونوں ہی بہت پرانی اور بوسیدہ تھیں۔عرفان خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس آدمی نے جلدی سے میز کی دراز کھولی اور اس میں سے ایک فائل نکالی۔

''یہ لیجیے سر!'' اس نے قلم عرفان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''قلم کھولئے اور تمام کاغذات پر دستخط کرتے چلے جایئے۔''

عرفان احمد نے جھجکتے ہوئے فائل کھولی اور ایک دم سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔یہ فیضان علی کی اسمگلنگ کے کاغذات تھے جن میں اس سارے مال کو جائز اور قانونی ظاہر کیا گیا تھا۔

''جلدی جلدی سر!'' اس شخص نے کہا۔ ''دستخط کر کے سارے مال کو کلیئر کیجئے، جتنی جلدی آپ مال کلیئر کریں گے اتنی ہی جلدی ہم آپ کو بھی کلیئر کر دیں گے۔''

''منسٹر صاحب مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔'' عرفان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا

''وہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔ ''آپ انہیں بتا سکتے ہیں کہ ہم نے آپ سے یہ کام گن پوائنٹ پر کروایا ہے۔''

عرفان نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموشی سے کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔جیسے ہی اس کا کام مکمل ہوا، ایک آدمی نے اس سے فائل لے لی۔

''اچھا پھر میں چلوں۔'' عرفان نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''باہر بہت گرمی ہے سر!'' ایک شخص نے کہا۔ ''کچھ دیر آرام کر لیجئے۔آیئے۔'' اس نے عرفان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''شام کو جایئے گا.....اور اپنی بیوی کی فکر مت کیجئے۔وہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

ان لوگوں نے عرفان کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔کمرہ ٹھنڈا تھا اور وہاں پنکھا بھی چل رہا تھا دوپہر کو انہوں نے عرفان کو کھانا بھی دیا اور پھر کمرہ بند کر دیا۔عرفان کے خوف اور وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ان لوگوں نے اپنا مقصد تو حاصل کر لیا تھا۔اب وہ اور کیا چاہتے تھے؟

انہوں نے عرفان کو آدھی رات کے وقت جانے کی اجازت دے دی۔

''آپ جا سکتے ہیں سر!'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''چابی آپ کی گاڑی میں لگی ہوئی ہے، اطمینان سے گھر جایئے.....ہمیں اب آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔''

ایک شخص نے پھاٹک کھول دیا۔عرفان نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور باہر نکل آیا۔

یکبارگی اسے ایسا لگا جیسے وہ موت کے منہ میں سے نکل کر آ گیا ہے۔ ''زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ منسٹر صاحب نوکری سے نکلوا دیں گے۔'' اس نے دل میں کہا۔ ''گولی تو نہیں مار

دیں گے۔"

عرفان تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا جا رہا تھا اور وہ کافی دور نکل گیا تھا کہ ایک سنسان سی سڑک پر گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ سڑک پر سناٹا بھی تھا اور اندھیرا بھی۔ عرفان بار بار چابی گھما رہا تھا' لیکن گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ گاڑی کو وہیں چھوڑ دے اور کوئی ٹیکسی لے کر وہاں سے چلا آئے اچانک ایک آدمی اس کے قریب آ گیا۔

"کیا گاڑی بند ہو گئی ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ "اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے؟"

"بس چلتے چلتے خود ہی بند ہو گئی۔" عرفان نے کہا۔

"لائیے میں دیکھتا ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "میں مکینک ہوں۔ سڑک کے اس پار میرا ورکشاپ ہے' اگر اسٹارٹ نہیں ہو گی تو دھکے سے وہاں لے چلیں گے۔ روشنی میں دیکھ لیں گے یہاں تو روشنی نہ ہونے کے برابر ہے۔"

وہ شخص بونٹ کھول کر نیم تاریکی میں کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا رہا اور پھر اس نے پٹرول فلٹر میں منہ سے پٹرول کھینچنا چاہا۔

"اوہ..... آپ کی گاڑی میں تو پٹرول ہی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "اسٹارٹ کہاں سے ہو گی بھلا؟"

"پٹرول نہیں ہے؟" عرفان نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ اس نے تو آج صبح کو دفتر آتے وقت ٹینکی فل کروالی تھی۔ تو گویا ان بدمعاشوں نے اس کی گاڑی سے پٹرول بھی چرالیا تھا۔

"جی ہاں..... آپ کا فیول ٹینک بالکل خالی ہے۔" مکینک نے کہا۔ "اب آپ ایسا کیجئے' میرے ساتھ میرے گیراج تک چلئے۔ میرے پاس پٹرول ہے۔ میں آپ کو اتنا پٹرول دے دوں گا کہ آپ پٹرول پمپ تک آسانی سے چلے جائیں۔ پٹرول ڈال لیجیے گا تو گاڑی اسٹارٹ ہو جائے گی۔ آئیے۔" اور وہ جواب کا انتظار کئے بغیر ہی تیزی سے سڑک پار کرنے لگا۔

وہ گاڑی بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی۔ مکینک نے تو جلدی سے سڑک پار کر لی' لیکن عرفان ابھی سڑک پار کر بھی نہیں پایا تھا کہ اس گاڑی نے اس کو ٹکر ماردی اور اسے روندتی ہوئی' کچلتی ہوئی' سیدھی بھاگتی چلی گئی۔ اس کی لائٹیں بھی نہیں جل رہی تھیں۔

سڑک کے دوسرے کنارے پر نیم تاریکی میں کھڑا ہوا "مکینک" چند لمحوں تک خاموشی سے اس منظر جو دیکھتا رہا اور پھر وہاں سے غائب ہو گیا۔

☆=======☆======☆

کسٹم افسر عرفان احمد کے المناک ٹریفک ایکسیڈنٹ کی خبر اس کے لواحقین کو اگلی صبح کو ہی مل سکی۔ اس کی کچلی ہوئی لاش اس کی گاڑی کے قریب پائی گئی تھی۔ غالباً سڑک پار کرنے کے دوران کوئی گاڑی اس کو کچلتی ہوئی بھاگ گئی تھی۔ معائنے سے معلوم ہوا کہ اس کی گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ شاید وہ کسی سے مدد مانگنے سڑک پار کر کے کہیں جا رہا تھا۔

فیضو کی خوش نصیبی کہ اگلے ہی چند دنوں میں اسلام آباد میں حکومت بدل گئی۔ متعلقہ منسٹر' منسٹری سے باہر ہو گیا' اور نئی حکومت بن گئی۔ فیضو! جو ہر حکومت کا وفادار رہتا تھا' اس نئی حکومت کا بھی وفادار تھا اور اس نے فوراً ہی نئے وزراء کو خوش کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

کمالو اب زیادہ تر فیضو کے لیے کام کرتا تھا۔ فیضو نے کمالو اور اس کے چند ساتھیوں کے لیے ایک محفوظ ٹھکانہ فراہم کر دیا تھا جہاں یہ لوگ بڑے سکون سے رہتے تھے۔ اس علاقے میں لوگ نہ کوئی واردات کرتے تھے' نہ کوئی غیر قانونی حرکت۔ لوگوں کو ان کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ کمالو اپنے کاموں کے سلسلے میں منصوبہ بندی کا زبردست ماہر تھا۔ لوگوں کو اس طرح قتل کرنا کہ ان کی موت محض ایک اتفاقی حادثہ نظر آئے اور کسی بھی تفتیش کے نتیجے میں یہ قتل معلوم نہ ہو' ایک بہت مشکل کام تھا۔ کمالو اس سلسلے میں "ہٹ اینڈ رن" کا طریقہ زیادہ استعمال کرتا تھا' کیوں یہ سب سے زیادہ محفوظ اور مؤثر طریقہ تھا۔ آئے دن کتنی ہی گاڑیاں سڑکوں پر انسانوں کو کچل کر بھاگ جاتی تھیں اور ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا تھا۔ اگر قتل کا شبہ بھی ہو تو بھی کسی طور پر اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے لیے بہت ٹھوس اور محتاط منصوبہ بندی کی ضرورت تھی جس کا کمالو ماہر تھا۔

نئی حکومت بننے کے فوراً بعد ہی فیضو نے ایک چکر اسلام آباد کا لگایا اور نئے وزیر صحت سے ملاقات کی۔ ملاقات کا بندوبست وزارت کے سیکرٹری نے کروایا تھا' جواب تک نہ جانے کتنے وزرائے صحت کو ہضم کر چکا تھا۔ فیضو تقریباً ایک ہفتے تک اسلام آباد میں رہا اور اپنی فیکٹری کی چار نئی دواؤں کے رجسٹریشن میں کامیاب ہو گیا۔ وزارت صحت کے افسران تو اس سے ہمیشہ ہی خوش رہتے تھے۔ فیضان علی جیسے سرمایہ دار اور تاجر تو ان افسران کی بادشاہوں جیسی زندگی کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

"وزیروں کی کیا اوقات ہے فیضان علی صاحب؟" ایک اعلیٰ افسر نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی میز پر غیر ملکی شراب کا ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "یہ تو آج ہیں' کل نہیں ہیں۔ ارے اصل مالک تو ہم لوگ ہیں۔ ہم اپنی جگہوں پر بھاری پتھر کی طرح ہوتے

ہیں۔ہمیں بھلا کون ہماری جگہ سے ہلا سکتا ہے۔ہمیں خوش رکھیئے گا تو خود بھی ہمیشہ خوش رہیئے گا.....ہی ہی ہی۔"

اس کو کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی تھی۔فیضو اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔شراب کے نشے میں انسان کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

فیضو اسلام آباد سے واپس آیا تو اس کا دامن تازہ کامیابیوں کے سیاہ دھبوں سے بھرا ہوا تھا۔جس قدر پیسہ وہ اسلام آباد میں خرچ کر کے آیا تھا' اس سے سینکڑوں گنا زیادہ پیسہ کمانے کی ذلت آمیز اور رسوا کن راہیں ہموار کر کے آیا تھا۔

☆======☆======☆

گزرتے ہوئے ماہ وسال کے ساتھ ساتھ فیضو کی صرف دولت میں ہی بے اندازہ اضافہ نہیں ہو رہا تھا' اس کی سماجی قوت' اس کے اثر ورسوخ اور اس کی مجرمانہ طاقت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔اس کا وجود ایک ایسی شیطانی قوت میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا جو اپنی راہ میں مزاحم ہونے والی ہر شے کو بے دریغ پیروں سے کچلتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ ناکامی اور محرومی کے عذابوں سے خود کو ہر قیمت پر دور رکھتا تھا اور اپنی کامیابی کے لیے ہمیشہ بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہتا تھا' کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک کامیابی حاصل کر لینے کے بعد پھر اگلے پچھلے سارے حساب چکائے جا سکتے ہیں۔

لیکن ایک ایسی محرومی تھی جو کسی طرح فیضو کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔رات دن طرح طرح کی دواؤں میں کھیلنے اور بے شمار بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہروں کے درمیان رہنے کے باوجود وہ ایک بیٹے کا باپ نہیں بن سکا تھا اور یہ ایک ایسی محرومی تھی جو اس کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔اس کی بیٹی تزئین اب پندرہ سال کی ہو چکی تھی اور یاسمین کے دوبارہ ماں بننے کے امکانات محدود تر ہوتے جا رہے تھے۔فیضو کے پاس وقت کی بہت کمی تھی۔

تب اس نے بعض ڈاکٹروں کے مشورے پر لندن جا کر وہاں کے ڈاکٹروں کی مدد لینے کا فیصلہ کیا اور وہ یاسمین کو ساتھ لے کر لندن روانہ ہو گیا۔تزئین کراچی میں ہی رہی' اس کے نانا' نانی اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھے۔کاروبار سنبھالنے کے لیے قابلِ اعتماد تنخواہ دار لوگ موجود تھے۔جن میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد منیر تھا جو فیضو کا پرانا ساتھی اور اس کے ہر دکھ درد کا شریک تھا۔فیکٹری میں فیضو کے بعد جو شخص سیاہ وسفید کا مالک تھا وہ منیر تھا۔فیضو منیر پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرتا تھا۔

لندن فیضو کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی وہ تقریباً سارا یورپ گھوم چکا تھا۔کاروباری

سلسلے میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں جاتا رہتا تھا' لیکن عام طور سے وہ تنہا ہوتا تھا۔یاسمین کو تو وہ صرف ایک بار ہی اپنے ساتھ بیرون ملک لے گیا تھا کیونکہ وہ اسے اپنی کاروباری سرگرمیوں سے بالکل دور رکھنا چاہتا تھا۔

یاسمین بہت عرصہ پہلے ایک بار اپنے شوہر کے ساتھ لندن آئی تھی اور اسے یہ شہر بالکل اچھا نہیں لگا تھا' ہر وقت دھند' سردی' نیم تاریکی اور بارش کے غلاف میں لپٹے ہوئے اس شہر میں اس کا جی بالکل نہیں لگا تھا۔اس کے مقابلے میں وہ پاکستان کی نکھری ہوئی دھوپ' روشنی اور سفیدی میں نہائے ہوئے اجلے اجلے دنوں کو یاد کرتی تھی۔

لندن میں ان دونوں کے تفصیلی میڈیکل ٹیسٹ ہوئے اور پھر انہیں نتائج اور سفارشات سے بھی آگاہ کر دیا گیا۔

یاسمین کی عمر اس وقت چالیس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔پہلی اور آخری اولاد کی عمر پندرہ سال سے زائد ہو چکی تھی اور اس کے بعد سے تو بس سناٹا ہی سناٹا تھا۔ڈاکٹروں نے یاسمین کے سلسلے میں کسی یقینی کامیابی کی امید نہیں دلائی۔البتہ فیضان علی بالکل ٹھیک تھا۔تاہم ڈاکٹروں نے انہیں کچھ نئی تجاویز دیں' جن پر وہ وطن واپس جانے کے بعد پاکستانی ڈاکٹروں کی مدد سے عمل کر سکتے تھے۔

فیضو اس صورتِ حال سے بالکل مطمئن نہیں تھا۔لندن آنے کے بعد وہاں کے ڈاکٹروں سے تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد اس پر گویا یکا یک یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ اور یاسمین' دونوں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھاپے کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں اور وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے جب کم از کم یاسمین کی حد تک' سارے ہی امکانات معدوم ہو جائیں گے۔

اسے ایک بیٹے کی اشد ضرورت تھی اور یہ ضرورت تو ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ابھی تک اس نے امید وانتظار میں اتنا وقت گزار دیا تھا۔اب اس کو احساس ہوا کہ اس نے تو بہت وقت گزار دیا ہے۔شیطان کی آنت کی طرح پھیلی ہوئی کاروباری سرگرمیوں نے اسے اس مسئلے کی سنگین اور فوری نوعیت کو سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح ایک بیٹے کا باپ بن جائے۔اسے اپنی عظیم سلطنت کے لیے جس کی حدوں میں برابر وسیع ہوتی جا رہی تھی ایک ولی عہد کی ضرورت تھی۔وہ اپنا سب کچھ اپنے نامعلوم داماد کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لندن میں ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ کراچی واپس جا کر وہ زیادہ انتظار نہیں کرے گا' اگر تین ماہ کے اندر اندر یاسمین اسے کوئی خوش خبری سنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو ٹھیک

ہے' ورنہ پھر وہ دوسری شادی کرے گا..... اسے بیٹا چاہئے تھا۔

شاید..... شاید..... دوسری عورت اسے ایک بیٹا دے سکے۔ اسے یہ تجربہ تو کر کے دیکھنا ہی تھا۔ وہ اور یاسمین واپس کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

کراچی واپسی کے بعد امید' آزمائش اور تجربات کا ایک اور نیا دور شروع ہو گیا۔ فیضو اپنے فیصلے پر قائم تھا لیکن اس نے اپنے اس فیصلے میں اپنے دوست منیر کے علاوہ کسی کو شریک نہیں کیا تھا اور یاسمین کو تو وہ اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ گھر میں پندرہ سال سے زائد عمر کی بیٹی موجود تھی جو اس کی واحد اولاد تھی۔ وہ اسے بھی ان سارے معاملات سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

مہینے ایک ایک کر کے سرکتے گئے اور تین ماہ کی مدت پوری ہو گئی یاسمین کا نخلِ وجود اسی طرح خشک اور بے ثمر رہا اور اس میں کسی تازہ شگوفے کے پھوٹنے کی کوئی نوید نہیں ملی۔

فیضو کی مقررہ مدت پوری ہو چکی تھی۔ وہ یاسمین کو اس سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا تھا۔ اسے اب دوسری شادی کرنی تھی۔

اس نے اس سلسلے میں فوری نوعیت کی کچھ پلاننگ تیار کر لی تھی البتہ طویل المدت پلاننگ ابھی نہیں کی تھی اور اس کا انحصار آئندہ کے حالات پر تھا۔

فیضو نے دوسری شادی کے لیے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی تلاش کر لی' جو اس کی ضروریات کے عین مطابق تھی۔ شاہدہ کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا اور اس کا ایک نیم معذور بھائی کے علاوہ دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ لڑکی ٹیکسٹائل مل میں بطور ڈیزائنر کام کرتی تھی اور اپنے بھائی کے علاوہ اپنے نیم معذور بھائی کی بھی کفالت کرتی تھی۔ فیضو کو ایسی لڑکی چاہئے تھی جس کے ساتھ کوئی لمبا چوڑا خاندان نہ ہو اور تقریباً بے سہارا ہو' تاکہ آئندہ چل کر وہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ بن سکے۔ اگرچہ فیضو اتنا طاقتور آدمی تھا کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا' پھر بھی وہ اپنے لیے غیر ضروری مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے سوچا کہ فی الحال وہ اس شادی کو خفیہ رکھے گا اور اگر شاہدہ نے ایک بیٹے کو جنم دے دیا تو پھر وہ اس شادی کا باقاعدہ اعلان کر کے شاہدہ کو سب لوگوں کے سامنے اپنی دوسری بیوی کی حیثیت سے روشناس کرائے گا اور اسے تمام حقوق دے گا' لیکن اگر شاہدہ نے بیٹی کو جنم دیا تو وہ خاموشی سے اسے طلاق دے دے گا اور اسے اور اس کی بیٹی کو کچھ دے دلا کر ان لوگوں سے ہمیشہ کے لیے اپنا پیچھا چھڑا لے گا۔ وہ بیٹے کی خواہش میں بیٹیوں کی لائن نہیں لگانا چاہتا تھا۔ اسے اپنی بیٹی تزئین بہت پیاری تھی اور اسے تزئین کے لیے کسی سوتیلی بہن کی

ضرورت نہیں تھی۔ اگر ضرورت تھی تو ایک بھائی کی۔

فیضو کو اپنے مطلب کی لڑکی مل گئی اور یہ رشتہ خاموشی سے طے ہو گیا۔ اس کے پرانے اور خاص دوست منیر کے علاوہ یہ بات اور کسی کو معلوم نہیں تھی۔ منیر نے ہی یہ رشتہ لگوایا تھا۔ شاہدہ اپنے نیم معذور بھائی کے ساتھ فیڈرل بی ایریا کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی جو اس کے والدین نے بنوایا تھا اور اب اس کی اور اس کے نیم معذور بھائی ریاض کی مشترکہ ملکیت تھا۔

شادی سے پہلے فیضو نے شاہدہ کے تمام میڈیکل ٹیسٹ کروائے اور اس امر کا پوری طرح سے اطمینان کر لیا کہ شاہدہ پوری طرح صحت مند اور ہر بیماری سے پاک ہے' اس کے بعد ایک مختصر سی تقریب میں جس میں فیضو کی طرف سے صرف منیر شریک تھا' فیضو اور شاہدہ کا نکاح ہو گیا۔

کلفٹن کے ایک صاف ستھرے علاقے میں ایک عمدہ سے فلیٹ کا پہلے ہی بندوبست کر لیا گیا تھا۔ فیضو نے یہ فلیٹ شاہدہ کے نام سے خریدا تھا اور اسے حق مہر کے طور پر پہلے ہی دے دیا تھا' نیز شاہدہ کی جانب سے مزید کسی مطالبے کی راہ کو تحریری طور پر بند کر دیا تھا۔

نکاح کے بعد شاہدہ اپنے نیم معذور بھائی ریاض کے ساتھ اس فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔ فیضو نے اس کی ملازمت بھی ختم کروا دی کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی گھر کے خرچے کی تمام ذمہ داری اب فیضو کی تھی اور وہ اس کے لیے شاہدہ کو معقول رقم دے رہا تھا۔

یاسمین اور اس کی بیٹی تزئین سمیت کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ فیضو دوسری شادی کر چکا ہے' ماسوائے منیر کے' جو فیضو کا ایک پرانا دوست تھا۔ منیر کسی زمانے میں فیضو کے ساتھ فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کرتا تھا پھر جب فیضو نے اپنا علیحدہ کاروبار جمایا تو اس نے منیر کو زیادہ تنخواہ پر اپنے پاس بلا لیا منیر اس کا آزمایا ہوا دوست تھا۔

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ فیضو کو اب بڑی شدت کے ساتھ اس امر کا انتظار تھا کہ شاہدہ اس کو کوئی خوشخبری سنائے۔

شاہدہ کے ساتھ فیضو کی شادی کو چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ فیضو کی بے چینی اور جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے خود بھی لگتا تھا کہ اس کی مزاجی کیفیت بگڑتی جا رہی ہے اور اس کے چڑچڑے پن میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ جب تزئین کو دیکھتا تھا تو اس کا دل کانپ اٹھتا تھا۔ اسے تو اب جلد ہی تزئین کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ وہ کس قدر تیزی کے ساتھ بڑی ہو رہی تھی۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ جو کچھ ہونا تھا اسے بہت جلد ہو جانا چاہئے تھا۔ فیضو کو رہ رہ کر اس بات کا پچھتاوا ہوتا تھا کہ اس نے بہت پہلے ہی دوسری شادی کیوں نہ کر لی اور صرف یاسمین سے ہی امید لگائے کیوں بیٹھا رہا۔

اس نے شاہدہ کا دوبارہ طبی معائنہ کروایا۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ اس میں کوئی کمی نہیں تھی اور ماں بننے کی مکمل صلاحیت موجود تھی۔

''تو پھر وہ کم بخت ماں بنتی کیوں نہیں.....'' اس نے جھلا کر سوچا

شادی کے سات ماہ کے بعد جب شاہدہ نے ایک روز اس کو یہ اطلاع دی کہ وہ ماں بننے والی ہے تو فیضو کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ناامیدی اور ناکامی کے طویل اور صبر آزما برسوں نے اس معاملے میں یقین کی قوت بھی چھین لی تھی اور اب جو شاہدہ نے اسے خوشخبری سنائی تو اسے ایسا لگا جیسے ساری دنیا یکبارگی نئے سرے سے جوان ہو گئی ہے' سب کچھ اچانک بدل گیا ہے

وہ اب شاہدہ کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ ایک جز وقتی ملازمہ تو پہلے بھی شاہدہ کے فلیٹ میں کام کرتی تھی۔ اب فیضو کے مشورے پر اسے کل وقتی کر دیا گیا اور اس کی تنخواہ بھی بڑھا دی گئی۔ فیضو دن میں دو تین بار شاہدہ کو فون کر کے اس کی طبیعت پوچھتا تھا۔ اس نے شہر کے ایک بڑے میٹرنٹی ہوم میں شاہدہ کا رجسٹریشن بھی کروا دیا تھا۔ شاہدہ کو بہترین سہولتیں مل رہی تھیں۔ یہ سارے کام منیر کر رہا تھا۔

اور اب فیضو کو ایک نئی فکر دامن گیر تھی۔ اگر بیٹی ہوئی تو..... خدا کرے کہ ایسا نہ ہو' ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اب مزید انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا..... مزید وقت نہیں تھا۔

کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ شاہدہ کا الٹرا ساؤنڈ کروا کے بچے کی جنس کے بارے میں معلوم کرے' لیکن پھر وہ رک جاتا۔ اس نے شاہدہ کا الٹرا ساؤنڈ نہیں کروایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وقت سے پہلے یہ بات معلوم کر کے اپنے آپ کو اس صورت میں شدید عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ شاہدہ بیٹی کو جنم دینے والی ہے اس کا علم تو بس وقت پر ہی ہونا ٹھیک تھا۔

اس معاملے میں اس کا صرف ایک راز دار تھا منیر۔ فیضو نے منیر کو اس بارے میں بتا دیا اور منیر نے دلی مسرت کا اظہار کیا۔ ''خدا سے دعا کیجیے کہ وہ آپ کو بیٹا دے۔''

''بس ایک بیٹا۔'' فیضو کے لہجے میں ساری دنیا کی حسرت سموئی ہوئی تھی۔ ''اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ ایک بیٹا..... بس ایک بیٹا مل جائے۔''

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے۔ ویسے ویسے فیضو کے اضطراب اور ہیجان میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والے لمحات اس کے لیے جاں گسل ہوں گے یا نشاط آفریں..... کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس نے منیر کو شاہدہ کی خبر گیری پر مامور کر دیا تھا۔ منیر ہی شاہدہ کو چیک اپ کے لیے میٹرنٹی ہوم لے جاتا اور دوائیں وغیرہ لا کر دیتا تھا۔ فیضو خود دن میں کئی بار فون کرنے کے علاوہ کم از کم ہر دوسرے دن ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔ سب کچھ بالکل ٹھیک تھا۔ شاہدہ نوجوان اور صحت مند لڑکی تھی اور ڈاکٹروں کو یقین تھا کہ زچگی نارمل ہو گی اور کوئی پیچیدگی نہیں ہو گی۔

وقت آیا تو شاہدہ کو فوراً میٹرنٹی ہوم میں پہنچا دیا گیا۔ اسے وہاں لے جانے والا منیر تھا جس سے شاہدہ فون پر کسی بھی وقت رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ میٹرنٹی ہوم بھی گھر سے زیادہ دور نہیں تھا اور فیضو نے یہ بندوبست بھی کر رکھا تھا کہ بلڈنگ کے چوکیدار کو کافی پیسے دے کر یہ ہدایت تھی کہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں وہ بیگم صاحبہ اور ان کی ملازمہ کے لیے فوری طور پر ٹیکسی کا بندوبست کر دے اور کرائے کی فکر نہ کرے۔

شاہدہ رات کے کوئی نو بجے میٹرنٹی ہوم میں داخل ہوئی تھی اور منیر نے فیضو کو فون پر اس کی اطلاع دے دی تھی۔ فیضو دھڑکتے ہوئے دل اور منتشر اعصاب کے ساتھ اسی وقت میٹرنٹی ہوم پہنچ گیا تھا۔ منیر وہاں موجود تھا۔

شاہدہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اور ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اگلی صبح تک بچے کی آمد متوقع تھی۔

برسوں تک بے فیض انتظار کرنے والے فیضو کے لیے انتظار کی یہ ایک رات بہت بھاری تھی۔ وہ شدید اعصابی دباؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ جو کچھ ہے' وہ جلد سامنے آ جائے لیکن قدرت اپنا کام اپنے قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق کر رہی تھی' اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔

ایک تجربہ کار نرس کی اسپیشل ڈیوٹی شاہدہ کے کمرے میں لگا دی گئی۔ ملازمہ بھی ساتھ تھی۔ منیر سے کسی بھی وقت رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔

''میں ابھی کچھ دیر یہاں ہوں۔'' منیر نے فیضو سے کہا۔ ''آپ گھر چلے جائیے۔ یہاں آپ کا فی الحال کوئی کام نہیں ہے۔ میں گھر جا کر بھی اسپتال فون کرتا رہوں گا۔''

فیضو کو منیر پر پورا بھروسا تھا۔ چنانچہ وہ واپس چلا آیا۔ شاہدہ کی ذات سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ شاہدہ کی ضرورت اس کو صرف اس وقت تک تھی جب تک کہ شاہدہ بیٹے

کو جنم نہ دے دے۔

اس رات گھر واپس آنے کے بعد فیضو کو بمشکل تھوڑی بہت نیند آسکی۔ امید و بیم کی ایک عجیب و غریب کیفیت تھی جس سے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا' کیونکہ ایسی صورتِ حال پہلے کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ برسوں پہلے جب تزئین پیدا ہونے والی تھی تو یہ سوال اس کے لیے بالکل پریشان کن نہیں تھا کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی۔ وہ اس کی اور یاسمین کی جوانی کے دن تھے اور بیٹے کی پیدائش کی جانب سے مایوس ہوجانے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن اب تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ وقت گھٹ رہا تھا' توانائی گھٹ رہی تھی۔ عمر گھٹ رہی تھی..... اور دولت بڑھ رہی تھی' بے تحاشا بڑھ رہی تھی..... اور اس بے تحاشا بڑھتی ہوئی دولت کے لیے ایک مرد وارث کی ضرورت تھی..... ''شاہدہ..... شاہدہ مجھے مایوس نہ کرنا۔'' وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا..... ''اگر تم نے مجھے بیٹا دیا تو میں تمہیں مالا مال کردوں گا۔''

وہ منیر کے فون کا انتظار کرتا رہا..... شاید..... شاید منیر فون کرکے کچھ بتائے لیکن منیر کا فون نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی تک سب کچھ ٹھیک ہے اور کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد فیضو سیدھا اسپتال روانہ ہوگیا۔

فیضو نے منیر کو دیکھ لیا۔ وہ کوریڈور میں تھا' جس کے ایک کنارے پر لیبر روم واقع تھا۔

''وہ لوگ بھابی کو لیبر روم میں لے گئے ہیں۔'' اس نے فیضو کو بتایا۔ ''میں کوئی گھنٹہ بھر پہلے ہی آگیا تھا۔ بھابی نے مجھے فون کروادیا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہی ہے کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

فیضو کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ نمودار تھی۔ ''ان لوگوں کو کیا معلوم کہ پریشانی کی کوئی بات ہے یا نہیں ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

وہ اور منیر لیبر روم کے آگے پڑے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ لیبر روم کا دروازہ بند تھا اور اس بند دروازے کے پیچھے فیضو کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا..... خدا جانے کیا فیصلہ ہونے والا تھا..... فیضو اس سے بالکل بے خبر تھا۔

کافی دیر ہوگئی تھی اور ابھی تک بند دروازہ نہیں کھلا تھا اور فیضو کے اعصاب پر دباؤ مسلسل بڑھتا جارہا تھا۔

پھر اس وقت یہ دباؤ اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب یکبارگی لیبر روم کا دروازہ کھلا اور ایک نرس کا ہنستا مسکراتا جگمگاتا چہرہ اس کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

''مبارک ہو سر.....'' نرس نے تیزی سے فیضو کے قریب آکر کہا۔ ''ٹوئنز..... ٹوئنز

ہوئے ہیں..... بہت بہت مبارک ہو.....''

''ٹوئنز ہوئے ہیں؟'' فیضو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یعنی..... دو بیٹے؟''

''بیٹے نہیں سر' بیٹیاں!'' نرس نے اس بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

''تو آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ ٹوئنز ہوئی ہیں۔'' منیر نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔ ''آپ یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ ٹوئنز ہوئے ہیں؟''

فیضو تو اس ناگواری کا بھی اظہار نہیں کرسکا اس کی تو جیسے زبان ہی بند ہوگئی تھی۔ اس کے بے حد تنے ہوئے اعصاب یکبارگی جھنجھنا کر ٹوٹ گئے تھے۔ اس پر تو سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

''بڑی پیاری بچیاں ہیں سر!'' نرس کہہ رہی تھی۔ ''دونوں بالکل ٹھیک ہیں' البتہ میڈم کو ریکوری میں ذرا وقت لگے گا۔ ٹوئنز پیدا ہوئی ہیں نا..... ویسے وہ بالکل ٹھیک ہیں' تشویش کی کوئی بات نہیں' ابھی ذرا دیر بعد انہیں ریکوری روم میں لے جائیں گے۔ پھر آپ لوگ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔''

فیضو کو شاہدہ اور اپنی جڑواں بچیوں کو دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن وہ برملا اس کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ ایک شوہر اور باپ کی حیثیت سے اس کے لیے وہاں کچھ دیر رکنا اور اپنی بیوی بچیوں کو دیکھنا ضروری تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے ریکوری روم میں جاکر شاہدہ کو دیکھا۔ شاہدہ کے آکسیجن لگی ہوئی تھی اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔

''چیسٹ میں پہلے سے کوئی انفیکشن موجود تھا۔'' وہاں موجود ڈاکٹر نے فیضو سے کہا۔ ''جس کا پتہ ایکسرے سے نہیں چل سکا تھا۔ اس کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے آکسیجن لگا رکھی ہے یہ شام تک ٹھیک ہوجائیں گی۔ پھر آکسیجن کی ضرورت نہیں رہے لیکن بعد میں اس انفیکشن کا پورا انویسٹی گیشن کرکے اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ضروری ہے۔''

فیضو نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔ دونوں بچیاں پوری طرح صحت مند تھیں اور ابھی ماں کے پاس ہی موجود تھیں۔ نرس نے فیضو کو انہیں دکھایا۔ فیضو نے زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے انہیں ایک سرسری نظر سے دیکھا۔

فیضو کے دلی دکھ کو وہاں موجود لوگوں میں سے اگر کوئی شخص سمجھ سکتا تھا تو وہ صرف منیر تھا' جو فیضو کی اس دوسری شادی کے پس منظر سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ

فیضو کے دل پر اس وقت کیا بیت رہی ہے۔ منیر بے اولاد تھا لیکن اس نے کبھی بھی دوسری شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا اس نے اپنے دکھ کو اپنے سینے میں قید رکھا تھا۔

''دو بیٹیاں.....'' فیضو تو غم و غصے کے عالم میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ ایک بیٹی تو پہلے سے موجود ہی تھی' اب مزید دو بیٹیاں..... گویا تین تین داماد..... نہ جانے کون کون اور کیسے کیسے لوگ..... اور اگر شاہدہ کے ساتھ سلسلہ جاری رہا تو مزید بیٹیاں بھی پیدا ہو سکتی تھیں..... بیٹیاں ہی بیٹیاں..... خدا جانے ابھی اور کتنی بیٹیاں عالمِ ارواح سے اس کے گھر کی چار دیواری میں اترنے کے لیے تیار بیٹھی ہیں۔

فیضو اس صورتِ حال سے مفاہمت کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اب مزید تجربوں کا وقت نہیں تھا۔ شاہدہ نے اسے سخت مایوس کیا تھا اور اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ شاہدہ اگلی بار کسی بیٹے کو جنم دے گی..... نہیں..... بس..... اب اس سلسلے کو ختم کر دینے کی ضرورت تھی..... ی تو بس ایک ہی کافی تھی۔ اب اسے تزئین کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

لیکن اس سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟

''شام تک ٹھیک ہو جائیں گی۔ آکسیجن کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' فیضو کے دماغ میں ڈاکٹر کے کہے ہوئے الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔ ''شام تک ٹھیک ہو جائیں گی..... شام تک ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''میں اب چلوں گا۔'' منیر نے کہا۔ ''میرے خیال میں' میری اب یہاں ضرورت نہیں ہے دفتر جا کر کئی ضروری کام نمٹانے ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' فیضو نے جیسے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تم جاؤ۔ اور ایسا کرو ملازمہ کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ اسے گھر چھوڑ دینا۔ ریاض وہاں اکیلا ہے اس کو کسی کی مدد کی ضرورت ہوگی۔ یہاں ابھی میں موجود ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' منیر نے کہا۔ ''میں ملازمہ کو ساتھ لیے جاتا ہوں۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو آپ مجھے فون کر لیجیے گا میں آ جاؤں گا۔''

منیر' ملازمہ کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ شاہدہ کے ساتھ کمرے میں اب پرائیویٹ نرس اور فیضو کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''آپ نے ناشتہ بھی کیا سسٹر یا نہیں؟ کچھ کھایا پیا آپ نے؟'' فیضو نے نرس سے پوچھا۔

''کر لوں گی سر!'' نرس نے تکلف سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''کوئی جلدی نہیں

ہے۔''

''نہیں' آپ پلیز کینٹین میں چلی جائیے۔'' فیضو نے نرس سے کہا اور جلدی سے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''اطمینان سے' اچھی طرح ناشتہ کر لیجیے' میں یہاں موجود ہوں۔''

''شکریہ سر۔'' نرس نے ممونیت کے احساس کے ساتھ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

فیضو نے اندر سے کمرے کی چٹخنی بند کرنے میں ایک لمحے کا وقت بھی نہیں لگایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے گیس سلنڈر کا والو بند کر دیا۔ شاہدہ کو آکسیجن کی سپلائی بند ہو گئی' چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کا جسم جھٹکے کھانے لگا۔

''جلدی..... جلدی.....'' فیضو دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ''جلدی کرو میری جان۔ کہیں کوئی آ نہ جائے۔ کسی وقت بھی کوئی آ سکتا ہے..... کوئی نرس' کوئی ڈاکٹر..... شاباش..... شاباش میری جان..... جلدی..... جلدی.....''

فیضو کے سارے اعصاب بری طرح تنے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں شاہدہ کے ہلتے جلتے' پھڑکتے ہوئے جسم پر اور کان دروازے کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ شاہدہ کا جسم بری طرح پھڑک رہا تھا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں وہ پھڑک پھڑک کر ساکت ہو گیا۔ اب اس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ فیضو نے پُر امید نظروں سے شاہدہ کے بے حرکت جسم کی طرف دیکھا اسی وقت اسے دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے پہلے تو سلنڈر کا والو کھولا اور پھر آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ صفائی کرنے والی عورت جھاڑو پونچھا لیے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ فیضو نے سکون کا سانس لیا' یہ بھی اچھا تھا کہ آنے والی کوئی نرس یا ڈاکٹر نہیں تھی۔

صفائی کرنے والی عورت اپنا کام ختم کر کے جانے ہی والی تھی کہ پرائیویٹ نرس واپس آ گئی وہ بڑی پُرسکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔

''اچھا' پھر اب میں چلوں گا۔'' فیضو نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ملازمہ تو گھر چلی گئی ہے۔ مہربانی کر کے خیال رکھیے گا اور مریضہ کو اکیلا نہ چھوڑیے گا۔ ہم سب کچھ اسپتال والوں پر تو نہیں چھوڑ سکتے۔''

''آپ بالکل اطمینان رکھیے سر۔'' نرس نے کہا۔ ''میں یہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ہلوں گی۔''

''دونوں بچیوں کا بھی پوری طرح خیال رکھئے گا۔'' فیضو نے جاتے جاتے کہا۔

''آپ اطمینان رکھئے سر۔'' نرس نے فوراً جواب دیا۔ ''میں سب چیزوں کا پورے طور پر خیال رکھوں گی۔''

فیضو کمرے سے نکل آیا۔ اگرچہ کمرے میں ائیر کنڈیشنر لگا ہوا تھا لیکن اس کا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا' باہر نکل کر اس نے کھلی اور تازہ ہوا میں جلدی جلدی' لمبی لمبی سانسیں لیں اور اپنے منتشر اعصاب پر کسی حد تک قابو پایا۔

اسے مکمل یقین تو نہیں تھا' تاہم قوی امید تھی کہ کام ہو گیا ہے۔ اس نے کافی دیر تک گیس سلنڈر کو بند رکھا تھا اور شاہدہ کا جسم پھڑک پھڑک کر بالآخر ساکت ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں اس میں کچھ جان باقی رہ گئی تھی یا نہیں۔ اس نے تو اپنا کام بہر حال کر ڈالا تھا۔

اسے آفس پہنچے ہوئے ذرا ہی دیر گزری ہو گی کہ منیر سخت گھبرایا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''بہت عجیب اور بری خبر ہے۔'' منیر نے بھرائی ہوئی آواز میں فیضو سے کہا۔ ''اسپتال سے ابھی ابھی میرے پاس ہماری پرائیویٹ نرس جمیلہ کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ .....کہ.....شاہدہ بھابی کا انتقال ہو گیا.....''

''اوہ نو.....'' فیضو اپنی کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''یہ.....کیا بک رہے ہو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو اس کو اچھی خاصی حالت میں چھوڑ کر آیا تھا۔ جمیلہ سے کہہ کر آیا تھا کہ اس کا اور دونوں بچیوں کا پوری طرح سے خیال رکھے۔ ایسا.....ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''جمیلہ ہی نے اطلاع دی ہے۔'' منیر نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کے وہاں سے آنے کے کچھ دیر بعد جب ڈاکٹر ان کو دیکھنے کے لیے آئی تو اس وقت وہ زندہ نہیں تھیں۔ آپ چلئے' میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔''

فیضو جب دروازے کی طرف بڑھا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اسے خود کو منیر کے سامنے اور دوسرے لوگوں کے سامنے' مجسم درد و غم کی تصویر بنا کر پیش کرنا تھا۔

وہ دونوں اسپتال پہنچے تو پرائیویٹ نرس جمیلہ انہیں سامنے ہی نظر آ گئی۔ وہ اسپتال کے دروازے پر ہی فیضو کا انتظار کر رہی تھی۔

''ڈاکٹر شازیہ کا کہنا ہے کہ مریضہ کا ہارٹ فیل ہو گیا.....اچانک۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ بس اچانک.....میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا سر۔''

ڈاکٹر شازیہ اور دوسری ڈاکٹر' سب کی سب سخت حواس باختہ تھیں۔ فیضو نے ڈاکٹر

شازیہ کو کڑے تیوروں کے ساتھ گھورتے ہوئے' بھاری اور قہر آلود آواز میں کہا۔ ''یہ کیسے ہو گیا' ڈاکٹر صاحبہ؟ کچھ ہی دیر پہلے تو میں ان کو بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں چھوڑ کر گیا تھا۔ نرس جمیلہ بھی کمرے میں موجود تھی۔''

''جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' ڈاکٹر شازیہ نے کہا۔ ''لیکن اس کے کچھ ہی دیر بعد جب ڈاکٹر مریم مریضہ کے معائنے کے لیے گئیں تو انہوں نے مریضہ کو مردہ پایا۔ موت کی واحد وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے دل کے دھڑکن اچانک بند ہو گئی۔ کیونکہ آکسیجن تو برابر جا رہی تھی اور سپلائی رکی نہیں تھی۔ وہ سانس کی تکلیف کی وجہ سے نہیں مر سکتی تھیں۔''

کچھ ہی دیر بعد شاہدہ کی لاش کو اس کے فلیٹ پر پہنچا دیا گیا جہاں اس کے نیم معذور بھائی اور ملازمہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ریاض اپنی بہن کی اچانک اور غیر متوقع موت پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ ملازمہ بھی دم بخود تھی۔ وہ تو بیگم صاحبہ کو ٹھیک ٹھاک حالت میں چھوڑ کر آئی تھی۔

''ہم جب تک بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کوئی دوسرا مناسب بندوبست نہیں کر لیتے' اس وقت تک اگر آپ رضامند ہوں تو آپ اس گھر میں رہ کر ان بچیوں کی دیکھ بھال کیجیے۔'' فیضو نے نرس جمیلہ سے کہا۔ ''آپ جو معاوضہ چاہیں گی وہ آپ کو دیا جائے گا۔ جلد ہی میں ان کے لیے کوئی مستقل اور باقاعدہ بندوبست کر لوں گا۔''

جمیلہ معقول معاوضہ لے کر یہ کام کرنے کے لیے بخوشی تیار ہو گئی۔

شاہدہ کی موت پر خون کے آنسو رونے والا اس کے اکلوتے نیم معذور بھائی ریاض کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ریاض کے دکھ کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ دنیا میں اس کا اس بہن کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہی ایک بہن تو اس کا سارا اثاثہ تھی اور اسے آج اس سے چھین لیا گیا تھا۔ فیضو' ریاض کو تسلی دے رہا تھا۔

فیضو نے منیر کو ہدایت کی کہ شاہدہ کی جلد از جلد تدفین کے سارے انتظامات کر دیئے جائیں۔ نہ کسی کو اطلاع دینی تھی' نہ کسی کا انتظار کرنا تھا' نہ کسی کو فون کرنا تھا۔ شاہدہ بے چاری کا تو کوئی تھا بھی نہیں۔ فیضو نے بہت سوچ سمجھ کر اور تلاش کر کے شاہدہ جیسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ اور اب وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ اس کا انتخاب بالکل صحیح تھا۔

اسی دن ظہر کی نماز کے بعد علاقے کی ایک مسجد میں شاہدہ کی نماز جنازہ پڑھا دی گئی اور پھر اسے دفن کر دیا گیا۔

''دیکھو۔'' فیضو نے ملازمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ریاض کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ وہ

بے چارہ نیم معذور ہے۔ سسٹر جمیلہ بچیوں کا خیال رکھیں گی۔ منیر صاحب آتے رہیں گے اور میں بھی چند دن کے بعد چکر لگاؤں گا۔ اگر کوئی بھی فوری ضرورت ہو تو تم منیر صاحب کو فون کر سکتی ہو۔ انہیں بلا سکتی ہو۔"

"جی صاحب!" ملازمہ نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ اسے اپنی مالکن کی موت کا بہت رنج تھا جو ایسی کم عمری میں دو بچیوں کو چھوڑ کر مر گئی تھی۔ اس کی بھی بھلا کوئی مرنے کی عمر تھی۔ وہ تو بھلی چنگی تھی خدا معلوم اچانک ایسا کیا ہو گیا کہ وہ مر گئی۔

فیضو تو وہاں سے چلا آیا تھا۔ البتہ منیر شام تک رکا رہا۔ بچیوں کی ضروریات کی بہت ساری چیزوں کا بندوبست کرنا تھا۔ نرس جمیلہ کو ساتھ لے کر اس کے گھر جانا تھا تاکہ وہ وہاں سے اپنے کپڑے اور دوسرا ضروری سامان لے آئے۔

سارے معاملات کو آخری شکل دینے کے بعد ہی منیر وہاں سے روانہ ہو سکا۔ سسٹر جمیلہ بچیوں کی دیکھ بھال کے لیے پوری تیاری سے آ گئی تھی۔ اگرچہ دونوں بچیاں پوری طرح سے تندرست اور ٹھیک ٹھاک تھیں، پھر بھی منیر نے سسٹر جمیلہ کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی تھی کہ کسی بھی تکلیف کی صورت میں وہ بچیوں کو فوراً اس اسپتال میں لے جائے جہاں وہ پیدا ہوئی تھیں۔ بچیوں کو ضروری ٹیکے وغیرہ لگوانے کا بھی بندوبست کر دیا گیا تھا۔

منیر نے فیضو کو فون کر کے سارے انتظامات کے بارے میں اطلاع دے دی۔ فیضو نے اطمینان کا سانس لیا۔ ابھی تک تو سب کچھ ٹھیک رہا تھا۔ اس نے اسپتال کے ڈاکٹروں کی بری طرح خبر لی تھی اور ان پر غفلت اور لاپرواہی کا الزام لگاتے ہوئے انہیں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ وہ ان کے خلاف کارروائی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ اسپتال کا عملہ اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ ڈاکٹروں یا عملے نے کسی بھی قسم کی لاپرواہی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

جڑواں بچیوں کی پیدائش کے واقعے نے فیضو کو بہت زیادہ ملول اور دل گرفتہ کر دیا تھا اور کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس مایوس کن نتیجے پر پہنچا تھا کہ اب اس قسم کی کارروائیوں کی مزید گنجائش نہیں ہے۔ شاہدہ سے تو اس نے خاموشی سے نجات حاصل کر لی تھی، لیکن ہر بار قسمت ایسا موقع نہیں دے سکتی تھی۔ اگر اگلی بیوی سے بھی بیٹی ہی پیدا ہوئی تو پھر؟ یہ دونوں بیٹیاں ہی اس کے لیے ایک ایسا عذاب بنی ہوئی تھیں جن سے نجات حاصل کرنے کے محفوظ ترین طریقوں کے بارے میں وہ سوچ رہا تھا۔ بچیوں کے علاوہ مرحومہ کے نیم معذور بھائی کا مسئلہ بھی تھا، جس کا بہن کی موت کے بعد اب کوئی سہارا نہیں تھا۔ فیضو کو وہ فلیٹ بھی واپس اپنی ملکیت میں لینا تھا۔ وہ اسے ریاض کے حوالے تو نہیں کر سکتا تھا۔

ان تمام مسائل کا حل اس نے تلاش کر لیا سب سے پہلے تو ریاض کا بندوبست کرنا تھا۔

منیر تقریباً روزانہ ہی فلیٹ کا چکر لگا لیتا تھا اور جس روز نہیں جا پاتا تھا تو فون کر لیتا تھا۔ وہاں سب کچھ ٹھیک تھا۔ بچیوں کو ضروری انجکشن وغیرہ لگ چکے تھے۔ وہ ٹھیک تھیں اور جمیلہ ان کی مناسب طور پر دیکھ بھال کر رہی تھی۔ نرس اور ملازمہ دونوں وہاں چوبیس گھنٹے رہتی تھیں۔ اور ملازمہ ریاض کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

اس روز منیر فلیٹ پر آیا اور اس نے سسٹر جمیلہ اور ملازمہ کو بتایا کہ ریاض کی رہائش کا بندوبست ایک رشتے دار کے ہاں کر دیا گیا ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔

"وہ صرف کسی خاندان کے ساتھ ہی رہ سکتا ہے۔" منیر نے ان دونوں سے کہا۔ "ظاہر ہے کہ بے چارہ اکیلا تو نہیں رہ سکتا اور آپ لوگ ساری زندگی تو اس کی خدمت پر مامور نہیں رہ سکتیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں صاحب جی۔" ملازمہ نے کہا۔ "معذور بندہ کسی مستقل سہارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"ان شاء اللہ جلد ہی بچیوں کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔" منیر نے کہا۔ "صاحب ان کے لیے گھر میں انتظام کر رہے ہیں۔"

"یہ اچھا ہے۔" سسٹر جمیلہ نے کہا۔ "بچیوں کو بھی گھر کی اور گھر کے لوگوں کی ضرورت ہے۔"

منیر نے ریاض کا سامان تیار کروایا اور اس کو بتایا کہ اسے اب ایک اور جگہ رہنا ہو گا۔ ریاض کا دماغ پورے طور پر کام نہیں کرتا تھا اور اس کے نتیجے میں اس کے جسمانی افعال درست نہیں تھے۔ وہ ٹھیک سے نہیں چل پاتا تھا اور نہ ٹھیک سے بول پاتا تھا۔ البتہ باتیں سمجھ لیتا تھا اس کو معلوم تھا کہ اس کی بہن مر چکی ہے اور وہ بہن کی موت پر بلبلا بلبلا کر رو رہا تھا۔

منیر نے ریاض کو گاڑی میں بٹھایا اور پھر اسے ساتھ لے کر ایدھی ہوم میں جا پہنچا جہاں اس نے فیضو کی ہدایت کے مطابق ریاض کے داخلے اور مستقل رہائش کا بندوبست کر دیا تھا۔

ریاض اور اس کی مرحوم بہن شاہدہ کا فیڈرل بی ایریا میں ایک سو بیس گز کا ایک مکان جو ان دونوں بہن بھائیوں کی واحد اور مشترکہ ملکیت تھا۔ فی الوقت اس مکان میں کرائے دار رہ رہے تھے۔ شاہدہ مرحومہ کے شوہر اور وارث کی حیثیت سے فیضو اس مکان کی ملکیت کے حقوق کو اپنے نام منتقل کروا لینے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن ابھی اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ یہ کام بعد میں بھی آسانی سے ہو سکتا تھا۔ اس فلیٹ کی ملکیت بھی فیضو کو اپنے نام کروا لینی تھی، جو اس

نے شاہدہ کے نام سے خریدا تھا۔

ریاض کو ایدھی ہوم میں پہنچا دیا گیا اور کچھ رقم عطیے کے طور پر دے دی گئی۔ ریاض کو یہ کہہ کر داخل کروایا گیا کہ وہ ایک نیم معذور لاوارث ہے اور زندہ رہنے کے وسائل سے بھی مکمل طور پر محروم ہے۔

''تم نے ریاض کے معاملے کو تو بڑی عمدگی کے ساتھ نمٹا دیا۔'' فیضو نے منیر سے کہا۔ ''اب اسی عمدگی کے ساتھ ان دونوں بچیوں کے معاملے کو بھی نمٹا دو۔ بالکل وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔''

''تو..... آپ..... واقعی.....''

''ہاں ہاں۔'' فیضو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں واقعی ایسا ہی چاہتا ہوں۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے..... بیٹی تو میرے لیے بس ایک ہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ مجھے نہیں چاہئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' منیر نے آہستہ سے کہا۔ ''جیسا آپ چاہیں۔''

''اس میں مشکل کیا ہے؟'' فیضو نے کہا۔ ''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ ایدھی سنٹروں کے آگے پالنے رکھے ہوتے ہیں۔ بس خاموشی سے جاؤ اور دونوں بچیوں کو پالنے میں ڈال دو۔ ایک منٹ لگے گا۔ بس چند سیکنڈ کے لیے گاڑی سے اترنا پڑے گا اور پھر وہاں سے چل پڑو..... کچھ مشکل نہیں ہے۔ بچیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ایدھی سینٹر والے انہیں فوراً اٹھا لیں گے اور پھر ان کی پرورش کی ذمہ داری انہی لوگوں کی ہوگی۔''

اگلے روز منیر نے فلیٹ پر جا کر ملازمہ اور سسٹر جمیلہ سے کہا کہ وہ بچیوں کو باہر لے جانے کے لئے تیار کر دیں اور ان کا جو سامان ہے' وہ پیک کر دیں۔

''بچیوں کے لیے دوسری جگہ رہائش اور پرورش کا بندوبست ہو گیا ہے۔'' منیر نے ان دونوں کو بتایا۔ ''صاحب نے اپنی بچیوں کے لیے بہت عمدہ بندوبست کر دیا ہے۔ اب یہ یہاں سے جا رہی ہیں اور آپ دونوں کی خدمات کی بھی اب ضرورت نہیں رہی ہے۔ آپ کو صاحب نے ایک ایک ماہ کی اضافی تنخواہ دی ہے اور بس' آج سے آپ کا کام ختم۔''

منیر نے ان دونوں عورتوں کو ان کے واجبات مع اضافی تنخواہ کے ادا کر کے ان کی چھٹی کر دی۔ وہ دونوں اپنا اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے چلی گئیں۔ فلیٹ خالی ہو چکا تھا' منیر نے بچیوں کو وہاں سے نکال کر فلیٹ میں تالا لگا دیا۔ دونوں بچیاں اب منیر کے ساتھ گاڑی میں تھیں۔

منیر نے فیضو کو ساری کارروائی کی اطلاع دے دی۔ سارے کام فیضو کی ہدایات کے مطابق انجام پا چکے تھے۔ فیضو نے اطمینان کا سانس لیا۔ فیضو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی برا خواب دیکھا تھا۔ شاہدہ کا اس کی زندگی میں آنا اور پھر اسے مزید دو بچیوں کا باپ بنا دینا' ایک بھیانک خواب ہی تو تھا' جسے فیضو اپنی زندگی میں کوئی جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اس سارے خواب کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہتا تھا اور آئندہ بھی ایسا کوئی خواب نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

شاہدہ کے ساتھ دوسری شادی اور جڑواں بچیوں کی پیدائش کے سلسلہ واقعات کے بارے میں یاسمین اور تزئین کو کچھ معلوم نہیں تھا' یہ واقعات کی ایک ایسی رَو تھی جو انہیں چھوئے بغیر آہستہ سے بالکل خاموشی سے گزر گئی تھی۔

فیضو کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی بچیوں کے ساتھ کیا ہوا اور اب وہ کہاں ہیں اور نہ ہی اس کو اس بات سے کوئی دلچسپی تھی۔ شاہدہ کی موت کے بعد تو اس نے ان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

ایک سال کا عرصہ مزید گزر گیا۔ اس دوران ایدھی ہوم میں نیم معذور ریاض کا انتقال ہو گیا اور فیضو نے اس کے فیڈرل بی ایریا والے مکان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اگرچہ شاہدہ کی موت کے بعد فیضو نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ بیٹے کی جستجو کے لیے مزید کوئی شادی نہیں کرے گا' پھر بھی کبھی کبھی اس کے دل میں دبی دبی سی یہ خواہش ابھرتی تھی کہ شاید..... شاید..... قدرت اس پر مہربان ہو جائے اور نئی شادی کے نتیجے میں وہ ایک بیٹے کا باپ بن جائے' لیکن پھر طرح طرح کے خدشات اس کے دماغ میں سر اٹھانے لگتے تھے۔ اگر پھر بیٹی پیدا ہوئی تو؟ پھر اسے تیسری بیوی اور اس کی بچی کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہوگا؟ شاہدہ اور اس کی بچیوں کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا' وہ سب کچھ نہایت خطرناک اور غیر معمولی تھا اور اس قسم کے واقعات کو بار بار نہیں دہرایا جا سکتا تھا۔ وہ تو منیر جیسا قابل اعتماد رازداں ساتھ میں تھا' جس سے بہت مدد ملی' لیکن منیر بھی پورے راز سے تو واقف نہیں تھا' اسے شاہدہ کی موت کی اصل' کا علم نہیں تھا۔

بیٹے سے محرومی کی دیمک اگرچہ فیضو کے وجود کو برابر چاٹتی رہتی تھی' لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا کہ اس احساسِ محرومی کے باعث اس کی اضافہ دولت کی خواہش اور جدوجہد میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہو' بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ دولت کمانے کے نہ جانے کتنے بہت سے راستے تھے جن پر وہ بیک وقت دوڑتا بھاگتا رہتا تھا۔ اس

نے اپنے وجود کو ان تمام راستوں کی تعداد سے ضرب دے کر حاصل ضرب کو ان سارے راستوں پر بکھیر دیا تھا اور ہر راستہ اس کے قدموں تلے ہموار اور آرام دہ بنتا چلا جاتا تھا۔

فیضو کی اس خواہش میں بار بار کچھ شدت پیدا ہونے لگتی تھی کہ وہ ایک تجربہ اور کر کے دیکھے.....لیکن ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا ایک واقعے نے اسے پھر سے چوکنا کر دیا۔

ثریا ایک بہت بڑے بیوروکریٹ کی بیوہ بھتیجی تھی جو نوجوانی میں ہی ماں بنے بغیر بیوہ ہوگئی تھی۔ بیوروکریٹ کی سفارش' بلکہ حکم پر فیضو نے ثریا کو' جو اعلیٰ تعلیم تھی' اپنی کمپنی میں ایک اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز کر رکھا تھا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد فیضو نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ بیوروکریٹ کی بھتیجی ثریا اس میں دلچسپی لینے لگی ہے لیکن فیضو کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس بیوروکریٹ کی ناراضگی کا سبب بن جائے' جس سے فیضو کے ہزاروں کام اٹکتے تھے۔ ثریا نے کسی ذریعے سے فیضو کو یہ عندیہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہے اور یہ کہ ثریا اس کی پہلی بیوی اور بیٹی کی راہ میں کبھی بھی مزاحم نہیں ہوگی' نیز یہ کہ وہ مالی اعتبار سے بھی اس پر بوجھ نہیں بنے گی۔

ان دنوں فیضو سنجیدگی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہا تھا' لیکن' ثریا اس کے مطلب کی لڑکی نہیں تھی۔ ثریا کا تعلق بہت طاقتور بیوروکریٹ گھرانے سے تھا اور اس کا ایک بڑا بھائی ہائی کورٹ کا جج بھی تھا۔ فیضو کو دوسری شادی کے لیے اس سے بہت نچلی سطح کی ایسی لڑکی چاہئے تھی جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو اور شاہدہ جیسی لڑکی اس کے مطلب کی تھی۔

فیضو نے ثریا سے معذرت کر لی تھی اس کے بعد جلد ہی ثریا کی کسی دوسری جگہ شادی ہوگئی تھی لیکن ثریا نے نوکری نہیں چھوڑی تھی اور وہ بدستور کمپنی میں کام کرتی رہی تھی۔

ثریا کی شادی سے پہلے ہی' فیضو خفیہ طور پر شاہدہ سے شادی کر چکا تھا اور لوگوں کو اس شادی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ شاہدہ کے ہاں بچیوں کی پیدائش سے کچھ پہلے ثریا امید سے ہوگئی تھی

وہ ان دنوں طویل رخصت پر تھی اور اس کے ہاں جلد ہی ولادت ہونے والی تھی۔ فیضو کو اس سارے معاملے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ثریا کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں رہی تھی اور اس کا ثریا کے ذاتی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

شاہدہ کی موت کے پانچ ماہ بعد فیضو کو ثریا کے ہاں ولادت کی اطلاع ملی۔

ثریا نے ایک بچی کو جنم دیا تھا۔

اگرچہ یہ فیضو کا مسئلہ قطعی نہیں تھا کہ ثریا بیٹے کو جنم دیتی ہے یا بیٹی کو' لیکن اس خبر سے اس کو ایک گونہ اطمینان سا محسوس ہوا اور ساتھ ہی افسوس بھی ہوا۔

اگر اس نے ثریا سے شادی کر لی ہوتی.....پھر بچی پیدا ہوئی ہوتی تو پھر کیا ہوتا؟ کیا وہ ثریا کے ساتھ بھی وہی سب کچھ کر سکتا تھا جو اس نے شاہدہ کے ساتھ کیا؟ یقیناً نہیں.....ثریا کے ساتھ ایسا کرنا ناممکن تھا.....اور ثریا کی بچی کے ساتھ؟ نہیں' ثریا کی بچی کے ساتھ بھی وہ.....کچھ کرنا ناممکن تھا.....ثریا اور اس کی بچی تو اس کے لیے زندگی بھر کا عذاب بن جاتیں' بہت ہی اچھا ہوا کہ اس نے ثریا سے شادی نہیں کی۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی عورتوں نے لڑکوں کو جنم دینا چھوڑ دیا ہے!'' فیضو نے سخت بیزاری کے ساتھ دل ہی دل میں کہا۔

ثریا کے ہاں بیٹی کی پیدائش نے فیضو کو کچھ مزید خوفزدہ کر دیا تھا..... بیٹی..... بیٹی..... بیٹی..... بیٹیاں تو جیسے بھوت بن کر اس کے وجود سے لپٹ گئیں تھیں۔

تیسری شادی کے بارے میں اسے کوئی حتمی فیصلہ کرنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی' خدا جانے اس کا کیا نتیجہ نکلے۔

☆======☆======☆

اس کی بیٹی تزئین اب تقریباً سترہ سال کی ہو چکی تھی اور وہ والدین کی محبت کا واحد مرکز تھی۔ اس کی پرورش انتہائی ناز و نعم کے ساتھ ہوئی تھی' لیکن وہ ایک بگڑی ہوئی رئیس زادی نہیں تھی۔ وہ ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی تھی اور اسے پڑھائی سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اپنے باپ کی طرح سائنس دان نہیں تھی' بلکہ ادب اور تاریخ سے اسے بہت گہرا لگاؤ تھا اور اس کا ارادہ تاریخ میں پی ایچ ڈی کرنے کا تھا۔ فیضو اور یاسمین نے کبھی بھی اپنے فیصلے اس پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ تزئین کو اپنے پسندیدہ تعلیمی موضوعات کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔

فیضو نے شروع دن ہی سے یاسمین کو اپنے کاروباری معاملات سے بالکل الگ رکھا تھا اور یاسمین کو اس کے شاخ در شاخ پھیلے ہوئے زہریلے کاروباری درخت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں معلوم تھا۔ تزئین کو بھی اپنے باپ کے کاروباری امور سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور فیضو اس بات سے بہت مطمئن تھا۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ اس کی بیٹی اس کے کاروباری اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہو جائے۔

لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے' ویسے ویسے فیضو کے ذہنی دباؤ اور تناؤ میں بھی

اضافہ ہوتا جارہا تھا۔عمر ڈھل رہی تھی۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اس کی مدت زندگی گھٹتی جارہی تھی اور دولت کے خزانے بڑھتے جارہے تھے۔جنہیں دیکھ کر وہ خوش ہوتا تھا لیکن اولادِ نرینہ کا نہ ہونا اس خوشی کو برابر متاثر بھی کرتا رہتا تھا۔

وہ اکثر اپنے ہونے والے داماد کے بارے میں سوچتا تھا.....خدا جانے وہ کون ہوگا' کیسا ہوگا اور وہ اس کی بیٹی کو خوش رکھ سکے گا یا نہیں۔خدا معلوم تزئین والدین کی مرضی سے شادی کرے گی یا شادی کے سلسلے میں اپنی پسند پر ہی اصرار کرے گی۔موجودہ حالات میں تزئین کی شادی کا معاملہ فیضو کے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بیٹے کی عدم موجودگی میں اس کی واحد وارث بنتی تھی' اور بیٹی کے حوالے سے داماد.....نہ جانے کیسا داماد ہوگا؟ اسے کیسا ہونا چاہئے؟

انہی ساری باتوں کے بارے میں سوچتے سوچتے فیضو پر ایک اضمحلالی کیفیت طاری ہوجاتی۔بعض دوستوں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ کسی نومولود لڑکے کو گود لے لے' لیکن فیضو نے اس خیال کو یکسر مسترد کردیا۔وہ کسی دوسرے کو' نامعلوم والدین کی اولاد کو اپنی اولاد کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆======☆======☆

اور پھر ایک دن اچانک جیسے ایک معجزہ ہوگیا۔

اس روز یاسمین نے ڈرتے ڈرتے۔سہمتے ہوئے قدرے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں فیضو کو مطلع کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

فیضو کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ناشتے کی میز پر وہ اور یاسمین تنہا تھے' تزئین کالج جاچکی تھی۔

''کیا؟'' فیضو نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔اس کے منہ سے آواز ٹھیک طرح نہیں نکل رہی تھی۔''کیا.....تم.....تم کس طرح یہ بات کہہ سکتی ہو؟''

''میں نے مکمل چیک اپ کروایا ہے۔'' یاسمین نے آہستہ سے آنکھیں جھکا کر کہا۔''پچھلے ایک ماہ کے دوران میں چار الگ الگ گائنا کالوجسٹوں کو اپنا چیک اپ کروا چکی ہوں۔سب کی تشخیص ایک ہی ہے۔''

فیضو کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔تزئین کی پیدائش کے تقریباً اٹھارہ سال کے بعد ناقابلِ یقین حد تک طویل عرصے کے بعد یاسمین ایک بار پھر ماں بننے جارہی تھی۔اس سے پہلے کراچی سے لندن تک لاکھوں روپے کے خرچ کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا

اور اب.....اب اچانک یاسمین نے اسے ایک ایسی خوشخبری سنادی تھی جس کو سننے کی امید فیضو نے ایک بہت طویل عرصہ پہلے ہی ختم کردی تھی۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں؟'' فیضو نے مرتعش آواز میں کہا۔''میں خود تمہارے ساتھ چلتا۔''

''اس کی ضرورت نہیں تھی۔'' یاسمین نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''پہلے تو میں خود یقین حاصل کرلینا چاہتی تھی کہ واقعی ایسا ہے یا یہ محض کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔''

''نہیں۔'' فیضو نے کہا۔''اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی۔جدید نوعیت کے ٹیسٹوں سے یہ بات سو فیصد یقین کے ساتھ معلوم ہوجاتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔تم کون کون سی گائنا کالوجسٹوں کے پاس گئی تھیں؟''

یاسمین نے اسے ان ماہر لیڈی ڈاکٹروں کے نام بتائے جن کے پاس وہ گئی تھی۔

''چاروں ٹاپ کلاس کی گائنا کالوجسٹ ہیں۔'' فیضو نے کہا۔''ان کی تشخیص میں کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔کمال ہے! میں نے تو سمجھا تھا کہ اب سب کچھ.....مطلب یہ کہ ختم ہو چکا ہے۔''

''میں خود بھی یہی سمجھتی تھی' بلکہ اب بھی سمجھتی ہوں۔'' یاسمین نے کہا۔''کون جانے' یہ واقعی کوئی غلط فہمی ہو ڈاکٹروں سے بھی تو کوئی غلطی ہوسکتی ہے، ٹیسٹوں میں بھی تو الٹ پھیر ہوسکتا ہے۔''

''تم نے مجھے اپنی رپورٹیں نہیں دکھائیں۔'' فیضو نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''آدھے سے زیادہ ڈاکٹر تو میں خود بھی ہوں.....آخر ساری عمر دواؤں میں کھیلتے گزری ہے۔''

''ابھی دکھاتی ہوں۔'' یاسمین نے مسکرا کر کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ذرا دیر میں وہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔اس نے وہ فائل فیضو کی طرف بڑھا دی۔فیضو کافی دیر تک بڑے غور سے اس فائل کے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا۔

''مبارک ہو!'' اس نے فائل واپس کرتے ہوئے یاسمین کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔''اگرچہ یہ بات بظاہر ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے لیکن فی الحقیقت یہ سچ ہے کہ تم ماں بننے والی ہو۔یہ ساری رپورٹیں اس سچائی کی گواہ ہیں۔اُف میرے خدا۔اتنے عرصے کے بعد۔''

''سچ پوچھو تو مجھے بے حد شرم آرہی ہے۔'' یاسمین نے کہا۔''جوان بیٹی کی موجودگی میں

یہ سب تماشے..... یہ بڑھاپے کے چونچلے.....''

''کس نے کہہ دیا کہ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں؟'' فیضو نے ایک عجیب سرخوشی کے عالم میں کہا۔ ''جہاں تک مرد کا تعلق ہے وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ مرد کی جوانی ہر عمر میں قائم رہ سکتی ہے اور رہتی ہے اور تم..... تم بوڑھی نہیں ہوئی ہو یاسمین..... تم ماں بننے جا رہی ہو۔ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟ تزئین کو یہ جان کر بہت خوش ہونا چاہیے کہ اس کے گھر میں ایک نیا مہمان آنے والا ہے۔''

''خدا جانے' آنے والا ہے یا آنے والی ہے۔'' یاسمین کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ بکھر گئی اور فیضو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔

وہ اپنے زبردست ہیجان' اضطراب اور سرخوشی کے عالم میں بھی اس بات کو ایک لمحے کے لیے فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے یہاں بیٹا پیدا ہوگا یا بیٹی!

''اس بار ضرور بیٹا پیدا ہوگا۔'' فیضو نے اپنی دلی تمنا کے سارے درد کو اپنے لہجے میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اس بار ضرور بیٹا ہوگا۔''

''اتنے یقین کے ساتھ بھلا کون کہہ سکتا ہے؟'' یاسمین نے کمزور آواز میں کہا۔

تزئین کے لیے یہ خبر انتہا سے زیادہ حیرت انگیز اور تقریباً ناقابلِ یقین تھی کہ اس کی ماں اتنے طویل وقفے کے بعد ماں بننے جا رہی تھی۔ اس کا پہلا ردِعمل شدید حیرت اور بے یقینی کا اور اس کے بعد سرخوشی کا تھا۔ یاسمین تزئین کے سامنے بہت جھینپ رہی تھی لیکن تزئین نے اس کو بہت حوصلہ دیا۔ اس نے اس کے گلے میں دونوں بانہیں ڈال کر اس کو مبارکباد دی اور کہا کہ وہ اپنے ننھے بھائی یا بہن کو پا کر بہت زیادہ خوش ہوگی۔

فیضو کے لیے یہ ایک ایسا مژدہ جانفزا تھا جس نے اس کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ ایک بار پھر یاسمین کی جانب بہت زیادہ ملتفت ہو گیا۔ اس طویل عرصے میں یاسمین کو اس کی زندگی میں کوئی خاص دخل نہیں رہا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی' گھر کی مالکن تھی' گھر میں اس کی ہی حکومت چلتی تھی اور فیضو اس کے گھریلو معاملات سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ اس کی اپنی دنیا اس قدر وسیع اور پیچ دار تھی کہ اس میں ایک ڈھلتی ہوئی عمر کی عورت کے لیے کوئی خاص گنجائش نہیں تھی۔ خواہ وہ عورت اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو لیکن اب اچانک یاسمین اس کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ فیضو اب گھر پر بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ وقت گزارنے لگا تھا اور یاسمین کی زیادہ سے زیادہ دل جوئی کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ اس نے شہر کے ایک نہایت مہنگے اور اعلیٰ درجے کے اسپتال کے گائنا کالوجسٹ یونٹ میں یاسمین کا رجسٹریشن

کروا دیا تھا تاکہ کسی بھی دوسری پیچیدگی کے سلسلے میں کسی دوسرے اسپتال بھاگنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ڈاکٹروں نے اس کو یہ بات پہلے ہی بتا دی تھی کہ یہ ڈھلتی ہوئی عمر کی زچگی ہوگی اس میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

فیضو کو یاسمین کے ساتھ ہونے والی پیچیدگیوں کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ یاسمین ایک صحت مند بیٹے کو جنم دے دے اور بس..... اس کے بعد یاسمین کا کام ختم ہو جاتا تھا لیکن اس سے پہلے..... اس سے پہلے تو یاسمین ہی سب کچھ تھی۔

یاسمین کو وہ بہترین طبی سہولتیں حاصل تھیں جن کا کراچی جیسے شہر میں تصور کیا جا سکتا تھا گھر کی ایک پرانی اور تجربہ کار ملازمہ کو صرف یاسمین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک نئی ملازمہ رکھ لی گئی تھی۔

وقت اپنی مقررہ رفتار سے ہی گزرتا ہے اور یہ رفتار ہمیشہ یکساں ہوتی ہے۔ اربوں سال سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی' یہ انسان ہے جو اپنے داخلی محسوسات کے تحت کبھی وقت کو تیزی سے گزرتا ہوا' اور کبھی آہستگی کے ساتھ گزرتا ہوا پاتا ہے۔ ہر انسان کے یہ داخلی محسوسات الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گزران وقت کا اس کا تصور بھی مختلف ہوتا ہے۔ فیضو کے لیے ایک نئے تصور نے جنم لیا تھا۔ وہ انتظار کے ایک ایسے شدید کرب سے گزر رہا تھا جو ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ جیسے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اسے انتظار اس دن کا تھا جب یاسمین اس راز کو افشا کرے گی..... کاش یہ راز ایک جیتے جاگتے بیٹے کی شکل میں ظاہر ہو۔

اس بار بھی' کئی مرتبہ اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ یاسمین کے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے پہلے سے یہ بات معلوم کر لے کہ وہ بیٹے کو جنم دے گی یا بیٹی کو..... لیکن جس طرح وہ شاہدہ کے معاملے میں وہ خوفزدہ تھا اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ یاسمین کے معاملے میں خوفزدہ تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ وقت سے پہلے کوئی عذاب مول نہیں لے گا جو کچھ ہوگا' وقت آنے پر ہی دیکھا جائے گا..... تب تک اسے کرب اور انتظار کی اس کیفیت سے گزرتے رہنا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے زچگی کا وقت قریب آ گیا اور یاسمین کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس سے پہلے اس کا برابر معائنہ ہوتا رہتا تھا اور ڈاکٹر اس کی جانب سے پورے طور پر مطمئن تھے۔ فیضو خود بھی ڈاکٹروں سے بات کرتا رہتا تھا اور تمام معاملات سے اپنے آپ کو پوری طرح باخبر رکھتا تھا۔

یاسمین کو علی الصبح اسپتال لے جایا گیا تھا۔ فیضو اس کے ساتھ گیا تھا۔ تزئین بھی ساتھ ہی

جانا چاہتی تھی' لیکن فیضو نے اس سے کہا کہ وہ کچھ دیر کے بعد اطمینان سے آجائے۔ یاسمین کی ملازمہ خاص بھی اس کے ساتھ گئی تھی۔

اسپتال میں دو کمرے پہلے ہی سے بک کروائے جا چکے تھے' تاکہ ساتھ رہنے والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

کچھ دیر بعد تزئین وہاں پہنچ گئی۔ وہ بہت خوش اور مضطرب نظر آرہی تھی۔ اس کے گھر میں طویل عرصے کے بعد غیر متوقع طور پر ایک نیا مہمان آنے والا تھا' جس کو سنبھالنے اور جس کے ساتھ کھیلنے کی وہ زبردست خواہش رکھتی تھی اور اس کے لیے تیاری بھی کر رہی تھی۔ مہینوں پہلے سے اس نے گھر میں نرسری تیار کرنا شروع کر دی تھی۔ اتنے بڑے اور شاندار گھر میں بچوں کا کوئی کمرہ ہی نہیں تھا' کیونکہ اس گھر میں کوئی چھوٹا یا بڑا بچہ نہ تھا۔ تزئین ننھے بچے کے کمرے کی تیاری اس طرح کر رہی تھی جیسے وہ خود کوئی شادی شدہ عورت ہو اور ماں بننے جا رہی ہو۔ اس نے اس کمرے کی تیاری پر' جسے نرسری کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا' لاکھوں روپے صرف کر دیئے تھے۔ وہ نئے مہمان کا شایانِ شان استقبال کرنا چاہتی تھی۔

اسی دن شام کو یاسمین کو لیبر روم مین لے جایا گیا۔ فیضو وہاں موجود تھا اور تزئین بھی موجود تھی۔ کئی ماہر لیڈی ڈاکٹر اسپیشل کال پر وہاں آئی ہوئی تھیں اور انہیں آخر وقت تک وہیں موجود رہنا تھا۔

فیضو کے دل کی اضطرابی کیفیت اپنے کرب کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ شاید یہ آخری موقع ہو..... قدرت یاسمین پر اٹھارہ سال کے بعد دوبارہ مہربان ہوئی تھی اور اب مزید مہربان نہیں ہو سکتی تھی۔ عمر کا خزانہ تیزی سے خرچ ہو رہا تھا۔ اب اٹھارہ سال تو دور کی بات رہی' آٹھ سال بھی انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وقت مزید مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جو مہلت مل گئی تھی' وہی غیر متوقع اور غیر معمولی تھی۔

بہت دیر ہو گئی تھی اور کمرے سے کوئی شخص باہر نہیں نکلا تھا۔ فیضو بے چینی کے عالم میں کمرے کے باہر کاریڈور میں کبھی ٹہلنے لگتا' کبھی صوفے پر بیٹھ جاتا' تزئین نے اس سے کچھ بات کرنے کی کوشش کی' لیکن وہ بالکل بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

کافی دیر کے بعد ایک سینئر نرس لیبر روم سے باہر نکل آئی۔ فیضو نے اسے روک لیا۔

''کیا..... کیا ہوا سسٹر؟'' فیضو کی آواز لرز رہی تھی۔

''اب تک تو ڈاکٹر نارمل ڈیلیوری کی کوشش کر رہی تھیں۔'' نرس نے جواب میں جلدی جلدی کہا۔ ''لیکن نارمل ڈیلیوری نہیں ہو سکی ہے۔ اب آپریشن کریں گی۔ ویسے خطرے کی کوئی

بات نہیں ہے۔''

اور وہ مزید بات کیے بغیر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

تشویش کی ایک تیز و تند لہر فیضو کے دل میں اٹھی' لیکن پھر آہستہ آہستہ ٹھہر گئی' کیونکہ آپریشن کے ذریعے ڈیلیوری ہونا ایک معمولی سی بات تھی۔ پھر کافی دیر گزر گئی۔ فیضو کی اضطرابی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اندر سے کوئی خبر نہیں آرہی تھی کافی دیر کے بعد لیبر روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر شہناز کا تھکا ہوا چہرہ فیضو کی نظروں کے سامنے نمودار ہوا۔ ڈاکٹر شہناز ہی کیس کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جو لکھا ہوا تھا۔ وہ فیضو کی تشویش اور مایوسی میں زبردست اضافہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ کوئی بری خبر تھی..... نہ جانے کیا؟

''آپ کی مسز بالکل ٹھیک ہیں۔'' ڈاکٹر شہناز نے محتاط انداز میں الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں ریکوری روم میں شفٹ کر رہے ہیں۔ کچھ دیر وہاں رکھنے کے بعد ہم ان کو ان کے کمرے میں پہنچا دیں گے اور.....''

''ڈاکٹر صاحبہ..... بچہ.....'' فیضو نے تیزی سے ڈاکٹر شہناز کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''بچے کا کیا ہوا؟''

''ہمیں افسوس ہے فیضان علی صاحب۔'' ڈاکٹر شہناز نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''ہم اپنی سرتوڑ کوششوں کے باوجود بچے کو نہیں بچا سکے۔ ہماری پوری ٹیم آخری وقت تک کوشش کرتی رہی لیکن ہم کامیاب نہیں ہو سکے..... ہم صرف ماں کو بچا سکے۔ ہمیں آپریشن میں کامیابی نہیں ہو سکی۔''

''وہ..... وہ لڑکا تھا یا لڑکی؟'' فیضو نے بہت ہلکی آواز میں ڈاکٹر سے پوچھا۔

''لڑکا تھا؟'' ڈاکٹر نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''باڈی ابھی ذرا دیر میں آپ کو مل جائے گی۔''

فیضو کے سر پر جیسے پہاڑ گر پڑا۔ ڈاکٹر آگے بھی کچھ کہہ رہی تھی' لیکن فیضو کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اس کے کانوں میں تو بس یہی الفاظ گونج رہے تھے ''لڑکا تھا..... لڑکا تھا..... لڑکا.....''

فیضو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کاش یہ سب کچھ ہوا ہی نہ ہوتا..... قدرت نے اس کو بیٹا دیا بھی تو مُردہ..... دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔ وہ ایک بے روح جسم لے کر دنیا میں آیا تھا..... صرف دنیا کی مٹی میں دفن ہونے کے لیے۔

یاسمین کو تین چار دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ اس عرصے میں تزئین نے زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ساتھ ہی اسپتال میں گزارا۔ فیضو تو بس دو ایک بار ہی اسپتال گیا تھا۔ اس کی

کاروباری سرگرمیوں نے ایک بار پھر اس کو پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ یاسمین کی جانب اس کے رویے میں جو غیر معمولی گرم جوشی اور التفات پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سب کچھ ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو گیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی کئی ایسی باتیں تھیں جو اس کے دماغ میں کلبلا رہی تھیں۔ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ اس امر کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ ایک بیٹے کا باپ بن سکتا ہے اور دوسری بات یہ تھی کہ یاسمین کے لیے تمام تر امکانات ختم نہیں ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر شہناز نے اسے یہ بات بتا دی تھی کہ بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ابھی ختم نہیں ہوئی ہے لیکن کیا دوبارہ کوئی معجزہ رُونما ہو گا؟

اس معجزے کے انتظار میں اتنا وقت گزر گیا کہ معجزے کے تمام امکانات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ چھ سال کا عرصہ گزر گیا اور فیضو ایک مُردہ خواہش اور بے فیض امید کے سحر سے اس وقت چونکا جب ایک روز یاسمین نے اس کو یہ اطلاع دی کہ تزئین نے اپنے لیے ایک لڑکا پسند کر لیا ہے۔

تزئین کے لیے رشتے تو اب سے نہیں' بلکہ کئی سال سے آ رہے تھے' لیکن تزئین نے اپنے والدین سے سختی کے ساتھ یہ کہہ رکھا تھا کہ وہ فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ تاریخ میں ایم اے کرنے کے بعد اب انگلش لٹریچر میں ایم اے کر رہی تھی اور اس کی تکمیل کے بعد مزید کچھ ریسرچ ورک کرنا چاہتی تھی۔ فیضو اور یاسمین تو یہ چاہتے تھے کہ اب جلد ہی اس کی شادی کر دیں لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

لیکن پھر ایک دن اس نے اپنی خاص سہیلی ناجیہ کے ذریعے اپنی ماں سے کہلوایا کہ توقیر کے والدین اس کے گھر آنا چاہتے ہیں۔

توقیر یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کا ایک نوجوان لیکچرر تھا اور ایک بے حد معمولی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ توقیر کا باپ کسی نیم سرکاری ادارے میں ہیڈ کلرک تھا۔ پرانے زمانے کا میٹرک پاس تھا۔ اس سے آگے پڑھنے کی اور بڑھنے کی حالات نے اجازت نہیں دی تھی۔

توقیر ایک خوش شکل' زندہ دل' ذہین اور باصلاحیت نوجوان تھا اور وہ تزئین کو بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تزئین کو یہ محسوس ہونے لگا کہ توقیر اس کی زندگی کا ایک حصہ بنتا جا رہا ہے۔ وہ توقیر کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب دیکھنے لگی۔

توقیر کو خود بھی تزئین بہت اچھی لگتی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر کے' ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر بہت خوش ہوتے تھے لیکن توقیر ایک عملی انسان تھا اور وہ صرف

اور صرف سہانے خوابوں کے سہارے زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کی اور تزئین کی سماجی حیثیت میں جو زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس نے توقیر کو کبھی بھی ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی لیکن تزئین کے لیے کوئی حد کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اسے توقیر کے خاندانی پس منظر اور اس کی مالی حیثیت کے بارے میں اچھی طرح علم تھا' لیکن وہ اس کے باوجود اس کو اپنانے کی خواہش مند تھی۔ توقیر ایک بہت لائق اور پڑھا لکھا نوجوان تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تزئین اس سے محبت کرتی تھی۔

توقیر کے لیے تزئین کے جذبہ محبت کی پذیرائی کرنا بہت مشکل تھا' باوجود یہ کہ وہ خود کو بھی تزئین کی محبت میں مبتلا پاتا تھا لیکن تزئین نے اس کی محبت کو ایسا حوصلہ عطا کیا کہ توقیر خود بھی حیران رہ گیا۔ محبت کی یہ غیر معمولی قوت اس کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ تزئین نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ تمام تر سماجی فرق کے باوجود اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہے کیونکہ یہ اس کے قلب و روح کی پکار ہے۔

تزئین دو ایک بار توقیر کو اپنے ایک لائق احترام ٹیچر کی حیثیت سے اپنے گھر لا چکی تھی اور اسے اپنی ماں سے ملوا چکی تھے۔ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی اور یاسمین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

لیکن جب تزئین کی خاص سہیلی ناجیہ نے یاسمین سے کہا کہ توقیر کے والدین ان لوگوں کے گھر آنا چاہتے ہیں' تو یاسمین ایک دم چونک پڑی۔ اس بات کا کیا مطلب تھا؟

''مگر کیوں؟'' اس نے چونک کر ناجیہ سے پوچھا۔ ''کیوں آنا چاہتے ہیں وہ لوگ؟''

''آنٹی..... تزئین نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ وہ اور توقیر ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ توقیر کے والدین تزئین کی مرضی سے آپ کے گھر رشتہ لے کر آنا چاہتے ہیں لیکن وہ صرف اس وقت آئیں گے جب آپ لوگ اس رشتے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔''

یاسمین بالکل سٹپٹا گئی۔ اس کے لیے یہ سب کچھ قطعی طور پر غیر متوقع تھا۔ تزئین نے اچانک ہی فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ تزئین کے باپ سے بات کیے بغیر خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔

فیضو نے جب اپنی بیوی کی زبانی یہ بات سنی تو اسے خود بہت حیرت ہوئی۔ یاسمین نے توقیر کے بارے میں یہ بتایا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں لیکچرر ہے۔ فیضو خود بھی توقیر سے نہیں ملا تھا تاہم وہ یونیورسٹی کے لیکچرر کی مالی حیثیت سے بخوبی واقف تھا۔

اس نے خاموشی سے ایک معتبر آدمی کو توقیر اور اس کے خاندان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے کام پر متعین کر دیا۔ چند روز کے اندر اندر توقیر کے بارے میں ساری ضروری باتیں معلوم ہو گئیں۔

اس کے باپ کا ناظم آباد میں ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ توقیر کی ایک چھوٹی بہن تھی جو میٹرک میں پڑھ رہی تھی' ایک چھوٹا بھائی تھا جو نویں میں تھا' والدین تھے' فیضو کے نقطہ نظر سے وہ بے حد معمولی درجے کے لوگ تھے۔ توقیر اور تزئین کا کوئی جوڑ نہیں تھا لیکن جن گھرانوں میں تزئین کا جوڑ تھا اور جہاں سے اس کے لیے برابر رشتے آ رہے تھے' تزئین نے ان سب کو مسترد کر دیا تھا۔

فیضو کو اپنی نوجوانی کا زمانہ یاد آ رہا تھا۔ اس کے اندر بھی اگر کوئی خوبی تھی تو صرف یہی کہ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس کے علاوہ تو اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اور یاسمین کے ساتھ گھنٹوں اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے تزئین کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ یاسمین اس کے فیصلے میں دل و جان سے شریک تھی۔

''شوہر اگر غریب ہو اور بیوی مالدار' تو شوہر ہمیشہ بیوی کے دباؤ میں رہتا ہے اور کبھی اس پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔'' فیضو نے یاسمین سے کہا۔ ''توقیر اور اس کے گھر والے کبھی بھی تزئین کے لیے مسئلہ نہیں بنیں گے۔''

''بات صرف حاوی ہونے یا نہ ہونے کی نہیں ہے۔'' یاسمین نے کہا۔ ''اصل بات ایک دوسرے سے محبت کرنے اور ایک دوسرے کی عزت کرنے کی ہے۔''

ناجیہ سے گفتگو کے بعد یاسمین نے خود بھی تزئین سے براہِ راست گفتگو کر لی تھی اور تزئین نے اپنی ماں کو اپنے دل کی بات بتا دی تھی۔

توقیر کے گھر والے جب پہلی بار تزئین کے گھر آئے تو ان کے پسینے چھوٹ گئے۔ ناظم آباد کے دو سو گز کے ایک چھوٹے سے یک منزلہ پرانے دھرانے مکان کے رہنے والوں کو فیضو کی عظیم الشان محل نما کوٹھی میں آ کر ایسا لگا جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں آ گئے ہیں۔ اور یہ واقعی ایک دوسری دنیا تھی۔ اس کا کوئی تعلق ان کی دنیا سے نہیں تھا۔ یہاں کی ہر چیز جداگانہ نوعیت کی حامل تھی۔ ان کی تو ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ اس گھر کی بیٹی کے لیے اپنے بیٹے کا پیغام دیں لیکن ان کے بیٹے نے ان کو پورا یقین دلایا تھا کہ سب کچھ پہلے سے طے ہو چکا ہے اور انہیں کوئی پریشانی پیش نہیں آئے گی۔

اور ایسا ہی ہوا بھی..... فیضو اور یاسمین نے مہمانوں کا احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا اور ان کی بات کو توجہ اور سکون کے ساتھ سنا۔

اگلے چند ماہ کے بعد تزئین اور توقیر کی شادی ہو گئی۔ تزئین اس شادی سے بہت خوش تھی اور اس کو توقیر کے گھر جا کر رہنے میں کوئی تامل بھی نہیں تھا لیکن فیضو جیسا تجربہ کار اور جہاں دیدہ آدمی اس سفاک حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ جب محبت کے ابتدائی دنوں کا نشہ آہستہ آہستہ اترنا شروع ہوتا ہے اور زندگی کے کڑوے کسیلے مسائل دل و دماغ پر ہتھوڑے برسانا شروع کرتے ہیں تو پھر ہزار طرح کے خدشات اور تنازعات جنم لیتے ہیں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے ان ساری چیزوں کی راہ روک دینا چاہتا تھا۔

اس نے توقیر اور اس کے گھر والوں کی مرضی اور پسند کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نارتھ ناظم آباد میں ایک نیا بنا ہوا بڑا سا مکان پہلے ہی تزئین کے نام سے خرید لیا تھا۔ شادی کے بعد اس نے اپنے داماد کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ اس نئے مکان میں منتقل ہو جائے جو اس کی بیوی کی ملکیت تھا اور اپنے پرانے مکان کو کرائے پر اٹھا دے۔ اسے معلوم تھا کہ توقیر کے لیے فی الحال اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر رہنا مشکل ہو گا۔

توقیر کے والدین اس کے لیے بڑی مشکل سے تیار ہوئے۔ وہ اپنے پرانے یادگار مکان کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے جس کے ساتھ ان کی طویل یادیں وابستہ تھیں' لیکن اس سے اہم بات یہ تھی کہ وہ بہو کے گھر جا کر نہیں رہنا چاہتے تھے لیکن تزئین نے ان کو یقین دلایا کہ وہ اور اس کا شوہر اب الگ الگ نہیں ہیں اور جو کچھ اس کا ہے' وہ اس کے شوہر کا بھی ہے۔

تزئین اپنے سسرال والوں کے ساتھ نارتھ ناظم آباد کے بڑے سے مکان میں منتقل ہو گئی۔ پرانا مکان کرائے پر چڑھا دیا گیا۔

تزئین کے گھر سے چلے جانے کے بعد یاسمین خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی۔ اس کے والدین تو یکے بعد دیگرے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔

فیضو کی اپنی ایک الگ زندگی تھی۔ اس کی سرگرمیوں اور مصروفیات میں یاسمین کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

یاسمین کے ماں بننے کے امکانات کو معدوم ہوئے تو کئی برس بیت چکے تھے اور تزئین کی شادی کے بعد کبھی کبھی فیضو کے دل میں یہ خیال سر اٹھاتا تھا کہ وہ ایک تجربہ کر کے دیکھے لیکن اب شاید بہت دیر ہو چکی تھی..... اور پھر ایک اور تازہ اطلاع نے اس کے قدموں کو مزید روک دیا گیا۔

شادی کے کوئی چھ ماہ کے بعد ہی تزئین کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ یاسمین نے جب یہ خوشخبری سنائی تو فیضو کا احساسِ مسرت ایک دوسرا ہی رنگ لیے ہوئے تھا۔ خاندان میں ایک اور نئے مہمان کی آمد آمد تھی۔ یہ مہمان فیضو کی اولاد تو نہیں تھا لیکن یہ فیضو کے وجود سے ہی تراشا جانے والا ایک معلوم پیکر تھا۔

تزئین زچگی سے کافی پہلے اپنے میکے آ گئی تھی اور اب وہ یہیں رہ رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنی ماں کی مدد اور سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ تو قیر ہر دوسرے تیسرے دن اس کے پاس آتا تھا اور فون پر تو دن میں کئی کئی بار بات ہوتی تھی۔

تزئین کا رجسٹریشن ایک بڑے اسپتال میں کرا دیا گیا تھا اور اسے بہترین طبی سہولتیں حاصل تھیں۔ یاسمین ہر معاملے میں انتہائی محتاط تھی۔ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے اس اندوہناک واقعے کو زندگی بھر نہیں بھول سکتی تھی جس نے اسے اس کے واحد بیٹے سے محروم کر دیا تھا اور وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی چل بسا تھا۔ ''کچھ عمر اور صحت کی بھی تو بات ہوتی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں خود کو سمجھاتے ہوئے کہتی۔ ''میں تو اس وقت بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکی تھی جبکہ تزئین ماشاء اللہ جوان ہے..... صحت مند ہے..... خدا نے چاہا تو اس کو کچھ نہیں ہوگا۔''

اور ایسا ہی ہوا۔

زچگی کے وقت یاسمین اپنی بیٹی کے ساتھ اسپتال میں موجود تھی اور جب ایک نرس نے خوشی سے سرشار لہجے میں اس کو یہ اطلاع دی کہ تزئین نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے اور ماں اور بچہ دونوں بالکل خیریت سے ہیں' تو یاسمین کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چھلک اٹھیں۔ ان چند لمحوں کے دوران جبکہ وہ نرس کی زبانی نواسے کی پیدائش کی خبر سن رہی تھی' اس کی نظروں کے سامنے اپنی شادی کے بعد کے مناظر کسی تیز فلم کی طرح سرسراتے ہوئے گزر گئے۔ کتنی شدید آرزو تھی کہ اسے اور اس کے شوہر کو ایک بیٹے کی اور انہوں نے اس کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے لیکن قدرت ان پر نامہربان رہی۔

فیضو کو فون پر نواسے کی ولادت کی اطلاع ملی تو اس وقت دفتر میں ایک ضروری میٹنگ میں مصروف تھا یہ خبر سنتے ہی اس پر ایک دم شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

یہ کسی عام آدمی کے ہاں نواسے کی پیدائش کے عام سے واقعے سے بالکل ہی مختلف واقعہ تھا۔ فیضو کے لیے اس بچے کی جو اہمیت تھی اس کو پورے طور پر صرف فیضو ہی سمجھ سکتا تھا۔ اولادِ نرینہ کی جستجو میں اس نے ایک عمر گزار دی تھی۔ وارث کی خواہش کی تکمیل کے لیے

اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا لیکن سب کچھ کرنے کے باوجود گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آیا تھا اور اب اچانک وہ سب کچھ مل گیا تھا جس کی آرزو نے اسے ساری زندگی مضطرب رکھا تھا۔ جو کام وہ خود اور اس کی بیوی نہیں کر سکے تھے' وہ اس کی اولاد نے' اس کی بیٹی نے انجام دے دیا تھا..... بیٹا..... بیٹا دنیا میں آ گیا تھا۔ فیضو کو اپنا وارث مل گیا تھا۔

فیضو فوراً ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سیدھا اسپتال بھاگا۔ وہ منیر کو ہدایت کر کے چلا تھا کہ بھاری مقدار میں مٹھائی اسپتال پہنچوانے کا بندوبست کرے۔

فیضو نے اسپتال پہنچ کر اپنے نواسے کا منہ دیکھا اور اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ نکلے یہ غم اور خوشی ایک ملی جلی کیفیت تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ ایک گمشدہ مطلوبہ خوشی بالآخر اس کے گھر تک پہنچی تھی۔ جس نے اس کے گھر کو اور اس کے سارے وجود کو ایک جگمگاتی ہوئی ٹھنڈی روشنی سے منور کر دیا تھا اور غم اس بات کا یہ خوشی اس کے گھر کے دروازے تک براہِ راست راستے سے آنے کی بجائے طرح طرح کے پیچاکوں سے گزرتی ہوئی پہنچی تھی اتنی طویل مدت کے بعد اس نے تو امید ہی چھوڑ دی تھی۔

تزئین کے گھر بیٹے کی ولادت کے بعد فیضو کو اس بات پر سخت تعجب ہوا کہ اس نے اب تک اس امکان پر غور ہی نہیں کیا تھا..... ٹھیک ہے' اس کے کوئی بیٹا نہیں تھا اور چونکہ اس کے کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے وہ دادا بھی نہیں بن سکتا تھا لیکن اس کے ایک بیٹی تو تھی..... اور وہ بیٹی ایک بیٹا پیدا کر سکتی تھی۔ تزئین کا بیٹا اور فیضو کا نواسا' فیضو کے لیے اس کے اپنے بیٹے کا نعم البدل ہو سکتا تھا۔ وہ اس کا ''ولی عہد'' ہو سکتا تھا۔ اس کی اس شاندار سلطنت کا مالک ہو سکتا تھا..... آخر وہ تو تھا اسی کا خون..... باپ کی طرف سے نہ سہی' ماں کی طرف سے سہی۔

اسپتال کے گائنی وارڈ کے عملے کے لیے جیسے مٹھائی کی دکان کھل گئی۔ منیر اتنی مٹھائیاں لے کر آیا تھا کہ اس کے لیے کھانے والے نہیں مل رہے تھے۔

''جو کام میں اور تم نہیں کر سکے' وہ ہماری بیٹی اور داماد نے کر دکھایا۔'' فیضو نے تنہائی میں بھرائی ہوئی آواز میں یاسمین سے کہا۔ وہ دونوں اس وقت اسپتال میں ایک کمرے میں موجود تھے۔ تزئین کے لیے دو کمرے بک کیے گئے تھے۔

یاسمین فرطِ جذبات سے رونے لگی۔ اس کے لیے بھی یہ زبردست خوشی کا موقع تھا اور اس کے ساتھ ہی اس میں اس کی اپنی ذاتی ناکامی' محرومی اور بدنصیبی کا وہ دکھ بھی گھلا ہوا تھا جسے جھیلتے جھیلتے اس کی عمر بیت گئی تھی۔ ایک بار امید کی کرن روشن ہوئی تھی' لیکن پھر اسے بھی طاقتور اندھیروں نے نگل لیا تھا۔ تزئین اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ قسمت کی دھنی نکلی

تھی۔اس نے تو پہلے ہی ہلے میں معرکہ سر کر لیا تھا۔

لڑکے کی پیدائش کے ساتھ ہی فیضو کو اپنا داماد بھی بہت اچھا لگنے لگا تھا۔وہ تو قیر کو ناپسند تو پہلے بھی نہیں کرتا تھا لیکن اب اس کے دل میں تو قیر کے لیے ایک ایسا عجیب وغریب جذبہ جاگ اٹھا جو اس نے کبھی بھی دوسرے غیر شخص کے لیے محسوس نہیں کیا تھا۔تو قیر ایک بیٹے کا باپ بن گیا تھا۔تو قیر نے اسے ایک نواسا دیا تھا' جسے وہ اپنے بیٹے کا درجہ دے سکتا تھا۔

خود تو قیر کے گھر والوں کو بھی بیٹے کی ولادت پر بہت خوشی تھی' لیکن ان کی اس خوشی کا فیضو اور یاسمین اور خاص طور پر فیضو کی خوشی سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔تو قیر کے تو اور بھی بھائی بہن تھے۔ان کی ابھی شادیاں ہونی تھیں.....

وہاں تو بہت وسیع امکانات موجود تھے.....لیکن فیضو اور یاسمین کے لیے امکانات کی دنیا صرف ان کی اکلوتی بیٹی تک محدود تھی۔یاسمین کا دل کبھی کبھی یہ سوچ کر کانپ اٹھتا تھا کہ کہیں اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا نہ ہو جیسا کہ اس کے ساتھ ہوا تھا۔ایک بیٹی کی پیدائش کے بعد ایک طویل غیر معمولی اور بوجھل سناٹا ٹوٹا بھی تو اس کا اختتام ایک ننھی سی چیخ پر ہوا جس نے حلق سے نکلنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا تھا.....اور پھر اس کے بعد سناٹا.....اور سناٹا.....اور سناٹا!

نواسے کی پیدائش کی ساتھ ہی فیضو کے اندر یکبارگی ایک ایسی قوتِ محرکہ پیدا ہوگئی تھی جس نے اس کے سارے وجود کو کاروباری میدان میں مزید سرگرم اور پُرجوش بنا دیا تھا۔اس کے پاس پہلے ہی بے اندازہ دولت جمع تھی اور وہ اس میں مزید اضافے کے لیے کوشاں رہتا تھا' لیکن اب اس کوشش کی شرح میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔اس کے نواسے کو ایک بہت بڑی اور ترقی یافتہ سلطنت ملنی چاہئے تھی۔اور پھر.....ابھی تو ابتدا تھی.....ایک سے زائد نواسے بھی تو وجود میں آسکتے تھے۔

نومولود کا نام اظفر رکھا گیا۔یہ نام فیضو نے تجویز کیا تھا اور کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔تو قیر اور اس کے والدین تو شروع ہی سے فیضو کے اثر میں تھے۔کوئی بھی فیضو کی بات کو رد نہیں کرتا تھا۔فیضو کا خود اپنا رویہ بھی ان سب لوگوں کی جانب احترام پر مبنی تھا۔

بہت عرصہ ہوا' برسوں پہلے جب فیضو کی شادی ہوئی تھی اور یاسمین ماں بننے والی تھی تو فیضو نے بیٹے کے لیے ایک نام سوچا تھا.....اظفر.....اسے یہ نام بہت پسند تھا۔اس نے اسے اپنے متوقع طور پر پیدا ہونے والے بیٹے کے لیے پہلے ہی سے چن لیا تھا لیکن قسمت نے اس کو اس نام کے استعمال کا موقع ہی نہیں دیا.....نہ اس وقت اور نہ اس کے بعد پھر

کبھی.....یہاں تک کہ وہ سارے راستے ہی معدوم ہوگئے جن سے گزر کر اظفر اس کے گھر میں قدم رکھ سکتا تھا۔سب کچھ خاک میں مل گیا تھا۔

اور اب اچانک وہ آگیا تھا.....کچھ نئے اور پیچیدہ راستوں سے گزرتا ہوا' وہ فیضو کی زندگی میں داخل ہوگیا تھا اور فیضو نے فوراً ہی اس کو وہ تشخص عطا کر دیا تھا جسے وہ برسوں سے اپنے دل کے ایک بھولے بھٹکے کونے میں چھپائے بیٹھا تھا۔اس کا اپنا بیٹا نہ سہی.....اس کا نواسا اظفر ہوسکتا تھا۔

فیضو نے اظفر پر نوازشات کی اس قدر بارش کی کہ تو قیر اور اس کے گھر والے حیران رہ گئے۔ان کے گھرانے میں تو کسی بھی بچے کی پرورش پر اس قدر پیسہ خرچ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔فیضو نے اظفر کی دیکھ بھال کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ مقرر کی تھی جس کے سارے اخراجات تو قیر کے گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود وہ خود ہی ادا کرتا تھا۔اس نے تزئین کو ایک نئی گاڑی لے کر دی تھی کہ جس کے ساتھ ڈرائیور بھی تھا اور اس کے سارے اخراجات بھی فیضو نے اپنے ہی ذمے رکھے تھے۔

اظفر کی عمر ابھی پورے تین سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کو شہر کے ایک بے حد مہنگے اسکول کی نرسری کلاس میں داخل کرا دیا گیا۔اس اسکول میں داخلہ ملنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن فیضو کے لیے تو کوئی مشکل کام نہیں تھا۔وہ تو پانی کی طرح پیسہ بہا سکتا تھا۔

''اس کو بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا چاہئے۔'' وہ اکثر یاسمین سے کہتا تھا۔''مجھے تو اپنے بچپن میں سکون کے ساتھ پڑھنے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا' میں نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ پڑھا۔اظفر کے لیے تو حالات بہت مختلف ہیں۔اسے تو بہت ہی زیادہ سازگار تعلیمی ماحول میسر آئے گا۔''

اظفر واقعی کسی شہزادے کی طرح پرورش پا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ فیضو کی طلب اور ہوس کی وسعتیں بھی نئے نئے رنگ اختیار کرتی جارہی تھیں۔اسے اب مزید دولت چاہئے تھی۔وہ اب وارث کے بغیر نہیں تھا۔اس کا وارث موجود تھا اور اس لیے مزید دولت جمع کرنے کا جواز بھی موجود تھا لیکن جب یہ جواز موجود نہیں تھا تو بھی فیضو کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی تھی۔غیر معیاری' جعلی اور مہنگی دوائیاں بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے متعدد کالے دھندے اسی زور وشور کے ساتھ جاری تھے اور ان سے حاصل ہونے والی دولت' جس میں فیضو کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے حصہ دار موجود تھے' برابر بڑھتی جارہی تھی۔

☆======☆======☆

اس نئے منصوبے کا خیال فیضو کے دل میں ان پانچ ڈاکٹروں کے ساتھ اپنی ایک خصوصی ملاقات کے دوران آیا۔

یہ پانچوں ڈاکٹر اپنی فیلڈ کے مانے ہوئے اور نامی گرامی اسپیشلسٹ تھے۔ان میں سے ہر ایک کا اپنا ذاتی کلینک تھا جو ان کے لیے ٹکسال کا کام کرتا تھا۔کلینک میں گزرنے والا ہر لمحہ ان کے لیے نوٹوں کی شکل میں ڈھلتا جاتا تھا اور جب یہ وہاں سے اٹھتے تھے تو نوٹوں کی بھاری گڈیاں ان کے ساتھ ہوتیں تھیں۔

ذاتی کلینکوں کے علاوہ یہ لوگ کئی بڑے بڑے اسپتالوں میں بھی کچھ دیر کے لیے بیٹھتے تھے اور وہاں بھی لمحوں کو نوٹوں میں تبدیل کرتے رہتے تھے۔یہ لوگ کئی بڑے اسپتالوں کی گورننگ باڈیز وغیرہ میں بھی شامل تھے۔

فیضو نے حال ہی میں کچھ نئی دوائیں رجسٹر کروائی تھیں۔جس کے نتیجے میں وزارتِ صحت کے بہت سے افسروں کی جیبیں کچھ مزید بھاری ہوگئی تھیں اور اب ان بڑے بڑے ماہرین کی باری تھی جن کے ذریعے ان دواؤں کو اسپتالوں میں رُوشناس کروانا اور مریضوں کی بڑی تعداد تک پہنچانا مقصود تھا۔

ان پانچوں ڈاکٹروں اور ان کی بیگمات کے لیے فیضو نے ہانگ کانگ کے ایک سات دن کے تفریحی دورے کا بندوبست کیا تھا۔اس کے لیے ایک خصوصی پیکج تیار کیا گیا تھا' جس میں ان ڈاکٹروں کا مع اپنی بیگمات کے ہانگ کانگ تک کا اور وہاں سے واپسی کا ہوائی سفر' ہانگ کانگ میں ایک ہفتہ قیام وطعام اور تفریح اور شاپنگ وغیرہ شامل تھے۔ان سب کے اخراجات فیضو ادا کر رہا تھا۔ہانگ کانگ میں خرچ کرنے کے لیے ڈاکٹروں کو علیحدہ بھی کچھ رقم فراہم کی جارہی تھی۔

فیضو کی جانب سے ڈاکٹروں کو تفریحی دورے پر ملک سے باہر بھیجنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔یہ تو ایک کاروباری معمول تھا جو آئے دن دہرایا جاتا رہتا تھا۔ان پانچوں ڈاکٹروں میں سے چار ایسے تھے جنہیں فیضو اس سے پہلے بھی اندرون ملک نیز بیرون ملک کے تفریحی دوروں پر بھیج چکا تھا۔ڈاکٹروں پر خرچ کی جانے والی یہ رقم ایک نہایت منافع بخش انویسٹمنٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ان ڈاکٹروں پر اتنا پیسہ خرچ کیا جاتا تھا تاکہ وہ فیضو کی کمپنی کی تیار کردہ ناقص' غیر معیاری اور بے حد مہنگی دواؤں کی زیادہ سے زیادہ فروخت میں مدد دے سکیں۔فیضو سے فیض اٹھانے والے یہ ڈاکٹر اپنے مریضوں کو نسخے میں یہی دوائیں لکھتے تھے۔حالانکہ

بازار میں ان کے سستے نعم البدل بآسانی دستیاب تھے لیکن مریض بے چارہ تو اسپشلسٹ کی لکھی ہوئی دوا خریدنے پر مجبور ہوجاتا تھا' کیونکہ اسپشلسٹ کی ہدایت ہوتی تھی کہ یہی دوا استعمال کی جائے۔

خود اپنے نسخوں میں فیضو کی کمپنی کی تیار کردہ دواؤں کو لکھنے کے علاوہ یہ ڈاکٹر ان اسپتالوں میں بھی' جن سے ان کا کسی نہ کسی طور پر تعلق تھا' ان دواؤں کو پھیلانے میں مدد دیتے تھے۔یہ سرکاری اور نیم سرکاری اسپتالوں کو بھی یہی دوا خریدنے کی سفارش کرتے تھے۔اس طرح معمولی درجے کی غیر معیاری اور بے حد مہنگی دوائیں کتنے ہی بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کی مدد سے بڑے پیمانے پر فروخت ہوکر فیضو کے کالے دھن کی کالک اور اس کے حجم میں برابر اضافہ کرتی رہتی تھیں۔ان دواؤں کی فروخت کے معاملے میں ڈاکٹروں کو ایک بہت مضبوط اور قابلِ اعتماد آلہ کار کی حیثیت حاصل تھی۔

ابھی پچھلے ہی مہینے فیضو نے کئی بڑے ڈاکٹروں کو ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ عمرے پر بھیجا تھا۔سارے لوگوں کے عمرے کے تمام اخراجات فیضو نے برداشت کیے تھے۔نیز ان لوگوں کو سعودی عرب میں شاپنگ وغیرہ کرنے کی غرض سے وہاں اضافی رقم کی فراہمی کا بندوبست کروادیا گیا تھا۔ان ڈاکٹروں نے اپنے لواحقین کے ساتھ عمرہ کرنے کے علاوہ وہاں شاپنگ بھی کی اور پھر پاکستان واپس آکر یہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔فیضو نے ٹی بی کے علاج کے لیے اپنی ایک نئی دوا کا رجسٹریشن کروایا تھا اور وہ اسے بڑے پیمانے پر روشناس کروانا چاہتا تھا۔ملک میں ٹی بی کے مریضوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہورہا تھا اور ٹی بی کے مریض کو کم از کم اٹھارہ ماہ تک مسلسل علاج کی ضرورت ہوتی تھی۔بعض صورتوں میں اس کی مدت میں اضافہ بھی ہوسکتا تھا۔بازار میں ٹی بی کی دوائیں پہلے سے موجود تھیں۔فیضو کے مقابلے کا میدان سخت تھا لیکن فیضو مقابلہ کرنے اور کامیاب ہونے کا گُر جانتا تھا۔ڈاکٹروں' اسپتالوں' میڈیکل اسٹوروں اور سیلز مینوں پر مشتمل اس کا ایک پورا مضبوط نیٹ ورک تھا جو ملک بھر میں کام کررہا تھا اور یہ صرف فیضو کا ہی نیٹ ورک نہیں تھا جو تنہا اس کام کو انجام دے رہا تھا۔ملک میں اور بھی کئی ایسے ہی نیٹ ورک موجود تھے جن میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے قائم کردہ نیٹ ورک بھی شامل تھے۔جس دوا کو بآسانی دس روپے میں مع منافع کے بیچا جاسکتا تھا' اسے کئی کئی سو روپے میں بیچا جاتا تھا۔جن کے پاس پہلے ہی ڈھیروں دولت تھی' وہ اس کاروبار سے خوب کما رہے تھے اور جو پہلے ہی غریب تھے' ان کی غربت میں مزید اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

پانچ بڑے ڈاکٹروں کے ساتھ فیضو کی یہ میٹنگ کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد ہو رہی تھی۔ ان پانچ میں سے تین کا تعلق کراچی سے تھا اور ایک ڈاکٹر اسلام آباد اور ایک ڈاکٹر ملتان سے آیا تھا۔ ان دونوں کو فائیو اسٹار کے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا اور وہیں یہ میٹنگ ہو رہی تھی۔

''آج ہمارے اسپتال میں کتا کاٹے کے کچھ کیس آئے۔'' ڈاکٹر ارشاد علی خان نے کہا' جو ایک سرکاری اسپتال سے وابستہ تھا۔ ''لیکن سب کو واپس کرنا پڑا' کیونکہ اسپتال میں اینٹی ریبیز ویکسین ہی موجود نہیں تھی' ختم ہو گئی تھی۔''

''مجھے کوئی بتا رہا تھا کہ دوسرے اسپتال میں بھی اینٹی ریبیز ویکسین کی کمی ہے۔'' ایک اور ڈاکٹر نے کہا' جس کا نام محمود حسن تھا۔ ''ویکسین تو غائب ہے اور کتا کاٹے کے واقعات میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔''

''لیکن اب تو پرائیویٹ کمپنیاں بھی ویکسین بنا رہی ہیں۔'' ڈاکٹر راشد کلیم نے کہا۔ ''بازار میں عام دستیاب ہیں۔''

''ہے تو' لیکن بہت مہنگی ہے۔'' ڈاکٹر ارشاد ولی خان نے کہا۔ ''ایک پورے کورس کی قیمت کئی ہزار روپے ہوتی ہے۔''

''اور جو لوگ کتا کاٹے کا شکار ہوتے ہیں' ان کی بھاری اکثریت کا تعلق غریب طبقے سے ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر راشد کلیم نے کہا۔ ''پس ماندہ اور غریب بستیوں میں پیدل چلنے والے لوگ اور وہ بھی زیادہ تر بچے کتا کاٹے کا شکار ہوتے ہیں اور یہ لوگ پھر سیدھے سرکاری اسپتالوں کی ہی طرف بھاگتے ہیں' جہاں ان کو مفت ویکسین مل جاتی ہے۔''

''سب کے سب تو اسپتال جاتے بھی نہیں۔'' ڈاکٹر محمود حسن نے کہا۔ ''اتنا شعور ہی نہیں ہے ان لوگوں میں۔ بس خود ہی فرض کر لیتے ہیں کتا پاگل نہیں تھا اور پھر جب ریبیز کا وائرس اپنا اثر دکھانا شروع کرتا ہے تو روتے پھرتے ہیں' مگر پھر تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر تو یقینی موت ہی اس کا واحد انجام ہوتی ہے۔''

فیضو سگ گزیدگی کے بارے میں ان ڈاکٹروں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک نیا منصوبہ کسی گندی نالی میں پلنے والے غلیظ کیڑے کی طرح کلبلا رہا تھا۔

ڈاکٹروں کو آج رات کی فلائٹ سے روانہ ہو جانا تھا۔ ان کی روانگی کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اخراجات کے لیے رقم وغیرہ بھی ان کو فراہم کر دی گئی تھی' فیضو رات گئے

ان سے رخصت ہوا۔

فیضو کے علم میں یہ بات تھی کہ اینٹی ریبیز ویکسین کا پیٹ میں لگائے جانے والے چودہ انجکشنوں کا پرانا سسٹم عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے اور اب اس کی بجائے صرف چند انجکشن لگائے جاتے ہیں جو مقررہ وقفے سے بازو میں لگائے جاتے ہیں اور پرائیویٹ کمپنیوں کے تیار کردہ یہ امپورٹیڈ انجکشن بازار میں دستیاب ہیں' لیکن ان کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ عام غریب آدمی ان کو بمشکل ہی خرید سکتا ہے۔

فیضو نے اپنے کارندے کے ذریعے مارکیٹ سے یہ مزید معلومات حاصل کیں کہ امپورٹیڈ اینٹی ریبیز ویکسین کی فروخت کی کیا صورتِ حال ہے اور چند روز میں فیضو کو پوری تفصیلی رپورٹ مل گئی۔

امپورٹیڈ ویکسین کی فروخت خاص طور سے بڑے شہروں میں اور سب سے زیادہ کراچی میں تھی۔ بہت سے معمولی آمدنی والے لوگ بھی کتا کاٹے کی صورت میں سرکاری اسپتال کا رخ اختیار کرنے کی بجائے پرائیویٹ طور پر ویکسین خرید کر اس کا استعمال کرتے تھے۔ کتا کاٹے کے سب سے زیادہ واقعات بچوں کے ساتھ ہوتے تھے اور وہ والدین جو تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتے تھے کہیں نہ کہیں سے قرض ادھار لے کر اپنے بچوں کو پرائیویٹ ویکسین لگوا دیتے تھے کیونکہ سرکاری اسپتالوں پر ان کا اعتماد نہیں تھا۔ انجکشن لگوانے کا مشورہ ان لوگوں کو بھی دیا جاتا تھا جنہیں کسی بلی کاٹ لیا ہوتا تھا۔ مارکیٹ میں اس انجکشن کی فروخت کا ریکارڈ کافی اچھا لگتا تھا۔

فیضو نے اینٹی ریبیز ویکسین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کام میں بہت منافع تھا لیکن وہ اپنی کمپنی کے نام سے یہ ویکسین نہیں تیار کرنا چاہتا تھا۔ وہ جعلی دوا بنانا چاہتا تھا۔

اس نے امپورٹیڈ ویکسین کو سامنے رکھا اور پھر ضروری تیاریوں کے بعد اس کی نقل بنالی۔ لیبل' پیکنگ' چھپائی سب چیزیں ہو بہو اصلی معلوم ہوتی تھیں' مگر جو چیز اصلی نہیں تھی وہ تھی یہ دوا۔ یہ گھٹیا درجے کی غیر معیاری دوا تھی اور ریبیز کے وائرس کی روک تھام کے لیے مطلوبہ استعداد سے عاری تھی۔ فیضو نے امپورٹیڈ ویکسین کے مقابلے میں اس کی ہول سیل قیمت کچھ کم رکھی تاکہ میڈیکل اسٹور والے اس کو زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کی کوشش کریں اور اپنے نیٹ ورک کے ذریعے اسے بڑے پیمانے پر میڈیکل اسٹوروں میں پھیلا دیا۔ خریدنے والے کو اصلی اور نقلی کے فرق کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سب کچھ بالکل ایک جیسا تھا۔

دوا کی فروخت کی رپورٹ فیضو کے لیے بڑی حوصلہ افزا تھی۔اس کی تیار کردہ جعلی ویکسین بڑی مقدار میں فروخت ہو رہی تھی۔اس کے خاص خاص سیلز مین بڑے بڑے آرڈرز لا رہے تھے۔بھاری کمیشن پا رہے تھے اور جعلی ویکسین مارکیٹ میں پھیلا رہے تھے۔میڈیکل اسٹوروں کے ساتھ میڈیکل سیلز مینوں کی بھی خوب کمائی ہو رہی تھی۔

سب سے زیادہ کمائی تو فیضو کی ہو رہی تھی۔اس کے پاس دولت کے ڈھیر کی بلندی اور وزن میں اضافے کی نئی نئی راہیں کھلتی جا رہی تھیں۔دیکھتے ہی دیکھتے فیضو کی تیار کردہ اس جعلی ویکسین نے مارکیٹ میں اپنی جگہ بنالی۔

اس روز فیضو کی نظر سے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر گزری۔اس میں بتایا گیا تھا کہ کراچی کے علاقے پیر کالونی سے تعلق رکھنے والا ایک نو سالہ بچہ جسے ایک پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا' بروقت انجکشن لگنے کے باوجود ہائیڈروفوبیا کا شکار ہو کر اسپتا جا کر مر گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اسے جو اینٹی ریبیز ویکسین دی گئی تھی' وہ ایکسپائرڈ تھی یا پھر جعلی تھی جبکہ والدین کا کہنا تھا کہ انہوں نے جو ویکسین بازار سے خریدی تھی وہ امپورٹیڈ تھی اور اوپر لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق ایکسپائرڈ نہیں تھی۔

فیضو نے اس خبر کو سرسری انداز میں پڑھا اور اس کے دل کے اندر کوئی ہیجان برپا نہیں ہوا۔غیر معیاری اور نقلی دواؤں کے استعمال سے تو نہ جانے کتنے عرصے سے کتنے لوگ مرتے چلے جا رہے تھے۔اگر ایک بچہ اور مر گیا تو کیا فرق پڑے گا؟ فیضو کی نظریں اخبار کی دوسری خبروں پر پھسلنے لگیں۔

اظفر کی پیدائش کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔وہ انگریزی میڈیم والے ایک اسکول میں پڑھ رہا تھا' جس کا شمار شہر کے اعلیٰ ترین اسکولوں میں ہوتا تھا۔دنیا کی کون سی ایسی نعمت تھی جو اس بچے کو میسر نہ ہو۔اس کا نانا تو اس پر ہر وقت خزانے لٹانے کے لیے تیار رہتا تھا۔

اظفر کی پیدائش کے بعد تزئین کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور یہ بات تزئین اور اس کے شوہر سے زیادہ یاسمین کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی اسے بار بار اپنا وقت یاد آ رہا تھا۔تزئین کی پیدائش کے بعد سے اسے سناٹے کا کتنا طویل عرصہ گزارنا پڑا تھا اور اس کے بعد بھی اس کی قسمت میں صرف سناٹا ہی لکھا تھا۔

وہ خود تزئین کو لے کر کئی اعلیٰ پائے کی ڈاکٹروں کے پاس گئی تھی اور ان سب کی مشترکہ رائے یہ تھی کہ تزئین بالکل ٹھیک ہے۔تزئین سے زیادہ یاسمین کی یہ خواہش تھی کہ تزئین جلد از جلد دوبارہ ماں بن جائے۔وقت تو بڑی ظالم اور بے قابو چیز ہے اور اسے گرفت میں نہیں رکھا

جا سکتا تھا۔

اس روز تو قیر اور تزئین نارتھ ناظم آباد سے ڈیفنس جانے کے لیے روانہ ہوئے تو اظفر ان کے ساتھ گاڑی میں موجود نہیں تھا۔وہ گزشتہ تین دن سے اپنے نانا کے گھر گیا ہوا تھا۔وہ اکثر ان کے پاس آ کر رہ جاتا تھا' جب اسکول کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ان دنوں بھی اسکول کی چھٹیاں تھیں اور اظفر اپنے نانا کے پاس رہ رہا تھا۔

دو دن پیشتر شہر میں ایک سیاسی تنظیم کی کال پر ہڑتال کی گئی تھی۔اس ہڑتال کے دوران تشدد کے واقعات میں کئی افراد ہلاک ہوئے تھے' جس کے بعد بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں۔شہر کے لوگ ایک عرصے سے بدامنی' لاقانونیت اور تشدد کی اس فضا کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ اب انہوں نے ان باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا اور اس صورتِ حال کو زندگی کا ایک لازمہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

تو قیر اور تزئین اظفر کو واپس لانے کے لیے ڈیفنس سوسائٹی جا رہے تھے' گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔دو دن کے خونی ہنگاموں کے بعد آج شہر میں قدرے امن تھا۔

لیکن حیدری کے علاقے سے ذرا آگے بڑھتے ہی امن کا خاتمہ ہو گیا۔

ہڑتال کرنے والی سیاسی تنظیم کے گرفتار کارکنوں میں سے دو پولیس کی حراست میں ہلاک ہو گئے تھے اور اس واقعے کے ردِعمل کے طور پر ایک بار پھر ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔حیدری کے علاقے میں سڑکوں پر ٹائر جلائے جا رہے تھے' گاڑیوں پر پتھراؤ کیا جا رہا تھا اور گاڑیاں جلائی جا رہی تھیں۔سامنے ہی سڑک پر ایک بس اور ایک کار جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

ڈرائیور نے گاڑی فوراً روکی۔آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔سڑک کے دونوں جانب مشتعل لوگوں کے ہجوم موجود تھے جو جلاؤ اور گھیراؤ کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔

ڈرائیور کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ گاڑی کو واپس موڑ لے۔اس نے تیزی سے گاڑی کو گھمایا اور واپس موڑ لیا۔اب گاڑی غلط ٹریک پر آ گئی تھی لیکن اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

کسی جانب سے ایک بھاری سا پتھر آ کر گاڑی کی ونڈ اسکرین سے زوردار دھماکے سے ٹکرایا اور گاڑی کا ونڈ اسکرین چور چور ہو کر' ننھے ننھے ٹکڑوں کی شکل میں بکھر گیا۔بدحواس ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی بھگائی۔اسی وقت مخالف سمت سے پولیس کی ایک وین اس طرف آتی ہوئی دکھائی دی اور جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچی تو یکبارگی کوئی گولہ سا آ کر تو قیر

اور تزئین کی گاڑی سے ٹکرایا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی گاڑی میں آگ لگ گئی۔ ڈرائیور کود کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن توقیر اور تزئین' جو دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے گاڑی سے باہر نہ نکل سکے۔ انہیں باہر نکلنے کی مہلت ہی نہ ملی کیونکہ گاڑی فوراً ایک آتشیں گولے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ پولیس کی گاڑی پر پھینکا جانے والا بم توقیر اور تزئین کی گاڑی پر آ گرا تھا۔

کافی دیر کے بعد گاڑی کے دروازوں کو کاٹ کر توقیر اور تزئین کی جلی جھلسی ہوئی لاشوں کو باہر نکالا جا سکا۔ ڈرائیور زندہ بچ گیا تھا۔

مرنے والوں کے لواحقین کے دکھ کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ آن کی آن میں دو ہنستے کھیلتے گھرانوں کے چراغ گل ہو گئے تھے اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔

اگرچہ توقیر کے والدین کے لیے بھی یہ صدمہ نہایت شدید تھا لیکن ان کے آنسو پونچھنے والے کچھ لوگ موجود تھے۔ کچھ لوگ تھے جو ان کا سہارا بن سکتے تھے اور ان کا دکھ سکھ بانٹ سکتے تھے۔ یہ توقیر کے چھوٹے بہن بھائی تھے لیکن فیضو اور یاسمین کے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا تھا سوائے اس ایک بچے کے' جسے مرنے والے اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔

یاسمین کا دل خون ہو ہو کر آنکھوں کے راستے بہا جا رہا تھا۔ لے دے کے بس ایک ہی اولاد تھی' ایک بیٹی..... اور اب ظالموں نے اس کو بھی چھین لیا تھا۔

''میں نے فون پر تزئین کو منع کیا تھا۔'' یاسمین دھاروں دھار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''میں نے کہا تھا کہ ادھر کے علاقے میں حالات ٹھیک نہیں ہیں اور ہم کل خود اظفر کو لے کر آ جائیں گے لیکن اس کا اصرار تھا کہ حالات ٹھیک ہو گئے ہیں اور کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

شہر کے وحشی معاشرے میں آئے دن سڑکوں پر بے موت مارے جانے والے بدنصیب انسانوں کی تعداد میں دو مزید انسانوں کا اضافہ ہو چکا تھا' لیکن اس سے کسی کے لیے کیا فرق پڑتا تھا؟ سب لوگوں کے لیے یہ محض ایک خبر تھی' ہلاکت کی دیگر بے شمار خبروں کی طرح کی ایک خبر..... اس سے زیادہ کچھ نہیں..... لیکن جن لوگوں کی دنیا لٹ گئی تھی' ان کے دکھ کا اندازہ بھلا کون کر سکتا تھا؟

توقیر اور تزئین کو برابر برابر قبروں میں دفن کر دیا گیا۔ پانچ سالہ اظفر اس اندوہناک سانحے کی اہمیت کو کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ امی اور ابو اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے' انہیں اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

والدین کی حادثاتی موت کے بعد کچھ عرصے تک تو اظفر اپنے دادا دادی کے ساتھ ہی

رہا' بعد میں فیضو اور یاسمین نے ان لوگوں سے درخواست کی کہ اظفر کو ان کے پاس رہنے دیا جائے اور وہ خود اس کی پرورش کرنا چاہتے ہیں۔ توقیر کے والدین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اظفر کے نانا نانی اس کو واقعی شہزادوں کی طرح رکھیں گے۔ انہوں نے اظفر کو اس کے نانا کے حوالے کر دیا۔

فیضو کے لیے اظفر پہلے بھی دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی شے تھا' کیونکہ وہ اس کا وارث تھا' اس کی عظیم الشان سلطنت کا ہونے والا حکمران تھا لیکن تب تک یہ امکان بھی موجود تھا کہ تزئین کسی اور بیٹے کو بھی جنم دے دے اور فیضو کے وارثوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے..... لیکن اب یہ امکان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔ اب تو جو کچھ تھا' وہ صرف اظفر تھا اور جو کچھ تھا وہ صرف اظفر کے لیے تھا۔ چنانچہ اظفر اب فیضو کے لیے ایک ایسی چیز تھا جس کا دنیا میں کوئی بھی نعم البدل نہ تو تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ سارے دروازے بند ہو چکے تھے۔

فیضو اور یاسمین اظفر کو اپنے گھر لے آئے۔ یہ گھر اظفر کے لیے نیا تھا اور نہ یہاں کے لوگ ہر چیز بہت اچھی طرح جانی پہچانی اور مانوس تھی۔ اس گھر کی فضاؤں میں اسے ہمیشہ اپنی امی کی خوشبو رچی بسی محسوس ہوتی تھی۔ اس گھر میں تزئین کا جو کمرہ تھا وہ اس کی شادی کے بعد بھی جوں کا توں ہی رہا تھا اور وہ یہاں آ کر اظفر کے ساتھ کئی کئی دن قیام کرتی تھی۔ توقیر بھی اکثر یہاں رہ جاتا تھا۔

فیضو اور یاسمین اب اظفر کی اپنے نواسے کی طرح نہیں' اپنے بیٹے کی طرح پرورش کر رہے تھے۔ انہیں کسی بیٹے کی پرورش کا موقع تو قدرت نے دیا ہی نہیں تھا' اب تو نواسے کی صورت میں انہیں ایک بیٹا مل گیا تھا اور وہ بیٹے کے لیے اپنی زندگی بھر کی جمع شدہ محبتوں کا خزانہ اس پر نچھاور کر رہے تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اظفر کے دل سے اس کے مرحوم والدین کی یاد آہستہ آہستہ مٹتی جا رہی تھی وہ اپنے نانا کو ''ابا'' اور نانی کو ''اماں'' کہتا تھا اور فیضو جب اس کی زبان سے ''ابا'' کا لفظ سنتا تو اسے یہ محسوس ہوتا کہ وہ سچ مچ اس کا باپ ہے اور یاسمین اس کی ماں ہے اور دونوں نے اپنی عمر کے اس آخری حصے میں بالآخر ایک بیٹا پا لیا ہے۔

اسکول کی سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو فیضو اور یاسمین اظفر کو ساتھ لے کر ملک سے باہر گئے۔ انہوں نے پندرہ دن کا عرصہ یورپ کے مختلف شہروں میں گزارا۔ یاسمین تو اور زیادہ رہنا چاہتی تھی لیکن فیضو اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث زیادہ دنوں تک ملک سے باہر رہنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

پندرہ دن کے دوران انہوں نے اظفر کو یورپ کے کئی بڑے بڑے اور معروف شہروں کی سیر کروائی۔ اظفر اب چونکہ مستقل طور پر اپنے نانا نانی کے ساتھ ہی رہتا تھا اس لیے قدرتی طور پر اس کا لگاؤ بھی انہی دونوں سے زیادہ تھا۔ تاہم دادا دادی کے پاس بھی وہ اکثر جاتا رہتا تھا۔ یاسمین خود اسے لے کر کبھی کبھار وہاں پہنچ جایا کرتی تھی اور توقیر مرحوم کے والدین بھی کبھی کبھار آجاتے تھے لیکن توقیر اور تزئین' دونوں کی موت کے بعد اب تعلقات میں وہ غیر معمولی گرم جوشی باقی نہیں رہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ تاہم فیضو اور یاسمین نے توقیر کے والدین کی عزت واحترام میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی اور پھر اظفر کی شکل میں ایک مضبوط رشتہ ان کے درمیان موجود تھا۔ اظفر تو دونوں خاندانوں کا مشترکہ سرمایہ اور مشترکہ رابطہ تھا۔

توقیر کا باپ شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کا پرانا مریض تھا۔ بیٹے اور بہو کی موت کے بعد سے نہ صرف یہ کہ اس کے امراض میں شدت پیدا ہو گئی تھی بلکہ نئی شکایتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ عارضہ قلب میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا ایک بار بائی پاس بھی ہوا۔ بائی پاس ہونے کے دو سال کے بعد ہی اس پر ایک بار پھر دل کا شدید دورہ پڑا۔

ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ایک بار پھر بائی پاس کیا جائے' لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ دوبارہ بائی پاس ہونے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے سدھار گئے۔ اظفر کو اپنے دادا کی موت کا اس سے کچھ کم صدمہ ہوا جتنا کہ اس کی عمر کے بچے کو ہونا چاہئے تھا' کیونکہ دادا دادی سے اس کی قربت اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی کہ نانا نانی سے نانا نانی تو اس کے لیے اس کے ماں باپ کی جگہ تھے۔

اظفر کی عمر نو سال ہو چکی تھی۔ فیضو اور یاسمین اب عمر کی اس منزل میں تھے جب سفر کا اختتام زیادہ سے زیادہ قریب تر نظر آنے لگتا ہے۔ فیضو اور یاسمین نے اپنے وکلاء کے ذریعے اظفر کو تحریری طور پر اپنا اکلوتا قانونی وارث قرار دے دیا تھا۔ ان دونوں کی موت کے بعد ان کا نواسا اظفر ہی اس سارے کاروبار' ملکیت' جائیداد اور اثاثوں کا مالک تھا۔

لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اظفر کے سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی فیضو اور یاسمین اس دنیا سے سدھار جائیں!

فیضو نے اس کا بھی قانونی طور پر بھی بندوبست کر لیا تھا۔ دنیا میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس پر وہ آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکتا تھا اور وہ تھا اس کا نوجوانی کے زمانے کا دوست منیر' جو اس کا واحد راز دار بھی تھا۔ منیر وہ واحد شخص تھا جس کو شاہدہ کے ساتھ فیضو کی دوسری شادی' جڑواں بچیوں کی پیدائش اور شاہدہ کی موت کے بارے میں معلوم تھا لیکن وہ شاہدہ کی

موت کے حقیقی سبب سے ناواقف تھا۔

فیضو نے یہ بندوبست کر دیا تھا کہ اظفر کے بالغ ہونے سے پہلے اگر اس کی اور یاسمین کی موت واقع ہو جائے تو اظفر کے قانونی طور پر بالغ ہونے تک منیر اظفر کی جانب سے اس کاروبار کو سنبھالے گا اور اظفر کے بالغ ہونے پر اس کی امانت اس کو لوٹا دے گا۔ اسے منیر پر پورا اعتماد تھا۔ منیر کے اپنے مفادات بہت ہی کم تھے کیونکہ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

فیضو کے دل میں بہت سے خدشات تھے زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور اس کا حقیقی وارث ابھی بہت چھوٹا تھا۔ فیضو اپنے کاروبار کو جس میں اندھی اور بے تحاشہ کمائی خفیہ اور ناجائز طریقوں سے ہوتی تھی' جس طرح سے چلا رہا تھا وہ اسی دم کے ساتھ وابستہ تھی' اگر آج اس کی آنکھ بند ہو جاتی تو پھر اس کاروبار کو اس انداز میں چلانے والا کوئی اور نہیں تھا۔ یہ کام ملازم نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کام صرف مالک کر سکتا تھا اور ملازم تو محض کارندوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مالک فیضو خود تھا اور اس کے جاں نشین کے اس قابل ہونے میں کہ وہ مالک کی گدی سنبھال سکے ابھی ایک لمبا عرصہ درکار تھا۔ منیر کا مزاج بالکل مختلف تھا۔ وہ کالے دھندوں کی دنیا کا آدمی نہیں تھا اور اسی لیے فیضو اس پر پورا بھروسا کرتا تھا۔ چنانچہ اس صورتِ حال کے تحت فیضو کی یہ کوشش تھی کہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ روپیہ کماتا جائے اور کمائی ہوئی رقم کو جائیداد کی خریداری میں' سونے کی خریداری میں' قابل اعتماد اسٹاکس اور شیئرز کی خریداری میں' بینکوں کے سرٹیفکیٹس کی خریداری میں اور غیر ملکی کرنسی کی شکل میں محفوظ کرتا جائے۔ اس نے بہت بڑی رقم خفیہ طور پر کچھ غیر ملکی بینکوں میں بھی منتقل کر دی تھی۔ یہ سب کچھ اظفر کے نام تھا اور بلوغت کے بعد وہ ساری دولت بآسانی حاصل کر سکتا تھا۔

''کون جانے' میرے مرنے کے بعد اس سارے کاروبار کا کیا حال ہو۔'' وہ اکثر اپنے آپ سے کہتا تھا۔ ''منیر تو کاروبار کو سیدھے طریقے سے ہی چلائے گا لیکن سیدھے سادے کاروبار میں بھلا کیا رکھا ہے؟ مجھے اظفر کے لیے اتنے اثاثے اور اتنا کیش چھوڑ کر جانا چاہئے کہ وہ اور اس کی کئی نسلیں ٹھاٹھ سے زندگی گزار سکیں۔ کیا خبر وہ میری طرح پیسہ بنانے کا گر جان پائے یا نہ جان پائے۔''

اس سوچ کا نتیجہ یہ تھا کہ فیضو کی ہوس کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ نئی نئی غیر معیاری اور جعلی دوائیں تیار ہو رہی تھیں اور انہیں بے حد مہنگے داموں فروخت کرنے کے لیے اس کا پورا نیٹ ورک کام کر رہا تھا جس میں ملک بھر کے بہت سے بڑے بڑے ڈاکٹر اور اسپتالوں کے ایڈمنسٹریٹر وغیرہ شامل تھے۔ کیمیکلز کی درآمد کی آڑ میں قیمتی غیر ملکی شراب سمیت

بہت ساری دیگر مہنگی اشیاء کی اسمگلنگ کا سلسلہ بھی جاری تھا اور اس کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے طرح طرح کے کالے دھندے تھے جن کے ذریعے فیضو رات دن دولت کی کشید میں مصروف رہتا تھا۔

کلفٹن کے علاقے میں اس کی ایک کوٹھی تھی جسے اس نے ایک خاص کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس عشرت کدے میں ''لوگ'' عارضی قیام کے لیے آتے تھے۔ ان ''لوگوں'' میں بڑے بڑے اعلیٰ سرکاری حکام' سیاست دان' وزراء غیر ملکی دواساز اداروں کے کارندے' بڑے بڑے ڈاکٹرز اور دیگر ایسے ''اہم افراد'' شامل ہوتے تھے جن کی چشم و ابرو کی جنبشوں سے فیضو کے کاروبار کے پہیے گھومنے میں بہت مدد ملتی تھی۔ ان کے یہاں عارضی قیام کے دوران ان کے لیے ہر طرح کی عیاشی کا شاندار بندوبست کیا جاتا تھا۔ ہر مہمان کی اپنی ضرورت کے مطابق اسے ''سہولتیں'' فراہم کی جاتی تھیں۔ یہ کوٹھی بہت کم خالی رہتی تھی۔ عام طور سے اس میں کوئی نہ کوئی مہمان موجود رہتا تھا۔ مہمانوں کی ''خاطر مدارت'' پر فیضو جو بھاری بھر کم رقم خرچ کرتا تھا وہ اس کا انویسٹمنٹ تھا۔ اس سے کہیں زیادہ رقم وہ کما لیتا تھا۔

☆======☆======☆

اظفر کی عمر اب نو سال تھی اور وہ چھٹی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ روزانہ ڈرائیور اسے گاڑی میں اسکول چھوڑ کر آتا تھا اور چھٹی کے وقت لے کر آتا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک گاڑی خاص طور پر مخصوص تھی۔

اس روز بھی معمول کے مطابق اظفر نے اپنے نانا نانی کے ساتھ ناشتہ کیا۔ یہ معمول تھا کہ وہ تینوں ساتھ ہی ناشتہ کرتے تھے اور یاسمین خود ہی اظفر کو اسکول کے لیے تیار ہونے میں مدد دیتی تھی۔ اگرچہ گھر میں ملازموں کی کمی نہیں تھی' لیکن اظفر کے زیادہ تر کام یاسمین خود ہی کرتی تھی۔

ناشتے سے پہلے ہی اظفر کو اسکول کے لیے تیار کر دیا گیا تھا۔ فیضو اپنے دفتر کے لیے دس بجے کے بعد نکلتا تھا۔ اس کے بعد اس کا زیادہ تر وقت اخبارات وغیرہ دیکھنے میں گزرتا تھا۔

اظفر نے ناشتہ ختم کیا اور جلدی سے بستہ سنبھال کر دروازے کی طرف لپکا۔ فیضو اور یاسمین بھی معمول کے مطابق اس کے ساتھ ہی اٹھ گئے اور کاریڈور تک اس کے ساتھ آئے۔ کاریڈور میں اظفر کا ڈرائیور جلیل پہلے سے موجود تھا۔ اس نے جلدی سے اظفر کا بستہ ہاتھ سے لے لیا اور باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جلیل ادھیڑ عمر کا ایک بہت ہوشیار اور تجربہ کار ڈرائیور تھا اور بہت دھیمی طبیعت کا مالک تھا۔ وہ ہمیشہ گاڑی محتاط انداز میں چلاتا تھا۔ کراچی کے بے ہنگم اور پُر آشوب ٹریفک میں وہ گزشتہ بیس سال سے گاڑی چلا رہا تھا لیکن اس سے آج تک کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا۔ فیضو نے اپنے بہت سے ڈرائیوروں میں سے اظفر کے لیے جلیل کا انتخاب اسی وجہ سے کیا تھا کیونکہ جلیل کی ڈرائیونگ قابلِ اعتماد تھی۔ اظفر کو ساتھ لے کر گاڑی چلانے کے لیے ایسے ہی محتاط ڈرائیور کی ضرورت تھی۔

جلیل نے کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں کھڑی ہوئی شاندار گاڑی کا دروازہ اظفر کے لیے کھولا اور اظفر اندر بیٹھ گیا۔ جلیل نے اس کا بستہ بھی ساتھ رکھ دیا۔

گاڑی گیٹ پر پہنچی۔ مسلح چوکیدار نے گیٹ کھولا اور گاڑی باہر نکل گئی۔

کچھ دور تک آگے جانے کے بعد گاڑی دائیں طرف کو ایک سڑک پر مڑ گئی۔ پہلی والی سڑک کی طرح یہاں بھی دونوں جانب بڑے بڑے مکانات تھے' جن کے مکین ان کے اندر اس طرح رُوپوش تھے جیسے ان کا کہیں وجود ہی نہ ہو۔ سڑک پر بالکل سناٹا تھا۔ تمام مکانوں کے گیٹ بند تھے۔ کسی ایک آدھ گیٹ کے باہر چوکیدار موجود تھا ورنہ زیادہ تر چوکیدار بھی گیٹ کے اندر کی طرف ہی تھے۔ علاقے کی فضا جیسے خوف سے سہمی ہوئی لگتی تھی۔

گاڑی سڑک کے اس حصے پر پہنچی جہاں آس پاس کسی گیٹ پر بھی کوئی چوکیدار نہیں نظر آ رہا تھا۔ اسی وقت ایک بغلی گلی سے ایک گاڑی تیزی سے نکلی اور ایسے بے ڈھنگے طریقے سے جلیل کی گاڑی کے سامنے آئی کہ جلیل فوراً ہی بریک نہ لگاتا تو ٹکر ہو جاتی۔

جلیل ابھی اس غیر محتاط ڈرائیور سے کوئی احتجاج بھی نہیں کر پایا تھا کہ فوراً ہی دو آدمی اس گاڑی میں سے نکل کر تیزی سے جلیل کی گاڑی کی طرف بڑھے۔

''نیچے اترو۔'' ایک آدمی نے ریوالور کی نال جلیل کی کنپٹی پر لگا دی۔ دوسرے آدمی نے پچھلا دروازہ کھول کر اظفر پر ریوالور تان لیا تھا۔

''اگر گاڑی چاہئے تو لے لو۔'' جلیل نے جلدی سے چابی نکال کر اس شخص کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

جلیل کے لیے فیضو کی واضح ہدایت تھی کہ اگر کبھی ایسی صورتِ حال پیش آ جائے کہ کوئی شخص گن پوائنٹ پر گاڑی چھیننے کی کوشش کرے تو وہ ہرگز مزاحمت نہ کرے اور ایک لمحے کے بھی تامل کے بغیر گاڑی کی چابی ڈاکو کے حوالے کر دے۔ جلیل نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے' اپنے مالک کی ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گاڑی کی چابی ڈاکو کے حوالے کرنی چاہی۔

''نیچے اترو۔'' ڈاکو نے چابی اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے اسے حکم دیا۔

جلیل گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ دوسرے مسلح شخص نے اظفر کو بھی گن پوائنٹ پر گاڑی سے باہر نکال لیا۔ بری طرح سہمے ہوئے بچے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی ایسی عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔

نہ جانے کس وقت ایک دوسری گاڑی وہاں آن موجود ہوئی تھی۔ مسلح افراد نے جلیل اور

اظفر کو اس گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا۔ ایک ایک مسلح شخص ان دونوں کے برابر والے دروازے کی طرف بیٹھ گیا۔ ریوالور کی نالیں جلیل اور اظفر کی پسلیوں سے لگی ہوئی تھیں۔ دو آدمی گاڑی کی اگلی سیٹ پر موجود تھے' جن میں ایک اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔

''خبردار ذرا سی بھی آواز نکالی تو فوراً گولی مار دی جائے گی۔'' جلیل کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے ریوالور کی نال کو اس کے پہلو میں زور سے چبھوتے ہوئے کہا۔

جلیل کچھ نہیں بولا۔ وہ اب معاملے کو سمجھ چکا تھا۔ یہ محض گاڑی چھیننے کی واردات نہیں تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی تیزی سے بھگانا شروع کر دی۔ جلیل صرف اتنا دیکھ پایا تھا کہ ایک آدمی اس گاڑی میں داخل ہو گیا تھا اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے کسی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اظفر نے کچھ بولنا چاہا تو اس کے برابر بیٹھے ہوئے مسلح آدمی نے نرمی کے ساتھ اسے خاموش کر دیا۔ ''چپکے بیٹھے رہو بیٹا۔۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے لیکن اگر شور مچاؤ گے تو برا ہو گا۔''

گاڑی ڈیفنس سوسائٹی کی طویل اور پُر پیچ سڑکوں پر تیزی سے بھاگتی جا رہی تھی اور گھر سے اس کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جلیل ان راستوں سے واقف تھا۔ گاڑی نے کلفٹن کا رخ اختیار کیا اور پھر وہ عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے پاس جا پہنچی۔ مزار سے کافی آگے جانے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔

گاڑی کے رکتے ہی جلیل کے برابر بیٹھا ہوا مسلح آدمی نیچے اترا اور اس نے جلیل کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ''نیچے اترو۔۔''

''مگر..... اظفر۔'' جلیل نے قدرے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

اس آدمی نے جلیل کی بات کا کوئی جواب دینے کی بجائے اس اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ گر پڑا۔ اس کی ساتھ ہی وہ شخص گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی وہاں سے تیزی سے بھاگنے لگی۔

جلیل نے حتی المقدور اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بھاگتی ہوئی گاڑی کا نمبر دیکھ لیا اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ وہ برابر اس نمبر کو اپنے دل میں دہراتا رہا کہ کہیں وہ اس کو بھول نہ جائے۔ گاڑی تو آن کی آن میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

جلیل نے فوراً کسی ٹیکسی کی تلاش شروع کر دی تھی۔ یہ سڑک اس وقت اس قدر ویران اور خالی تھی کہ اس پر کوئی ٹریفک ہی نہیں تھا۔ کوئی ٹیکسی یا رکشہ وغیرہ دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے قریب سے گزرنے والی کئی کاروں کو ہاتھ دے کر روکنے کی کوشش کی لیکن کسی

نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔

آخر کافی دیر کے بعد خدا خدا کر کے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ جلیل نے اسے روکا اور جب اسے مطلوبہ جگہ چلنے کے لیے کہا تو ڈرائیور نے انکار کر دیا کہ ادھر سے خالی آنا پڑے گا۔

''زیادہ پیسے لے لو۔'' جلیل نے کہا۔ ''واپسی کے کرائے کے پیسے بھی۔۔ مگر خدا کے لیے چلو..... بہت ضروری ہے۔''

دُگنے کرائے کی بات سنتے ہی ٹیکسی ڈرائیور کے لب و لہجے کی تمام تر خشونت دور ہوگئی اور اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ جلیل ڈرائیور کے برابر میں بیٹھ گیا۔

جلیل کی ٹیکسی جب فیضو کے محل نما مکان کے گیٹ پر پہنچی تو صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ صاحب ابھی گھر پر ہی ہوں گے۔

جلیل نے جلدی سے بیل بجائی اور چوکیدار نے اندر سے گیٹ کی کھڑکی کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ جلیل کو ٹیکسی کے ساتھ دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔

''اس کو پیسے دے کر اس کی چھٹی کرو۔'' جلیل نے کانپتی ہوئی آواز میں چوکیدار سے کہا اور خود تیزی سے بھاگتا ہوا اندر پہنچا۔

لان میں اسے یاسمین نظر آئی جو مالی سے کچھ بات کر رہی تھی۔ وہ جلیل کو دیکھ کر حیران ہوگئی۔ جلیل گاڑی کے بغیر آ رہا تھا اور وہ بھی بھاگتا ہوا، پریشان حالت میں۔

''جلیل..... جلیل.....'' یاسمین مالی کو چھوڑ کر جلیل کی طرف لپکی۔ ''کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟ تم.....''

''خیریت نہیں ہے بیگم صاحبہ!'' جلیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''بدمعاشوں نے اظفر کو اغوا کر لیا ہے.....''

''کیا؟'' یاسمین اتنے زور سے چیخی کہ اس کی آواز سارے گھر میں دور تک گونجتی چلی گئی۔ ''کیا بک رہے ہو؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں بیگم صاحبہ۔'' جلیل نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''کچھ بدمعاش اظفر کو زبردستی اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

یاسمین کی چیخ سن کر فیضو بھی کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ ''کیا ہوا؟ کیوں چلا رہی ہو؟'' اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں یاسمین سے پوچھا۔

''صاحب..... چھوٹے صاحب کو بدمعاشوں نے اغوا کر لیا ہے۔'' جلیل نے بدستور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ لوگ گاڑی بھی چھین کر لے گئے۔''

''جلدی بتاؤ کیا ہوا؟'' فیضو بجلی کی طرح دوڑ کے جلیل کے پاس آ گیا۔ ''کیا ہوا؟ جلدی بتاؤ۔''

جلیل نے جلدی جلدی پورا واقعہ فیضو اور یاسمین کو سنا دیا۔ ''میں نے گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تھا صاحب، نمبر مجھے یاد ہے۔'' اور اس نے نمبر دہرایا، جسے وہ سارے راستے بڑی احتیاط کے ساتھ یاد کرتا ہوا چلا آیا تھا۔

''ہائے میرے مولا..... اب کیا ہوگا؟'' یاسمین نے چلا چلا کر روتے ہوئے کہا۔ ''ہائے میرا بچہ..... ارے جلدی سے پولیس کو فون کرو۔''

فیضو اس کو کوئی جواب دیئے بغیر فون کرنے کے لیے تیزی سے اندر کی طرف بھاگا وہ پولیس کو فون نہیں کر رہا تھا۔

باہر لان میں یاسمین زار و قطار روتے ہوئے جلیل سے اس خوفناک واقعے کی تفصیلات پوچھ رہی تھی اندر کمرے میں فیضو فون پر کمالو کا نمبر ملا رہا تھا۔

''کمالو!'' فیضو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور جلدی جلدی بولتے ہوئے اظفر کے اغوا کے بارے میں بتایا۔ اس نے اس کو گاڑی کا نمبر بھی بتا دیا۔

''خدا کے لیے کمالو!'' فیضو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا..... ''ان لوگوں کا پتہ لگاؤ۔ کون لوگ ہیں..... کتنا پیسہ چاہتے ہیں..... بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے پائے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' کمالو نے اسے تسلی دی۔ ''میں فوراً اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ ہم ان لوگوں کو جلد ڈھونڈ نکالیں گے، ویسے۔ آپ نے پولیس کو تو فون کر دیا ہوگا؟''

''ابھی نہیں کیا ہے۔'' فیضو نے کہا۔ ''پہلے میں تم کو فون کر رہا ہوں۔ اس کے بعد پولیس کو فون کروں گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' کمالو نے کہا۔ ''آپ پولیس کو فون کر دیجئے بلکہ ڈرائیور کو ساتھ لے کر تھانے چلے جایئے اور خود ایف آئی آر درج کروا دیجیے۔''

''ہاں، میں ایسا ہی کرتا ہوں۔'' فیضو نے سخت اضطرابی لہجے میں کہا۔ ''بس تم فوراً پتہ لگانے کی کوشش کرو..... بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ ان لوگوں کا پتہ چل جائے تو میں خود ان سے بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم پیسے کی فکر مت کرو۔''

''میں انہیں تلاش کرتا ہوں سر۔'' کمالو نے کہا۔

اس کے بعد فیضو نے فوراً پولیس کو فون کیا اور مختصراً اس واقعے کی اطلاع دی۔ مقامی

تھانے کا ایس ایچ او فیضو کے ''نیاز مندوں'' میں سے ایک تھا اور صرف ایک ایس ایچ او ہی نہیں اور بھی دوسرے کئی لوگ فیضو کے ''نیاز مندوں'' میں شامل تھے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ فیضو جس علاقے میں رہ رہا ہو وہاں کے تھانے والوں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

ایس ایچ او نے فوراً ہی اس کو مشورہ دیا کہ وہ ڈرائیور کو لے کر تھانے آجائے اور پکی ایف آئی آر درج کروادے۔ فیضو فوراً ہی جلیل کو ساتھ لے کر تھانے روانہ ہو گیا۔

ایس ایچ او نے اپنی کرسی سے کھڑے ہو کر فیضو کا استقبال کیا اور اسے بڑی عزت کے ساتھ بٹھایا۔ فیضو کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ سخت حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔

ایس ایچ او کے استفسار پر جلیل نے اس واقعے کی ساری تفصیلات بیان کیں اور ساتھ ہی اس گاڑی کا نمبر، ماڈل اور رنگ وغیرہ کے بارے میں بھی بتایا۔

''نمبر تمہیں اچھی طرح یاد ہے نا؟'' ایس ایچ او نے جلیل سے پوچھا۔

''جی ہاں سر۔'' جلیل نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں تو اس کو برابر یاد کرتا رہا ہوں۔''

اظفر کے اغوا کی ایف آئی آر درج کر لی گئی۔ وائرلیس کے ذریعے واردات کی اطلاع تو پہلے ہی دی جا چکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' ایس ایچ او نے جلیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم ذرا کمرے کے باہر بیٹھو۔ اگر ضرورت ہوگی تو دوبارہ تم کو بلالیں گے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' جلیل نے کہا اور وہ کمرے سے نکل کر باہر چلا گیا۔

''اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سر، ہم سب سے پہلے اس ڈرائیور کو پکڑ کر بند کرتے اور اس سے ہی تفتیش کا آغاز کرتے لیکن چونکہ یہ آپ کا معاملہ ہے، اس لیے ہم آپ کی مرضی اور اجازت کے بغیر ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ آپ فرمائیے، کیا آپ کو اپنے اس ڈرائیور پر پورا بھروسا ہے؟ ایسا تو نہیں ہے کہ یہ بھی اغوا کنندگان کے ساتھ ملا ہوا ہو؟ کوئی شبہ ہے آپ کو اس پر؟''

''نہیں۔'' فیضو نے فوراً جواب دیا۔ ''ایسا نہیں ہے۔ جلیل ایک بہت قابلِ اعتماد آدمی ہے وہ پچھلے دس سال سے میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اظفر جب سے پیدا ہوا تھا وہ اظفر کی ڈرائیوری کر رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ در پردہ اغوا کنندگان سے ملا ہوا ہو سکتا ہے۔''

''اچھی طرح سوچ لیجیے سر۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''بعض اوقات ضرورت سے زیادہ اعتماد بھی آدمی کو نقصان پہنچا دیتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔'' فیضو نے کہا۔ ''لیکن میں جلیل کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اظفر کو بہت چاہتا ہے اور اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔''

''پھر بھی سر ہمیں اگر شک کا کوئی پہلو نظر آیا تو ہم اس کو دوبارہ بلائیں گے۔ اس کے لیے آپ کی پیشگی اجازت کی ضرورت ہے۔''

''بلا لیجیے، اگر ضرورت محسوس کریں تو۔'' فیضو نے کہا۔ ''لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اگر اس پر سختی نہ کریں تو اچھا ہے۔''

''آپ اطمینان رکھیے سر۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''ہم کوئی بھی کارروائی بلاضرورت نہیں کریں گے۔''

''اور ہاں اظفر کی بازیابی پر پانچ لاکھ روپے کا انعام بھی رکھ رہا ہوں۔'' فیضو نے کہا۔ ''اگر پولیس اس کو تلاش کر لے گی تو یہ انعام پولیس کا ہوا..... اور اس انعام میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہم فوری طور پر تلاش کا کام شروع کر دیتے ہیں سر۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''میں پولیس کے آرٹسٹ کو بلواتا ہوں۔ میں آپ کو فون کروں گا آپ جلیل کو کچھ دیر کے لیے پھر بھیج دیجیے گا۔ ہم اس کی مدد سے اغوا کنندگان کے خاکے بنوانے کی کوشش کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' فیضو نے کہا۔ ''آپ جس وقت کہیں گے، میں اس کو بھیج دوں گا۔''

فیضو ایس ایچ او کے کمرے سے باہر نکلا تو جلیل برآمدے میں موجود تھا، فیضو اس کو ساتھ لے کر گھر روانہ ہو گیا۔ راستے میں فیضو نے جلیل سے کہا کہ وہ گھر پر ہی رہے اور کہیں باہر نہ جائے، کیونکہ پولیس اپنے آرٹسٹ سے اغوا کرنے والوں کے خاکے بنوانا چاہتی ہے۔

''میں نے ان کی شکلیں دیکھی ہیں سر۔'' جلیل نے کہا۔ ''تین آدمیوں کو تو بالکل صاف طور پر دیکھا ہے جو میرے اور چھوٹے صاحب کے ساتھ گاڑی میں تھے۔ ہماری گاڑی لے کر بھاگنے والا شاید ایک ہی آدمی تھا۔ میں اس کی شکل ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا۔''

''جو کچھ ٹھیک سے دیکھ سکے ہو، وہ سب بتا دینا۔'' فیضو نے کہا۔

وہ لوگ واپس گھر آ گئے۔ وہاں ایک صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ یاسمین نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ ملازمائیں اس کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اظفر کی دادی کو بھی فون کیا جا چکا تھا اور وہ اپنے گھر سے نکل پڑی تھیں، کچھ ہی دیر میں پہنچنے والی تھیں۔

یاسمین اپنے شوہر اور ڈرائیور کے انتظار میں گیٹ کے پاس ہی موجود تھی۔ فیضو نے اس کو تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ پولیس میں ایف آئی آر درج کرائی جا چکی ہے اور پولیس والوں

نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ وہ اظفر کا ایک تازہ ترین فوٹو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا تھا جو اس نے ایس ایچ او کو دے دیا تھا۔

فیضو کے گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد اظفر کی دادی بھی اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ روتی پیٹتی وہاں آن پہنچی۔ سارا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔

کوئی گھنٹہ بھر کے بعد ایس ایچ او کا فون آ گیا۔ اس نے کہا کہ جلیل کو تھانے بھیج دیا جائے۔ آرٹسٹ آ چکے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ گاڑی کی نمبر پلیٹ جعلی تھی۔

''کوئی فون وغیرہ تو نہیں آیا سر۔'' ایس ایچ او نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کوئی مطالبہ؟''

''ابھی تک نہیں۔'' فیضو نے جواب دیا۔ ''کسی نے کوئی فون نہیں کیا۔''

''ویسے کوئی فون آئے تو آپ ذرا لمبی بات کریں۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''ہم نے آپ کے گھر کے دونوں فونوں اور دفتر میں آپ کے ڈائریکٹ فونوں کو ٹیپ کرنے کا بندوبست کروا دیا ہے۔''

''میں آج دفتر نہیں جا رہا ہوں۔'' فیضو نے کہا۔ ''گھر پر ہی رہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ گھر یا دفتر فون کریں گے نہیں' کیونکہ اتنا تو وہ بھی جانتے ہیں کہ کال بآسانی ٹریس اور ٹیپ کی جا سکتی ہے۔''

''جی ہاں سر۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''آج کل تو بہت آسان ہے۔ پھر بھی ہمیں اپنا کام تو کرنا ہی ہے۔ شاید وہ لوگ رابطے کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کریں۔''

تھانے سے واپس آنے کے فوراً بعد ہی فیضو نے منیر کو فون کیا تھا۔ منیر سے اس کی بات نہیں ہو پائی تھی' لیکن اس نے منیر کے لیے یہ پیغام چھوڑ دیا تھا کہ وہ فوراً اس کے گھر آ کر اس سے ملاقات کرے۔

وہ بہت بے چینی سے منیر کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے منیر آیا۔ اسے ابھی تک اس واقعے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ جب فیضو نے اسے بتایا تو اس کی ہوش اُڑ گئے۔

''تمام اخبارات میں اعلان گمشدگی کے ساتھ اظفر کی تصویر چھپوا دو۔'' فیضو نے منیر کو ہدایت کی۔ ''اور اس کے ساتھ ہی پانچ لاکھ روپے انعام کا اعلان بھی۔''

منیر کے جانے کے بعد فیضو کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر گیا۔ اس نے ایک نیا موبائیل فون خریدا اور اس کا کنکشن بھی حاصل کر لیا۔ اب اس کے پاس ایک ایسا فون موجود تھا جس

کا نمبر خود اس کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس نئے ٹیلی فون سیٹ سے اس نے سب سے پہلا فون کمالو کو کیا اور کمالو کو یہ نیا نمبر بتا دیا۔

''صرف اس نمبر پر فون کرنا۔'' اس نے کمالو سے کہا۔ ''گھر اور دفتر کے فون ٹیپ ہو رہے ہیں۔ میں بھی صرف اسی نمبر سے فون کرواں گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' کمالو نے کہا۔ کمالو کے پاس فیضو کو دینے کے لیے کوئی اطلاع نہیں تھی اور نہ ہی فیضو کے پاس کمالو کو بتانے کے لیے کوئی نئی بات تھی۔

''کوشش کرو کہ وہ لوگ فون کے بغیر ہی رابطہ کریں کسی طرح۔'' فیضو نے کہا۔ ''میں پولیس کو درمیان میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس سے معاملہ خراب ہو جائے گا۔ اگر انہوں نے کوئی فون کیا تو وہ فوراً ہی پکڑ میں آ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' کمالو نے کہا۔ ''میری پوری کوشش ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کا پتہ چلا لوں۔ میں برابر ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔۔ جیسے ہی کوئی بات معلوم ہوتی ہے' آپ کو بتاتا ہوں۔''

رات گئے تک کچھ پتہ نہ چل سکا۔ فیضو اور یاسمین کے لیے ایک ایک لمحہ عذاب بنا ہوا تھا۔ وہ ساری رات فیضو اور یاسمین نے تقریباً جاگ کر گزاری۔ ان کے کان ٹیلی فون کی گھنٹی پر لگے ہوئے تھے لیکن گھنٹی نہیں بجی۔ فیضو کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ چالاک اغوا کنندگان فون کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔

دوسرا دن بھی بغیر کسی اطلاع کے گزر گیا۔ کمالو اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا اور پولیس والے اپنی کوششوں میں۔ فیضو کا دونوں سے مسلسل رابطہ تھا' مگر کہیں سے کوئی حوصلہ افزا اطلاع نہیں مل رہی تھی۔

اور پھر دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ آٹھ دن گزر گئے۔ یاسمین روتے روتے پاگل ہوئی جا رہی تھی اور فیضو کا دل مایوسی کی دلدل میں دھنستا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس کو رہ رہ کر یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید اظفر کو تاوان کے لیے اغوا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو فیضو کے کسی دشمن نے اغوا کیا ہے اور شاید..... شاید..... اسے ہلاک کر دیا ہو۔ اس کا سارا وجود بار بار تھرا اٹھتا تھا۔ اس نے اپنے اس بھیانک خدشے کا اظہار اپنی بیوی سے نہیں کیا۔ یاسمین کو یہ بات ٹھیک سے معلوم نہیں تھی کہ فیضو کے دشمنوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس میں کیسے کیسے اور کتنے لوگ شامل ہیں۔ یہ بات تو فیضو ہی پوری طرح جانتا تھا کہ اس کے کتنے دشمن کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں

اور موقع پا کر اس کا خون پی جانے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اگر محفوظ تھا تو اس وجہ سے کہ وہ اپنے دشمنوں سے زیادہ طاقتور اور بارسوخ تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ ان پر قابو پا لیتا تھا۔ لیکن اس بار شاید کسی دشمن نے اس پر قابو پا لیا تھا لیکن کہیں سے کوئی اطلاع تو ملتی۔۔ ایسا گہرا سناٹا.....؟

وہ اپنے نئے موبائیل پر، جس کا نمبر کمالو کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں تھا، دن میں کئی کئی بار کمالو سے بات کرتا تھا۔ دوسرے ٹیلی فون سے پولیس افسروں اور اعلیٰ حکام سے بات کرتا تھا۔ گمشدہ بچوں کی تلاش میں مدد دینے والے فلاحی اداروں سے بات کرتا تھا، لیکن کہیں سے کوئی خبر نہیں آ رہی تھی۔ کمالو کا کہنا تھا کہ یہ واردات کسی ایسے گروہ نے کی ہے جو شاید بالکل نیا گروہ ہے یا پھر کسی دور دراز کے علاقے سے آئے ہوئے کوئی لوگ ہیں، جن کا سراغ لگانے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ کمالو کی باتیں سن کر فیضو پر سخت جھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ اس نے کمالو پر لاکھوں روپے لٹا دیئے تھے اور اب بھی لٹا رہا تھا لیکن جب اس کو کمالو کی اصل مدد کی ضرورت تھی تو کمالو بالکل بے کار ثابت ہو رہا تھا۔ فیضو کے وظیفہ خوار پولیس والے اور دیگر حکام بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر پا رہے تھے۔

آٹھویں دن فیضو کو ایک بند لفافہ ملا۔ کوئی شخص گیٹ پر آ کر چوکیدار کو یہ لفافہ دے کر چلا گیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر تھا اور اس نے چوکیدار کو تاکید کی یہ لفافہ صاحب کو فوراً پہنچا دیا جائے۔

فیضو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ لفافے پر ''فیضان علی'' لکھا ہوا تھا

فیضو کے ہاتھ پیروں میں سنسنی دوڑنے لگی۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ لفافہ کھولا۔ اس میں اُردو میں ٹیڑھی میڑھی اور بدنما تحریر میں لکھا ہوا ایک پرچہ رکھا ہوا تھا، جس میں لکھا ہوا تھا کہ فیضو خود آج سے چوتھے دن ایک کروڑ روپے کی رقم لے کر کلفٹن کے ساحل پر فلاں فلاں جگہ رات کے نو بجے پہنچ جائے۔ جگہ کی ٹھیک طرح نشاندہی کر دی گئی تھی اور تمام ضروری ہدایات درج کر دی گئی تھیں۔ وہ صرف اپنے ڈرائیور کو ساتھ لا سکتا تھا اور کسی کو نہیں۔

رقم استعمال شدہ بڑے نئے نوٹوں کی شکل میں ایک بریف کیس میں رکھ کر لانی تھی کوئی بات چیت نہیں ہونی تھی اور رقم میں کمی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پولیس کو اطلاع دینے کی صورت میں بچے کو جان سے مارنے کی دھمکی تھی۔ رقم ملنے کے ایک گھنٹے بعد بچے کو اس کے گھر پہنچا دیا جانا تھا۔

فیضو نے یہ خط پڑھتے ہی فوراً اپنی بے اندازہ پھیلی ہوئی دولت اور اثاثوں کو چند لمحوں میں جانچ لیا تھا۔ جتنا کچھ اس کے پاس موجود تھا۔ اس میں سے ایک کروڑ روپے کی رقم وہ بہت آسانی سے دے سکتا تھا۔ اس نقصان کی تلافی بھی وہ بہت جلد کر سکتا تھا۔ یہ سارا حساب لگانے میں اسے چند سیکنڈ سے زیادہ کا عرصہ نہیں لگا اور اس نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا۔ پولیس کو معاملے سے الگ رکھنے کی ضرورت تھی۔ ذرا سی غلطی سے اظفر کی جان جا سکتی تھی۔

یاسمین کو بھی کچھ بتانے سے پہلے، اس نے کمالو کو فون کیا اور اس خط کے بارے میں بتایا۔ ''میں رقم لے کر جاؤں گا کمالو، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ وہ لوگ کوئی سودے بازی نہیں کرنا چاہتے۔ انہوں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا ہے۔ ان کا مطالبہ آخری ہے۔''

''میں آپ کے ساتھ چلوں گا سر۔'' کمالو نے کہا۔ ''ڈرائیور کی جگہ میں لوں گا۔ شاید میں کسی کو دیکھ سکوں، پہچان سکوں، تو پھر بعد میں اس سے بات کر کے کچھ رقم واپس دلوا سکتا ہوں۔''

''تم ساتھ چلو گے تو اچھا ہوگا۔'' فیضو نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ''مجھے تو بس سب سے زیادہ فکر اظفر کی سلامتی کی ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ جب ان لوگوں کو رقم مل جائے گی تو وہ اظفر کو چھوڑ دیں گے۔'' کمالو نے کہا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔'' فیضو نے کہا۔

اس کے بعد فیضو نے وہ خط یاسمین کو دکھایا۔ یاسمین کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

''زندہ ہے۔ میرا بچہ زندہ ہے..... وہ مل جائے گا..... وہ گھر آ جائے گا۔''

یاسمین خوشی اور اضطراب کے عالم میں جیسے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی اپنے شوہر سے یہ نہیں پوچھا کہ آیا وہ ایک کروڑ روپے جیسی خطیر رقم کا بندوبست کرنے میں کامیاب بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ رقم کی فراہمی یاسمین کا دردِ سر نہیں تھا۔ وہ تو یہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کے پاس بے اندازہ دولت ہے، جو سب کی سب اس نے جائز طریقوں سے نہیں کمائی ہے۔

''ہمیں ایک کروڑ روپے کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' فیضو نے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک کروڑ روپیہ کیش۔۔ اور اس کے لیے اس نے ہمیں صرف دو دن کا وقت دیا ہے۔ دو دن کے اندر اندر ایک کروڑ کیش جمع کرنا ہوگا۔''

''تو کر لو۔'' یاسمین نے روتے ہوئے کہا۔ ''مگر پولیس والوں کو ہرگز نہ بتانا۔ روپوں کا

بندوبست کرلو۔ اگر کچھ کم ہیں تو کہیں سے قرض ادھار کرلو' مگر کرلو..... خدا کے واسطے۔''

''کرلوں گا۔'' فیضو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کرلوں گا۔''

''یا اللہ میرے بچے کی حفاظت کرنا' پاک پروردگار۔'' یاسمین نے روتے ہوئے کہا۔ ''اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

اگلے دو دن فیضو کو خاصا مصروف رہنا پڑا۔ ایک کروڑ کیش جمع کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ اس نے کئی الگ الگ بینکوں سے رقم نکلوائی۔ اس طرح وہ ایک کروڑ روپیہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے پولیس کو اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ البتہ کمالو کو اس نے صورتِ حال سے پوری طرح باخبر رکھا تھا۔

فیضو رقم کا بریف کیس لے کر مقررہ جگہ کی طرف روانہ ہوا تو گاڑی کمالو چلا رہا تھا۔ کمالو نے اپنے اصلی حلیے میں اس حد تک تبدیلی کرلی تھی کہ اس کو دیکھنے والا شخص اس کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ پوری طرح محفوظ تھا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ اغوا کنندگان نے پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ کوئی ہتھیار ساتھ نہ لایا جائے۔ فیضو خود بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ اسے تو اپنا نواسا زندہ سلامت چاہئے تھا۔ جب وہ رقم دے ہی رہا تھا تو پھر اس کو بچے کی جان کے لیے خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی۔

کلفٹن کے ساحل کے ساتھ ساتھ طویل ساحلی علاقے پر چلتے چلتے وہ لوگ اس جگہ پہنچ گئے جس کی خط میں نشاندہی کی گئی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ ایک بالکل ویران اور دور افتادہ جگہ تھی اور ادھر کوئی نہیں آتا تھا۔

وہ لوگ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے تھے اور انہیں وہاں پہنچے ہوئے پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ سفید رنگ کی ایک شیراڈ کار ان کے قریب ہی آکر رک گئی اور اس میں سے ایک آدمی اتر کر گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے چہرے کو چادر سے چھپا رکھا تھا۔ اس نے فیضو کی گاڑی کو دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''جایئے سر۔'' کمالو نے آہستہ سے کہا۔ ''جایئے وہ بلا رہا ہے۔''

فیضو کا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ زندگی میں آج تک ایسی خوفناک صورتِ حال کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اتنی بھاری رقم تو ہاتھ سے جا ہی رہی تھی لیکن اگر رقم کی ادائیگی کے بعد بھی بچہ نہ ملا تو پھر..... پھر کیا ہوگا؟ وہ تو بس خالی ہاتھ ملتا رہ جائے گا..... لیکن وہ کچھ اور کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ چارہ کار ہی بھلا کیا تھا۔

وہ بڑھ کر اس گاڑی کی طرف جانے لگا' لیکن اس آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے

اسے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا۔ فیضو اس کی شکل دیکھنے کی کوشش کررہا تھا' لیکن اس شخص نے اپنے چہرے کو چادر سے اور بھی زیادہ اچھی طرح چھپالیا۔

''ایک گھنٹہ بعد بچہ گھر پہنچ جائے گا۔'' اس شخص نے ایک نامانوس سے لہجے میں بھاری آواز میں فیضو سے کہا۔ ''کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔''

''نہیں نہیں!'' فیضو نے جلدی سے کہا۔ ''ہم کوئی چالاکی نہیں کریں گے۔ ہم نے پوری رقم دے دی ہے۔ بس ہمارا بچہ ہم کو مل جانا چاہئے۔''

''مل جائے گا۔'' اس شخص نے کہا۔ ''اور ابھی یہیں رکو' ہمارے پیچھے مت آنا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی وہاں سے تیزی سے روانہ ہوگئی۔ فیضو نے گاڑی کا نمبر دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس پر کالا تیل یا کیچڑ مل دی گئی ہے۔

فیضو نے کتنے لوگوں کے خلاف طرح طرح کی مجرمانہ کارروائیاں کروائی تھیں اور کمالو ان معاملات میں اس کا خاص آلہ کار تھا لیکن آج فیضو خود کو اور کمالو کو بھی' کتنا بے بس اور لاچار محسوس کررہا تھا۔ ذلت' شرم اور شکست کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجرم اس کی اور اس کے کارندے کمالو کے منہ پر تھوک کر چلے گئے ہیں۔

''میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا سر۔'' کمالو نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔ ''اس نے تو بالکل ہی اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔''

''میں بھی.....'' فیضو نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی کچھ نہیں دیکھ سکا۔ کم بخت کی آنکھوں کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔''

''گاڑی بھی سفید رنگ کی شیراڈ تھی۔'' کمالو نے کہا۔ ''کراچی میں ایسی نہ جانے کتنی گاڑیاں موجود ہیں۔ اس کی کوئی خاص شناخت بھی نہیں تھی۔''

''چلو' اب گھر چلو۔'' فیضو نے کہا۔ ''ہم اس گاڑی کو کبھی تلاش نہیں کرسکیں گے۔ ہمیں گھر چل کر اظفر کا انتظار کرنا ہے۔''

وہ لوگ گھر واپس آگئے۔ یاسمین گیٹ کے اندر بے تابی سے ٹہل رہی تھی۔

جیسے ہی چوکیدار نے ہارن کی آواز پر گاڑی کے لیے گیٹ کھولا' یاسمین لپک کر قریب آگئی اور گاڑی کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے فیضو سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟''

کمالو نے گاڑی تقریباً روک دی۔

''سب ٹھیک ہے۔'' فیضو نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سب ٹھیک ہے' تم اندر چلو۔ میں ابھی آرہا ہوں۔''

یاسمین اندر چلی گئی۔ کمالو نے گاڑی پورچ میں کھڑی کردی اور فیضو نے اسے ایک بیرونی کمرے میں بٹھا دیا اور خود اندر چلا گیا جہاں یاسمین اس کی زبان سے بہت کچھ سننے کی منتظر تھی لیکن فیضو کے پاس اس کو بتانے کے لیے کچھ زیادہ نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا تھا' وہ صرف چند جملوں میں بیان کیا جاسکتا تھا اور فیضو نے چند جملے خرچ کردیئے۔

''اب ہم صرف انتظار کرسکتے ہیں۔'' فیضو نے تھکی ہوئی اور بے بس آواز میں کہا۔ ''ہم نے تو اپنا سارا کام پوری ایمانداری کے ساتھ کردیا ہے۔ اب ان لوگوں کو اپنا کام کرنا ہے۔ ہمیں اب کچھ نہیں کرنا ہے۔ ویسے خدا نے چاہا تو ہمارا اظفر واپس آجائے گا۔ ہم نے پوری رقم دے دی ہے۔''

''یہ ڈرائیور کون ہے جو تمہارے ساتھ گیا تھا؟'' یاسمین نے اچانک سوال کیا۔ ''اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''پرانا آدمی ہے۔'' فیضو نے کہا۔ ''دفتر کی گاڑیاں چلاتا ہے' قابلِ اعتماد ہے..... ابھی میں نے اس کو روک کر رکھا ہوا ہے۔''

فیضو کچھ دیر تک یاسمین کے ساتھ رہا اور اس کو تسلی دیتا رہا۔ پھر وہ باہر آکر کمالو کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

ایک گھنٹہ گزرنے میں دس منٹ باقی تھے کہ فیضو یاسمین کو لے کر بالائی منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا جس کی ایک کھڑکی سڑک کے رخ پر کھلتی تھی۔ ان لوگوں نے کمرے کی لائٹ جلائے بغیر کھڑکی کھول دی۔ اب وہ اپنے گھر کے گیٹ کے باہر بہت دور تک دیکھ سکتے تھے۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ اس علاقے میں ٹریفک بہت کم رہتا تھا۔

ایک طرف سے آنے والی سفید گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ فیضو کی نگاہیں اس گاڑی پر جم گئیں۔ وہ شیراڈ ہی معلوم ہوتی تھی۔ گاڑی گیٹ سے کچھ فاصلے پر آکر رک گئی اور اس کا ایک پچھلا دروازہ کھلا۔ دروازے میں سے اظفر باہر نکلا اور اپنے گھر کے گیٹ کی طرف بھاگا۔ گاڑی فوراً وہاں سے غائب ہوگئی۔

''آگیا..... آگیا۔'' یاسمین بدحواسی کے عالم میں وہاں سے بھاگی۔ ''ارے میرا بچہ آگیا' میرا بچہ آگیا۔'' وہ روتی جارہی تھی۔ فیضو بھی ہیجان کے عالم میں اس کے ساتھ ساتھ

بھاگ رہا تھا۔ دونوں بھاگم بھاگ نیچے گیٹ پر آگئے۔ اس وقت تک اظفر گیٹ سے اندر آچکا تھا اور چوکیدار خوشی کے عالم میں چلا رہا تھا۔ دوسرے ملازمین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ اظفر کے ہاتھ میں ایک بستہ اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک تھیلا تھا۔

''میرا بچہ..... میرا لعل۔'' یاسمین نے زور زور سے اظفر کو سینے سے لگالیا۔ ''تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟'' یاسمین ایک ساتھ بہت سارے سوالات پوچھ لینا چاہتی تھی۔

''نہیں اماں!'' اظفر نے کہا۔ ''مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔''

اظفر یاسمین سے الگ ہوا تو فیضو نے اسے گلے لگالیا۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

''تم کو کسی نے مارا پیٹا تو نہیں؟'' فیضو نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''نہیں ابا!'' اظفر نے کہا۔ ''مجھے کسی نے نہیں مارا پیٹا' میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

فیضو اس کمرے میں گیا جہاں کمالو بیٹھا ہوا تھا۔ ''وہ آگیا ہے۔'' اس نے آہستہ سے کمالو سے کہا۔

''جی سر۔'' میں نے آوازیں سن لی ہیں۔ ''مبارک ہو' اب میں چلتا ہوں۔ آپ کو اس سے جو کچھ معلوم ہوسکے ان لوگوں کے بارے میں وہ مجھے بتایئے گا۔ ویسے اب میں اپنے طور پر زیادہ کھل کر پتہ لگانے کی کوشش کروں گا۔''

''اس طرح نہیں کمالو کہ ان لوگوں کو کوئی شبہ ہوجائے اور وہ دوبارہ کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔'' فیضو نے کہا۔ ''ہم دوبارہ اتنا بڑا جھٹکا نہیں برداشت کرسکتے۔''

''جانتا ہوں سر۔'' کمالو نے کہا۔ ''بس ذرا.....''

''اگر معلوم کرسکو تو صرف اتنا معلوم کرو کہ وہ کون لوگ تھے اور بس۔ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اظفر سے بھی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ وہ اس خوفناک واقعے کو جلد از جلد بھول جائے۔''

کمالو وہاں سے چلا گیا اور فیضو اندر آگیا۔ یاسمین نے اظفر کو فوراً نہانے اور کپڑے بدلنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ ''نہ جانے کیسی گندی گندی جگہوں پر رہنا پڑا ہوگا بے چارے کو۔ ویسے ان لوگوں نے اس کو نئے کپڑے تو دیئے ہیں' وہ تو اسکول کی یونیفارم میں گھر سے نکلا تھا۔''

پورے دس دن کے بعد فیضو کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر سے زندہ ہوگیا ہے

اور یہ دنیا اس کے اور اس کے وارث کے لیے ایک بار پھر ایک عشرت کدے میں تبدیل ہوگئی ہے۔

اظفر ان لوگوں کے بارے میں کوئی خاص معلومات فراہم نہ کرسکا اور نہ اس جگہ کی نشاندہی کرسکا جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ اس کے سامنے آنے والے چہرہ چھپا کر آتے تھے اور اسے کھانا وغیرہ دیتے رہتے تھے۔ انہوں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ جلد ہی اس کو اس کے گھر پہنچا دیں گے۔

فیضو خود بھی یہ چاہتا تھا کہ اظفر اس خوفناک واقعے کو کسی برے خواب کی طرح بھول جائے۔ اظفر کو گھر آئے ہوئے کوئی بیس دن کا عرصہ گزر گیا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگیا تھا۔ اسکول جا رہا تھا اس کی صحت بھی ٹھیک ہوگئی تھی۔ فیضو نے اب اس کی گاڑی میں ایک مسلح گارڈ بھی تعینات کر دیا تھا۔

اس روز اظفر اسکول سے واپس آیا تو اسے بخار تھا اور اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ شام تک اس کا بخار بڑھ گیا اور یاسمین خود اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد اسے موسمی بخار قرار دیا اور دوا لکھ دی لیکن اگلی صبح تک اظفر کا بخار کم ہونے کی بجائے کچھ اور تیز ہوگیا۔ وہ سخت بے چینی محسوس کر رہا تھا اور اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ فیضو اور یاسمین گھبرا گئے اور وہ اس کو اسی وقت ایک جاننے والے اسپیشلسٹ کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا، لیکن وہ فوری طور پر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اس نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے اور کہا کہ وہ فوراً کروالئے جائیں۔ اس نے وقتی طور پر بخار کم کرنے کی کچھ دوائیں دے دیں۔

لیکن شام تک اظفر کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی۔ فیضو آج جلد ہی دفتر سے گھر آ گیا تھا۔ وہ اظفر کی وجہ سے پریشان تھا۔ شام کو اظفر کی حالت کچھ عجیب سی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت کا سا تاثر تھا اور چہرہ بری طرح تمتما رہا تھا۔ فیضو اور یاسمین کو اس کا چہرہ دیکھ کر ڈر سا لگنے لگا۔ بخار بالکل کم نہیں ہوا تھا بلکہ اور بڑھ گیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے بیٹا؟'' یاسمین نے اس کا سر سہلاتے ہوئے تشویش کے ساتھ پوچھا۔ فیضو پاس ہی موجود تھا۔

''اماں..... وہاں پھر سے درد ہو رہا ہے جہاں شاید کتے کا دانت لگا تھا۔''

''کیا؟'' فیضو بدحواس ہو کر چلایا۔ ''کتے کا دانت؟ کیا تم کو کتے نے کاٹ لیا تھا؟ مگر تم نے بتایا نہیں؟'' فیضو کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ہاں ابا۔'' اظفر نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ان لوگوں نے مجھے لے جانے کے بعد جب گاڑی سے اتارا تھا تو ایک کتا مجھ پر جھپٹ پڑا تھا لیکن اس نے مجھے زیادہ نہیں کاٹا تھا۔ اس نے میری پتلون نوچ لی تھی اور اس کا ایک دانت ذرا سا میری ٹانگ میں لگ گیا تھا۔ مجھے تو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوئی۔ مگر پھر بھی ان لوگوں نے مجھے انجکشن لگوائے تھے۔''

''مگر تم نے تم نے بتایا کیوں نہیں؟'' یاسمین نے لرز کر پوچھا۔

''میں بھول گیا اماں۔ آپ لوگ خود بھی تو کہتے تھے کہ میں وہاں کی ساری باتوں کو بھول جاؤں۔ پہلے تو وہاں درد بھی نہیں ہوا تھا مگر اب وہ جگہ دُکھ رہی ہے۔''

فیضو اظفر کی باتیں سن رہا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا زمین اس کے پیروں کے نیچے سے سرک رہی ہے اور آسمان اس کے اوپر پھٹا پڑ رہا ہے، ہزاروں بجلیاں جو کڑ کڑا رہی ہیں اور اس کے وجود کو خاکستر کر دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہ کیسا عذاب تھا..... کیسا عذاب تھا۔

☆======☆======☆

''بہت ہوگیا کمالو۔'' اصغری نے کمالو کے خشک اور روکھے بالوں میں ناریل کے تیل کی مالش کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تم لوگ یہ سارے دھندے چھوڑ دو۔ مجھے ہر وقت تم لوگوں کی جان کی فکر لگی رہتی ہے۔''

''ہماری جان کو کیا ہوگیا ہے؟'' کمالو نے ہنس کر کہا۔ ''اچھے خاصے ہٹے کٹے تو تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو کمالو۔'' اصغری نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''جس راہ پر تم لوگ چل رہے ہو، اس میں موت تمہارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ کسی بھی وقت پولیس کی کوئی گولی یا تمہارے کسی دشمن کی کوئی گولی خدانہ کرے تمہارا کام تمام کرسکتی ہے اور بس۔ پھر سب کچھ ختم۔ پھر میں کیا کروں گی؟ میرے دونوں بچے کیا کریں گے؟ کبھی تم لوگوں نے اس بارے میں سوچا ہے؟ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بندہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کی طاقت گھٹتی جاتی ہے۔ پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا اور جوان لوگ اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کمالو اس وقت کے آنے سے پہلے ہی خود یہ دھندہ چھوڑ دو۔''

''آپا ٹھیک کہتی ہیں کمالو بھائی۔'' کمالو کے سالے شکور نے، جو قریب ہی موجود تھا اپنی بہن کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں خود بھی یہی سوچتا ہوں اس طرح کی زندگی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''تم بھی؟'' کمالو نے شکور کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی یہ بات کہہ

رہے ہو؟''

''ہاں کمالو بھائی۔'' شکور نے جو کمالو کے ساتھیوں میں سے ایک تھا' کہا۔''اب اس سلسلے کو بند ہو جانا چاہئے۔ایسا کرو کمالو بھائی' کوئی آخری ہاتھ مارو.....لمبا اور شاندار ہاتھ۔ایک ہی بار اتنا مال مل جائے کہ پھر زندگی بھر کچھ کرنے کی ضرورت نہ رہے۔''

''مال تو تم لوگوں کے پاس اب بھی کم نہیں ہے۔'' اصغری نے کہا۔''زیادہ لالچ نہ کرو۔ کوئی سیدھا سادا سا کاروبار شروع کردو اللہ برکت دے گا۔حرام کے دھندوں میں برکت نہیں ہوتی' بس ختم کردو یہ سب کچھ۔مجھے اب بہت ڈر لگنے لگا ہے۔۔ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں۔''

کمالو کی بیوی اصغری اپنے دو بچوں کے ساتھ عزیز آباد میں رہتی تھی۔کمال الدین عرف کمالو اس کے پاس گاہے بگاہے آتا رہتا تھا۔وہ زیادہ تر وقت ''دھندے'' میں مصروف رہتا تھا اور پچھلے کئی برسوں سے اس مکان میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ رہ رہا تھا جو اسے فیضو نے فراہم کیا تھا۔اصغری کا بھائی شکور بھی اس کے ساتھیوں میں سے ایک تھا اور اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

اصغری اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا شوہر اور بھائی' دونوں بدمعاشی کے دھندوں میں ملوث ہیں اور خوب کما رہے ہیں لیکن وہ ان دھندوں کے انجام سے بہت ڈرتی تھی اور اپنے شوہر اور بھائی پر زور دیتی رہتی تھی کہ وہ جرائم کی دنیا سے الگ ہو جائیں۔اسے یقین تھا کہ اس کا انجام کسی بھی دن ایک دردناک موت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ہوگا تو پھر وہ کیا کرے گی' اس کے بچے کیا کریں گے؟

اس روز جب شکور نے بھی اپنی بہن کی تائید کی تو کمالو کو زندگی میں پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ شاید کہیں کچھ غلط ہے جسے صحیح کرنے کی ضرورت ہے۔عمر تو ڈھل رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی جسمانی طاقت اور توانائی بھی کم ہونا تھی۔آگے کیا ہونے والا تھا.....کون جانے۔گاہکوں کا کیا ہے' وہ تو مال کے لیے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔جب مال خراب ہونے لگے تو وہ دوسرا مال خرید لیں گے۔مارکیٹ میں مال کی کمی تو نہیں ہے۔

اس روز اس نے خود ہی تنہائی میں اپنے سالے اور خاص الخاص ساتھی شکور سے اس معاملے کے بارے میں بات کی۔

''بس کوئی آخری اور لمبا ہاتھ مار لو کمالو بھائی۔'' شکور نے کہا۔''اور اس کے بعد سے یہ دھندہ ہمیشہ کے لیے ختم۔ہر وقت گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالے رکھنے کی ضرورت نہیں رہے

گی۔ہم لوگ کراچی سے کہیں اور چلے جائیں گے۔بس کسی طرح ایک کروڑ کے لگ بھگ رقم مل جائے خرچہ وغیرہ نکال کر آپس میں بانٹ لیں گے۔پھر عیش کریں گے۔''

''مگر اتنا لمبا ہاتھ کہاں مارا جائے؟'' کمالو نے پُرخیال انداز میں کہا۔''یہ کوئی معمولی رقم تو نہیں ہے' بہت بڑی رقم ہے۔''

''یقیناً بہت بڑی رقم ہے کمالو بھائی' مگر ہمارے لیے.....ان لوگوں کے لیے تو بڑی رقم نہیں ہے جو ایک ایک کروڑ روپے ایک جھٹکے میں کما لیتے ہیں۔''

''سوچنا پڑے گا۔'' کمالو نے کہا۔''ہمیں ایسا کیا کرنا چاہئے کہ اتنی بڑی رقم ہاتھ لگ جائے۔''

''میں نے پہلے ہی سوچ لیا ہے کمالو بھائی۔'' شکور نے دھیمی آواز میں کہا۔''بہت موٹی اسامی تاڑی ہے میں نے.....اس کے لیے ایک کروڑ روپے تو کچھ بھی نہیں ہیں۔وہ کمینہ ایک کروڑ روپے کا نقصان تو بس چند دن میں پورا کر لے گا۔''

''کون؟'' کمالو نے چونک کر کہا۔

اور جب شکور نے اسے نام بتایا تو کمالو چند لمحوں کے لیے جیسے حواس باختہ ہو گیا' لیکن جیسے جیسے شکور اپنی بات کی وضاحت کرتا گیا ویسے ویسے کمالو کو یقین آتا گیا کہ اس سے زیادہ عمدہ نشانہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

''وہ اپنے نواسے کی جان بچانے کے لیے سب کچھ دے سکتا ہے۔'' شکور نے کہا۔''ہم سب کچھ تو نہیں مانگ رہے ہیں۔جو کچھ اس کے پاس ہے' بس اس کا بالکل ذرا سا حصہ مانگ رہے ہیں۔اور وہ تو ادب پتی ہے کمالو بھائی۔وہ دے گا اور خوشی سے دے گا اور چار دن میں اپنے اس نقصان کو پورا بھی کر لے گا۔سچ پوچھو تو اس کا تو کوئی نقصان ہی نہیں ہوگا۔''

وہ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور اس دوران انہوں نے ایک مکمل منصوبہ تیار کر لیا۔اگلے چند دن تک شکور نے خود بڑی خاموشی اور احتیاط کے ساتھ فیضو کے گھر کی نگرانی کی اور اس کے نواسے کے معمولات کا اچھی طرح جائزہ لے لیا۔جگہ وغیرہ کا بھی بندوبست کر لیا گیا تھا جہاں لے جا کر اظفر کو رکھنا تھا۔

''وہ تم کو ضرور بتائے گا کمالو بھائی۔'' شکور نے کہا۔''بس اس کو روکے رکھنا کہ پولیس کو بیچ میں نہ ڈالے۔''

''وہ ایسا نہیں کرے گا۔'' کمالو نے کہا۔''وہ پولیس کو بیچ میں نہیں ڈالے گا۔اگرچہ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں' لیکن یہ اس کے نواسے کی جان کا معاملہ ہے اور اس کی اپنی

جان اپنے نواسے کی جان میں ہے۔"

اس کے بعد اظفر کے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ کمالو اس سے پہلے بھی بہت سارے لوگوں کے ساتھ کر چکا تھا۔ فرق یہ تھا کہ آج وہ یہ کام فیضو یا کسی اور کے حکم پر نہیں' بلکہ خود اپنے حکم پر کر رہا تھا۔

کارروائی میں حصہ لینے والے کمالو کے خاص اور قریبی لوگ تھے جنہوں نے شکور کی نگرانی میں یہ کام انجام دیا۔ سب کچھ بڑی آسانی سے ہو گیا۔ اظفر اور اس کے ڈرائیور کو گاڑی میں بٹھا لیا گیا اور پھر ڈرائیور کو چھوڑ دیا گیا۔ گاڑی کو ایک دوسری ویران جگہ پر چھوڑ دیا گیا۔ اظفر کو اس جگہ لے جایا گیا جو پہلے سے طے تھی۔

اظفر کو گاڑی میں سے اتار کر گھر کے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ ایک آدمی اس کی کمر سے ریوالور کی نال لگائے ہوئے اس کی ساتھ چل رہا تھا اور اس نے اظفر کو دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر اس نے ذرا سا بھی شور مچایا تو اس کو فوراً گولی مار دی جائے گی۔ بچہ سہم کر خاموش ہو گیا تھا۔

اظفر ابھی دروازے کی طرف چند قدم ہی بڑھا تھا کہ ایک طرف سے ایک بڑا سا کتا دوڑتا ہوا آیا اور اظفر کی ٹانگ پر حملہ آور ہوا۔ اظفر کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس کے ساتھ موجود آدمی نے پوری قوت کے ساتھ ایک لات کتے کے رسید کی۔ کتا عجیب سے انداز میں بھاگتا ہوا وہاں سے دوسری طرف چلا گیا۔

وہ لوگ جلدی سے گھر کے اندر آ گئے۔ اظفر کی ٹانگ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ کتے نے اس کی پتلون کا پائنچا پھاڑ دیا تھا اور کتے کا ایک دانت بہت ہلکا سا اظفر کی پنڈلی پر لگا تھا۔

"چلو شکر ہے' تم بچ گئے۔" بندوق بردار نے مسکراتے ہوئے اظفر سے کہا۔ "بالکل معمولی سا چھل گیا ہے' ٹھیک ہو جائے گا۔"

اظفر کو کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ بہت زیادہ سہما ہوا تھا۔ ایک تو نہ جانے کن لوگوں نے اس کو پکڑ لیا تھا اور اس کے ساتھ خدا جانے کیا کرنے والے تھے اور دوسرا کتے نے بھی اسے کاٹ لیا تھا۔ وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

"نہیں' نہیں تم روؤ مت۔" اس آدمی نے اس کو تسلی دی۔ "ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ صرف چند دن کی بات ہے' پھر تم کو تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔"

ذرا دیر بعد شکور نے ایک آدمی کے علاوہ باقی تمام لوگوں کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ اس آدمی کا نام شہاب تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی اظفر کی جگہ تبدیل کر دی گئی۔ اسے

گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے دور ایک ایسے مکان میں پہنچا دیا گیا جس کا علم کمالو' شکور اور شہاب کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا اور یہ ذمہ داری شکور اور شہاب کی تھی کہ وہ بچے کی مناسب طور پر دیکھ بھال کرتے رہیں۔

کام پورا ہونے کے بعد شکور نے جب کمالو کو اس بے حد آسان کامیابی کی اطلاع دی تو وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا۔

"سونے کی چڑیا ہمارے قبضے میں آ گئی ہے کمالو بھائی۔ بس اب اُڑنے نہ پائے۔" اس نے اظفر پر کتے کے حملے کا واقعہ بھی کمالو کو سنا دیا۔

کمالو چونک پڑا۔ "اچھا' تو دانت لگ گیا ہے؟ ہو سکتا ہے' کتا پاگل ہو' لڑکے کو انجکشن لگوانا ضروری ہے۔ ہم اسے کم از کم ہفتہ دس دن تک اپنے قبضے میں رکھیں گے تاکہ فیضان علی زیادہ سے زیادہ مایوس ہو جائے اور دباؤ کا شکار ہو جائے۔ میں اس دوران اس کو یہی دم دلاسہ دیتا رہوں گا کہ میں اغوا کرنے والوں کا پتہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"انجکشن تو مجھے لگانا آتا ہے اور میں لگا سکتا ہوں۔" شکور نے کہا۔ "میں نے ایک زمانے میں کتنے ہی ہیروئنچیوں کو انجکشن لگائے ہیں لیکن اس کی ضرورت کیا ہے؟ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ وہ کتا پاگل ہی ہو اور پھر ہم بچے سے کہہ دیں گے کہ گھر واپس جا کر اپنے نانا نانی کو بتا دے کہ اسے کتے نے کاٹ لیا تھا اور وہ خود ہی اس کے انجکشن لگوا دیں گے۔"

"نہیں شکور۔" کمالو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اس کے انجکشن تم خود ہی لگا دو۔ دیر ہونے کی صورت میں خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم ابھی ٹھیک سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں کب تک اس کو اپنے قبضے میں رکھنا ہو گا۔ ہم بچے کے دشمن تو نہیں ہیں۔ تم بازار سے کتا کاٹے کے انجکشن خرید لو۔ کئی ہزار روپے کے ملیں گے۔ ظاہر ہے کہ ہم اسے اسپتال تو نہیں لے جا سکتے۔ دکاندار خود ہی بتا دے گا کہ کس حساب سے لگانے ہیں۔ یہ ضروری ہے۔"

شکور نے کمالو کی ہدایت پوری طرح عمل کیا اور وہ اس علاقے سے بہت دور ایک بالکل دوسرے علاقے سے اینٹی ریبیز ویکسین انجکشن خرید لایا۔ دکاندار نے اس کو ان کے لگانے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ اس نے اظفر کو انجکشن لگانا شروع کر دیئے۔ اظفر خوفزدہ تھا لیکن شکور نے اس کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ یہ کتا کاٹے کے انجکشن ہیں اور اس لیے لگائے جا رہے ہیں تاکہ اس کو آئندہ کوئی تکلیف نہ ہو۔ تکلیف تو اظفر کو اس وقت بھی کوئی خاص نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو اس بات کو جیسے بھول ہی چکا تھا۔

سب کچھ کمالو کے منصوبے اور توقعات کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ اظفر کے اغوا کے بعد

فیضو نے سب سے پہلے کمالو ہی سے بات کی تھی اور اس کے بعد وہ ایک ایک بات اس کو بتاتا رہا تھا۔ کمالو اس کو یقین دلا رہا تھا کہ اس گروہ کی تلاش میں لگا ہوا ہے۔ فیضو جو کچھ بھی کر رہا تھا' اس کے بارے میں کمالو سے زیادہ اور کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد کمالو نے فیضو کے نام وہ خط بھجوایا جس میں آج سے چوتھے دن ایک کروڑ زرِ تاوان ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور گفت وشنید کی کوئی راہ نہیں رکھی گئی تھی۔ فیضو نے اس خط کے ملنے کے فوراً ہی بعد کمالو سے رابطہ قائم کیا اور اسے اس کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ کہا کہ وہ اغوا کنندگان کو دینے کے لیے رقم کا بندوبست کرے گا۔

کمالو شکور کو ساری صورتِ حال سے واقف رکھے ہوئے تھا اور دونوں اپنے آئندہ اقدامات کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ شکور نے اظفر کو انجکشن بھی لگا دیئے تھے۔

سب کچھ کمالو کے منصوبے کے عین مطابق ہوا۔ کہیں ذرا سی بھی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ فیضو ایک کروڑ روپے کی رقم لے کر آ گیا اور شکور نے وہ رقم وصول کر لی۔ اس کے ایک گھنٹے کے بعد حسب وعدہ اظفر کو بحفاظت گھر پہنچا دیا گیا۔

''یہ سب کچھ کس قدر آسان ثابت ہوا کمالو بھائی۔'' شکور نے فرطِ مسرت سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بھی تو مشکل پیش نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک کروڑ روپے تو ہمارے انتظار میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔'' وہ زور سے ہنسا۔

''بس' آخری ہاتھ مار لیا اور اب قصہ ختم۔'' کمالو نے کہا۔ ''قبل اس کے کہ فیضان علی میرے ذمے کوئی کام لگائے' ہم لوگ کراچی چھوڑ دیں گے۔ فیضان علی کو اپنے کام کے لیے دوسرے کئی لوگ مل جائیں گے۔''

☆======☆======☆

''ان لوگوں نے تمہیں انجکشن لگوائے تھے؟'' فیضو کی آواز بدستور کانپ رہی تھی۔ ''بیٹا' تم کو کچھ یاد ہے' کیا تم اس انجکشن کا نام جانتے ہو؟ کیا تمہیں شیشی یا ڈبی کا رنگ وغیرہ کچھ یاد ہے؟ کوئی بھی بات جو تم اس انجکشن کے بارے میں جانتے ہو؟''

''اس کا ایک خالی ڈبہ اس آدمی نے میری پھٹی ہوئی پینٹ کی جیب میں رکھ دیا تھا شاید۔'' اظفر نے غنودگی کے عالم میں کمزور آواز میں کہا۔ ''میں نے اسے دیکھا نہیں۔ پھٹی ہوئی پینٹ اور شرٹ تو انہوں نے ایک بیگ میں ڈال کر مجھے واپس کر دی تھی۔ میں ساتھ لے آیا تھا۔ انہوں نے مجھے دوسرے کپڑے لے کر دے دیئے تھے۔''

''کہاں ہے؟ کدھر ہے؟'' فیضو یاسمین سے مخاطب ہو کر بدحواسی کے عالم میں چلایا۔

''باتھ روم میں ڈریسر میں میلے کپڑوں کی باسکٹ میں پڑی ہوئی ہوگی شاید۔'' یاسمین تیر کی طرح اظفر کے کمرے کے باتھ روم کی طرف دوڑی۔

''پہلے تو میں اسے پھینکوانے والی تھی۔ پھر میں نے پڑا رہنے دیا کہ شاید کبھی تفتیش کے دوران اس کی ضرورت پڑ جائے۔''

یاسمین کی آواز ہلکی ہو کر غائب ہوتی جا رہی تھی اور پھر وہ باتھ روم میں جا کر بالکل غائب ہو گئی۔ ایک منٹ کے بعد وہ پلاسٹک کا ایک بیگ لیے ہوئے باتھ روم سے باہر آ گئی۔ یہ وہی بیگ تھا جو اظفر اپنے بستے کے علاوہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ فیضو نے وہ بیگ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اس میں سے اظفر کی پتلون کھینچ کر نکالی۔ پتلون کا دایاں پائنچہ پنڈلی کے پاس سے نچا ہوا تھا۔ فیضو نے تیزی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں سے اسے تڑا مڑا سا انجکشن کا ایک گتے کا ڈبہ ملا۔ اس نے اس پر آنکھیں گاڑ دیں۔

یہ ایک مہنگی امپورٹیڈ اینٹی ریبیز ویکسین کے انجکشن کا ڈبہ تھا۔ یہ ویکسین صرف باہر ہی نہیں بنتی تھی۔ یہ پاکستان میں بھی بنتی تھی! اور فیضو کی کمپنی اسے بناتی تھی۔ جعلی' نقلی ویکسین ..... جس کی شیشی' پیکنگ' ڈبہ' لیبل' ہر چیز بالکل اصلی کی طرح تھی۔ سرِ مُو کوئی فرق نہیں تھا' سوائے اس کے کہ اس شیشی کے اندر جو دوا تھی' وہ نقلی تھی۔

اور اگر اس انجکشن لگنے کے بعد بھی اظفر ہائیڈروفوبیا کا شکار ہو گیا تھا تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ اسے جو ویکسین دی گئی وہ اصلی نہیں تھی' جعلی تھی۔ اور اسے یہ ویکسین دینے والے اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے۔

فیضو تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔ وہ دوسرے کمرے میں فون کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یاسمین نے دہشت زدہ آواز میں فیضو سے پوچھا۔ ''کیا..... کیا..... اس کو پاگل کتے نے کاٹا ہے؟''

''ہاں!'' فیضو کی آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔ ''اس کو پاگل کتے نے کاٹا ہے۔ اغوا کرنے والوں نے اس کو انجکشن لگوا دیئے تھے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ انجکشن ٹھیک نہیں تھے۔''

''تو..... تو..... پھر؟'' خوف ودہشت کے عالم میں یاسمین کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس پر ہائیڈروفوبیا کا اثر ہو رہا ہے۔'' فیضو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''خدا خیر کرے..... خدا کرے میں غلط سمجھ رہا ہوں۔ میں ابھی ڈاکٹر سکندر کو فون کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر سکندر ایک نامی گرامی فزیشن تھا۔ اس نے اپنا ایک ذاتی کلینک قائم کر رکھا تھا۔ جس میں طرح طرح کے ٹیسٹوں کا بندوبست تھا۔ یہاں آنے والے مریضوں کو پہلے ٹیسٹوں کے ایک طویل، غیر ضروری اور مکارانہ جال سے گزارا جاتا تھا اور ان ٹیسٹوں کی مد میں ان سے ہزاروں روپے لوٹ لیے جاتے تھے۔ اس کے بعد معمولی معمولی تکالیف کے لیے نہایت مہنگی دوائیں تجویز کی جاتی تھیں۔ جن کے عوض ڈاکٹر سکندر کو بھاری کمیشن ملتا تھا۔ فیضو نے ابھی پچھلے ہی دنوں ڈاکٹر سکندر کو اس کی بیوی کے ساتھ شاپنگ کے لیے دبئی بھیجا تھا۔ ڈاکٹر سکندر کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ فیضو نے ڈاکٹر سکندر کو فون کر کے اظفر کا مختصر حال بتایا اور کہا کہ وہ اس کو لے کر فوراً اس کے کلینک آ رہا ہے۔

فیضو اور یاسمین اسی وقت اظفر کو لے کر ڈاکٹر سکندر کے کلینک روانہ ہو گئے۔ اظفر کی حالت میں کوئی بہتری پیدا ہونے کی بجائے مزید خرابی نمودار ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی تھی۔ چہرہ کچھ زیادہ ہی تمتما رہا تھا اور اس کے خدوخال مسخ ہوتے جا رہے تھے۔ ایک عجیب سا غیر انسانی تاثر اس کے چہرے پر پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ فیضو اس کو دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر مرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر ہر چیز ٹوٹتی چلی جا رہی ہے، ٹوٹ پھوٹ کا ایک عمل ہے جس نے اس کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

''اغوا کرنے والوں نے تو اس کی زندگی بچانے کی کوشش کی۔'' وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ''انہوں نے اس کو کتا کاٹے کے انجکشن لگوا دیئے۔ بازار سے مہنگی ویکسین خرید کر، جو ان کی نظر میں یقیناً اصلی ویکسین تھی، اور انہوں نے ویکسین کا خالی ڈبہ بھی ساتھ بھیج دیا تھا تاکہ گھر والوں کو معلوم رہے کہ بچے کو ویکسین لگوائی جا چکی ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں ہے..... مگر..... مگر..... وہ ویکسین..... وہ ویکسین.....'' وہ چلا چلا کر رونا چاہتا تھا۔

''آپ کو تو معلوم ہے ڈاکٹر صاحب، پچھلے دنوں اظفر کو اغوا کر لیا گیا تھا۔'' فیضو نے جلدی جلدی بولتے ہوئے ڈاکٹر سکندر کو بتایا۔ ''اغوا کے عمل کے دوران اسے ایک آوارہ کتے نے کاٹ لیا تھا۔ اظفر کا کہنا ہے کہ ان لوگوں نے اس کو انجکشن لگوا دیئے تھے مگر..... مگر.....''

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

ڈاکٹر سکندر نے فوراً ہی اظفر کا معائنہ کیا اور اس سے کئی سوالات بھی پوچھے۔ اس نے اچھی طرح سے مریض کا جائزہ لیا۔ اظفر سے اب ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا اور وہ رک رک کر اور اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

''آیئے میرے ساتھ۔'' ڈاکٹر سکندر مریض کو کمرے میں جونیئر ڈاکٹروں کے ساتھ

چھوڑ کر فیضو اور یاسمین کے ساتھ باہر آیا۔

''آئی ایم سوری فیضان صاحب۔'' ڈاکٹر سکندر نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بالکل واضح طور پر ہائیڈروفوبیا کا کیس ہے۔ ساری علامات اسی کی ہیں۔ اس جگہ پر درد رہتا ہے جہاں کتے نے کاٹا تھا اور جسے وہ بھول بھی چکا تھا۔ اس کو تیز بخار ہے جو اینٹی بایوٹک سے کم نہیں ہوا۔ ریبیز کا وائرس اس کے جسم میں سرایت کر چکا ہے اور ایکٹو ہو گیا ہے۔''

''مگر اس کے اینٹی ریبیز انجکشن لگا تھا ڈاکٹر صاحب۔'' یاسمین نے روتے ہوئے کہا۔ ''اس نے خود بتایا کہ ان لوگوں نے اسے انجکشن لگوائے تھے بلکہ انہوں نے خالی ڈبہ بھی اس کے ساتھ ہی بھیج دیا تھا۔''

''پھر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔'' ڈاکٹر سکندر نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''یا تو وہ ویکسین ایکسپائرڈ تھی اور یا پھر جعلی تھی۔''

''ج ج ج جعلی؟'' یاسمین کی آواز بری طرح لرزنے لگی۔ ''کیا کتا کاٹے کی جعلی ویکسین بھی بنتی ہے؟''

''میں اس بارے میں یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں جانتا۔'' ڈاکٹر سکندر نے محتاط انداز میں کہا۔ ''لیکن موجودہ صورتِ حال میں بس دو یہی امکانات ہو سکتے ہیں۔''

فیضو کا چہرہ کسی مُردے کی طرح بے جان ہو رہا تھا۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر سکندر نے توثیق کر دی تھی کہ اظفر ہائیڈروفوبیا کا شکار ہو چکا ہے۔

''پھر..... پھر..... اب کیا ہو گا ڈاکٹر صاحب؟'' یاسمین نے تڑپ کر کہا۔ ''جلدی سے اس کو اصلی ویکسین کے انجکشن دے دیجیے۔''

''اس سے اب شاید ہی فائدہ ہو۔'' ڈاکٹر سکندر نے محتاط انداز میں کہا۔ ''ریبیز کا وائرس ایک بار ایکٹو ہو جائے تو پھر اس کی روک تھام نہیں کی جا سکتی۔ پھر اس بات پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے کہ مریض کسی دوسرے شخص کو یہ وائرس منتقل نہ کر سکے۔ ویسے فیضان علی صاحب تو خود دس ڈاکٹروں کے ایک ڈاکٹر ہیں۔ وہ یہ ساری باتیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''تو اب کیا ہو گا ڈاکٹر صاحب؟'' یاسمین نے روتے ہوئے کہا۔

''ہم اظفر کو یہاں رکھ کر اس کا علاج کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں، مگر یہاں ہمارے پاس قرنطینہ کا مکمل اور معقول بندوبست موجود نہیں ہے۔'' ڈاکٹر سکندر نے کہا۔ ''میرے خیال

میں اس کو وائرل ڈیزیز کے کسی ماہر کے پاس لے جانا بہتر ہوگا وہ اسے قرنطینہ میں رکھ کر.....''

''قرنطینہ میں؟'' یاسمین نے زار وقطار روتے ہوئے کہا۔''تو کیا اس کو بالکل الگ تھلگ کر کے رکھا جائے گا؟''

''جی ہاں!'' ڈاکٹر سکندر نے کہا۔''بالکل الگ تھلگ.....مکمل آئی سولیشن میں.....اور اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھنا ہوگا کہ وہ کسی شخص کو کاٹے نہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' یاسمین کے رونے میں اور زیادہ شدت پیدا ہوگئی۔''کیا وہ.....کیا پاگل ہو رہا ہے؟''

''اس کی حالت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے' لیکن بہر حال محتاط رہنا بہت ضروری ہے۔'' ڈاکٹر سکندر کوئی قطعی بات کہنے سے گریز کر رہا تھا۔''بہر حال آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ بچے کو فوری طور پر ڈاکٹر مسعودہ کے پاس لے جائیں۔وہ وائرل انفیکشن ڈیزیز کی بہت بڑی اسپیشلسٹ ہیں۔انہیں دکھایئے۔۔دیکھئے وہ کیا کہتی ہیں۔آپ چاہیں تو میں انہیں فون کر دیتا ہوں۔یہ ایمرجنسی کیس ہے۔وہ جہاں کہیں بھی ہوں گی' اپنے کلینک میں پہنچ جائیں گی۔میں جانتا ہوں وہ ایمرجنسی کیسز پر بہت زیادہ توجہ دیتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' فیضو نے کہا۔''آپ انہیں فون کر دیجئے۔۔ہم اظفر کو ابھی ان کے پاس لے جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر سکندر نے اسی وقت ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کو فون کیا۔''ہاں ڈاکٹر میں ڈاکٹر سکندر بول رہا ہوں.....ڈاکٹر صاحب.....یہ ایک ہائیڈروفوبیا کا کیس ہے.....جی۔وہ ہیں.....مسٹر فیضان علی.....جی ہاں' جی ہاں وہی.....فارما سیوٹیکل کمپنی کے مالک.....جی ہاں۔ان کا نواسا ہے.....جی۔بچے کو ویکسین تو لگی تھی.....اور وقت پر لگی تھی.....لیکن اس کے باوجود بھی.....آپ پہنچ رہی ہیں۔تھینک یو.....میں فیضان علی صاحب کو آپ کے کلینک میں بھیج رہا ہوں بہت بہت شکریہ۔'' فون بند کر کے ڈاکٹر سکندر فیضو سے مخاطب ہوا۔''ڈاکٹر مسعودہ اس وقت اپنے کلینک میں نہیں ہیں' لیکن چونکہ یہ ایک ایمرجنسی کیس ہے' اس لیے وہ وہاں پہنچ رہی ہیں۔آپ مریض کو فوراً ان کے کلینک لے جایئے۔''

فیضو اور یاسمین اظفر کو لے کر فوراً ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کے کلینک کی طرف روانہ ہو گئے۔فیضو کی اگرچہ ڈاکٹر مسعودہ لاشاری سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی' لیکن وہ اس ڈاکٹر سے غائبانہ طور پر خوب واقف تھا۔اس کا شوہر علی نواز لاشاری کسی بینک کا اعلیٰ عہدیدار تھا۔ ڈاکٹر مسعودہ وائرل انفیکشن ڈیزیز کی اسپیشلسٹ تھی۔اس نے کئی سال ملک سے باہر

گزارے تھے اور میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کا اگرچہ اپنا ذاتی کلینک بھی تھا تاہم وہ ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال کے علاوہ شہر کے کئی اسپتالوں سے وابستہ تھی۔وہ صرف ان بیماریوں کا علاج کرتی تھی جو انفیکشن اور وائرس سے پیدا ہوتی تھیں اور ان میں پاگل کتے کے کاٹنے سے پیدا ہونے والی بیماریاں بھی شامل تھیں۔

فیضو ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کی غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت سے بخوبی واقف تھا اور اس کا معترف بھی تھا لیکن اس نے کبھی ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کو پسند نہیں کیا تھا' اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر مسعودہ لاشاری نے فیضو کے اس نیٹ ورک کا حصہ بننے سے ہمیشہ انکار کیا تھا اور وہ اس کی کھل کر مذمت کرتی تھی جس میں فیضو نے بہت سارے بڑے بڑے ڈاکٹروں' اعلیٰ سرکاری حکام' وزیروں اور سیاست دانوں وغیرہ کو شامل کر رکھا تھا اور جن کے ساتھ مل کر وہ خود دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹتا تھا اور انہیں بھی ان کا حصہ دیتا تھا۔ڈاکٹروں سے وہ اپنی دواؤں کے سیلز مینوں کا سا کام لیتا تھا۔کچھ ڈاکٹرز ایسے بھی تھے جو اس کی ترغیبات کو مسترد کرتے ہوئے اس کی کمپنی کی بنائی ہوئی دوائیں تجویز کرنے سے گریز کرتے تھے۔

ڈاکٹر مسعودہ لاشاری بھی انہی میں سے ایک تھی۔فیضو نے متعدد بار اپنے دکانداروں اور کئی دوسرے ڈاکٹروں کے ذریعے ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کو اپنے نیٹ ورک میں شامل کرنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر مسعودہ لاشاری نے اس کی آلہ کار بننے سے صاف انکار کر دیا۔ڈاکٹر مسعودہ لاشاری ایک خاص فیلڈ کی اسپیشلسٹ تھی اور ایک بہت کامیاب ڈاکٹر تھی۔اس کے پاس اندرون ملک اور خاص طور سے سندھ سے بہت سے مریض آیا کرتے تھے۔فیضو چاہتا تھا کہ ڈاکٹر مسعودہ لاشاری اس کی کمپنی کی تیار کردہ دواؤں کی ترویج میں اس کا ساتھ دے اور اپنا کمیشن لے' لیکن ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کو رام کرنے میں اسے ناکامی ہوئی۔

اور آج قسمت اس کو ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کے دروازے پر لے جا رہی تھی' جسے اس نے کبھی بھی پسند نہیں کیا تھا لیکن اس وقت اسے ڈاکٹر مسعودہ لاشاری دنیا کی سب سے پیاری شخصیت لگ رہی تھی۔وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈاکٹر مسعودہ لاشاری ایک ایسی انسان ہے جس پر مکمل بھروسا کیا جاسکتا ہے۔۔اور وہ اس کے لیے ایک آخری امید کی حیثیت رکھتی تھی۔

فیضو اور یاسمین اپنے پیارے نواسے کو لئے ہوئے بھاگم بھاگ ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کے کلینک پہنچے۔ڈاکٹر مسعودہ لاشاری اس وقت اپنے کلینک میں آچکی تھی اور ان لوگوں کا

انتظار کر رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی مریض کو کمرے میں پہنچوایا اور اپنی ٹیم کے ساتھ اس کے تفصیلی معائنے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے فیضو اور یاسمین کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور انہیں کمرے سے باہر رکنے کی تاکید کی۔ وہ فوری توجہ مریض پر دینا چاہتی تھی۔

فیضو نے اس روز پہلی بار ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کو دیکھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ عورت تھی اور پُر وقار اور دلکش شخصیت کی حامل تھی۔ اس کے انداز میں بڑی مستعدی اور ایک قسم کی اضطرابی کیفیت تھی۔ وہ مریض کے بارے میں سب کچھ جلد سے جلد جان لینا چاہتی تھی لیکن اس نے فیضو اور یاسمین سے کوئی سوال نہیں پوچھا بلکہ مریض کو سیدھا کمرے میں لے جا کر اس کے معائنے میں لگ گئی۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے نکل کر آئی۔ اس کے چہرے کے نقوش بہت سخت نظر آ رہے تھے

''آپ کا نواسا ہائیڈروفوبیا کا شکار ہو چکا ہے فیضو بھائی۔'' ڈاکٹر مسعودہ نے فیضو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ فیضو کو تو یہ بات پہلے سے معلوم تھی کیونکہ ڈاکٹر سکندر اسے بتا چکا تھا۔ اس لیے اسے اس خبر سے کوئی جھٹکا نہیں لگا لیکن..... لیکن ''فیضو بھائی؟'' یہ عورت کون تھی؟

''فیضو بھائی؟'' فیضان علی کی زبان سے سخت حیرت کے عالم میں یہ الفاظ نکلے۔

''جی فیضو بھائی۔'' ڈاکٹر مسعودہ لاشاری نے اس کو آگے بولنے سے روک دیا۔ اس وقت اسٹاف کے دوسرے لوگ بھی پاس آ چکے تھے۔ ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں.....'' ڈاکٹر مسعودہ لاشاری سارے لوگوں کی موجودگی میں اپنا تعارف کروا رہی تھی۔ ''میں مسعودہ ہوں..... شوکت حسین سبزی فروش اور شمسن کی بیٹی، شاکرہ کی چھوٹی بہن..... گجر نالے اور اس کے بعد سعود آباد کے کواٹروں میں ہم لوگ ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔''

فیضو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ تو یہ مسعودہ تھی۔ شاکرہ کی چھوٹی بہن جو اس زمانے میں میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی جب فیضو اپنی دادی کے ساتھ سعود آباد میں رہتا تھا۔

''تم..... تم..... آپ..... مسعودہ ہیں؟'' فیضو کی آواز میں ناہمواری تھی۔

''جی ہاں فیضو بھائی۔'' مسعودہ نے کہا۔ ''میں مسعودہ ہوں..... اور میں تو آپ کو اچھی طرح سے جانتی پہچانتی ہوں، آیئے، میرے کمرے میں آیئے۔''

ڈاکٹر مسعودہ فیضو اور یاسمین کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ یاسمین حیرت سے آنکھیں پھاڑے ہوئے یہ عجیب و غریب باتیں سن رہی تھی۔ ڈاکٹر مسعودہ گجر نالے کی جھونپڑیوں میں

رہنے والے ایک سبزی فروش کی بیٹی اور اتنی بڑی اور مشہور ماہر ڈاکٹر!

''اب ذرا کیس کی تفصیل بتایئے فیضو بھائی۔'' مسعودہ نے ان دونوں کو اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔ فیضو کے پاس بتانے کے لیے کوئی لمبی چوڑی تفصیل نہیں تھی۔

''آپ کے نواسے کو جو ویکسین دی گئی وہ جعلی تھی۔'' مسعودہ نے فیضو کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ اسے ویکسین وقت پر دی گئی تھی اور اغوا کنندگان نے یقیناً اپنی دانست میں اسے ٹھیک ویکسین لگوائی ہو گی لیکن فیضو بھائی۔ پاکستان میں اس امپورٹیڈ ویکسین کی ہو بہو نقل بھی بن رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا ایسے پلید اور گھناؤنے انسانوں کو جلا کر راکھ کیوں نہیں کر دیتا جو ایسی انسانیت سوز حرکتیں کرتے ہیں۔ جعلی اینٹی ریبیز ویکسین..... اُف میرے خدا۔ انسانوں کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہے۔ یہ لوگوں سے پیسے لے کر ان کے ہاتھوں موت فروخت کرنا ہے۔''

ڈاکٹر مسعودہ کی تیز اور چبھتی ہوئی نگاہیں فیضو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور فیضو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نگاہیں خنجر بن کر اس کے دل میں اترتی چلی جا رہی ہیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے مسعودہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ وہ خوب جانتی ہے کہ جعلی اینٹی ریبیز ویکسین پاکستان میں کون بنا رہا ہے اور کون پھیلا رہا ہے۔

''تو..... کیا..... اب اصلی ویکسین لگا کر اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟'' یاسمین نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں مسعودہ سے پوچھا۔ اس کے لیے فوری مسئلہ یہ نہیں تھا کہ پاکستان میں جعلی اینٹی ریبیز ویکسین کون بنا رہا ہے۔

''وائرس مریض کے جسم میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔'' ڈاکٹر مسعودہ لاشاری نے کہا۔ ''ہمارے پاس کرنے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی، جو کچھ انسانی بس میں ہے، وہ میں ضرور کروں گی۔''

''ڈاکٹر صاحبہ، یہ پتہ کیسے چلے کہ ویکسین اصلی ہے یا نقلی؟'' یاسمین نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''ان لوگوں نے تو اصلی سمجھ کر ہی خریدی ہو گی۔''

''میں اپنے مریضوں کے لیے یہ ویکسین بازار سے نہیں خریدتی ہوں۔'' ڈاکٹر مسعودہ نے کہا۔ ''یہ مریض کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور میں یہ خطرہ مول نہیں لیتی۔ میں یہ ویکسین اپنے کلینک اور دوسرے اسپتالوں کے لیے، جن سے میرا تعلق براہِ راست ہے امپورٹ کرتی ہوں۔ اس لیے دھوکے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''خدا غارت کرے ان لوگوں کو جنہوں نے ہمارے بچے کی یہ حالت کر دی۔'' یاسمین

نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب..... خدا کے لیے..... آپ پیسوں کی کوئی پرواہ نہ کریں بس ہمارے اظفر کو کسی طرح بچا لیجیے۔ اس کے بغیر میں تو زندہ نہیں رہ سکوں گی۔''

''میں نے پیسوں کی پرواہ تو زندگی بھر نہیں کی ہے یاسمین بھابی۔'' مسعودہ نے یاسمین کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا تعلق بہت ہی غریب خاندان سے ہے۔ میرے ابا سبزی کا ٹھیلا لگایا کرتے تھے' مگر انہوں نے ہم سب بھائی بہنوں کو پڑھایا لکھایا۔ فیضو بھائی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔''

یاسمین کا پہلی بار ایک ایسے شخص سے سامنا ہوا تھا جو اس کے شوہر کو ''فیضو بھائی'' جیسے بے تکلفانہ الفاظ سے مخاطب کر رہا تھا لیکن اس وقت کی صورتِ حال میں تو وہ زیادہ تحیر اور تجسس کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت اگر کوئی فکر تھی جو اس کے لیے دنیا کی ہر فکر سے زیادہ تھی تو وہ صرف یہی کہ اس کے نواسے کا کیا ہوگا۔

''میں اپنے مریضوں کی جان بچانے کے لیے ان کا علاج کرنے کے لیے پیسے کو کبھی بنیاد اور معیار نہیں بناتی۔ آپ لوگ تو کروڑ پتی بلکہ شاید ارب پتی ہوں گے لیکن اگر کوئی بالکل معمولی درجے کا غریب مریض بھی ہوتا تو میں اس کے لیے وہی سب کچھ کرتی جو میں آپ کے نواسے کے لیے کر رہی ہوں۔''

''تو پھر جلدی سے بتایئے ڈاکٹر صاحب کہ آپ اس کے لیے کیا کر رہی ہیں۔'' یاسمین نے کہا۔

''جو بھی ممکنہ علاج ہو سکتا ہے وہ کریں گے۔'' ڈاکٹر مسعودہ نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن میں آپ کو کوئی جھوٹی امید نہیں دلانا چاہتی۔ ریبیز کا وائرس ایک بار جسم کے اندر داخل ہونے کے بعد اگر ایکٹو ہو جائے اور اس کی افزائش کا عمل شروع ہو جائے تو پھر اس کو کنٹرول کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اصل میں ہائیڈروفوبیا کا کوئی علاج موجود نہیں ہے۔ اس کی صرف روک تھام کی جا سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ جیسے ہی کسی کو کوئی پاگل کتا کاٹے' ویسے ہی اس شخص کو اینٹی ریبیز ویکسین کے انجکشن لگوا دینے چاہئیں۔ آپ ہائیڈروفوبیا کا مطلب سمجھتی ہیں نا؟ ہائیڈرو کا مطلب ہے پانی اور فوبیا کا مطلب ہے خوف۔ اس بیماری کا شکار ہو جانے والا شخص پانی سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ وہ شدید پیاس کے باوجود پانی پینے سے انکار کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ پانی کے انڈیلے جانے کی قلقل کی آواز بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔''

یاسمین گہری محویت اور خوف کے عالم میں ڈاکٹر مسعودہ لاشاری کی باتیں سن رہی تھی

اور اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا نواسا اب موت کی دہلیز پر کھڑا ہوا ہے۔ چند دن پہلے تک تو وہ ایسی خوفناک باتیں سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن اب اچانک سب کچھ اس قدر تیزی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ یاسمین نے زندگی کو اس قدر تیزی کے ساتھ موت میں تبدیل ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اظفر کا سفر زندگی اتنی جلدی تمام ہو جائے گا؟ اس نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر مسعودہ جو کچھ کہہ رہی تھی اسے فیضو بھی بڑی خاموشی سے سن رہا تھا۔ یہ ساری باتیں فیضو کو پہلے سے معلوم تھیں لیکن ان کے بارے میں اس نے اس انداز سے کبھی سوچا نہیں تھا۔ یہ سب کچھ دوسروں کے لیے تھا۔ اس نے کافی عرصہ پہلے پیر کالونی کے اس بچے کے بارے میں اخبار میں شائع ہونے والی خبر کو محض سرسری طور پر پڑھ کر بھلا دیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ بچہ جسے ایک پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا بروقت اینٹی ریبیز ویکسین لگنے کے باوجود ہائیڈروفوبیا کا شکار ہونے کے بعد مر گیا تھا۔ فیضو کے دل میں اس خبر سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی اس بچے کے لیے رحم' ہمدردی یا تاسف کا کوئی جذبہ اس کے دل میں بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی جعلی ویکسین اس کے لیے سونے کے سکوں میں ڈھلتی جا رہی تھی اور سکوں کا یہ ڈھیر زیادہ سے زیادہ اونچا ہوتا جا رہا تھا..... یہ سارا ڈھیر وہ اپنے اکلوتے وارث اپنے نواسے کے لیے چھوڑ کر جانے والا تھا۔

لیکن اب سونے کا وہی ڈھیر اسے کسی زہریلے اور مہلک سیال میں تبدیل ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا اور یہ زہریلا سیال آہستہ آہستہ اس کے اکلوتے وارث کے جسم کے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا اور اسے لحہ بہ لحہ موت کے قریب لے جا رہا تھا۔

''ہم نے اس کو آئی سولیشن میں رکھ دیا ہے۔'' ڈاکٹر مسعودہ لاشاری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ چاہیں تو رکیں' چاہیں تو چلے جائیں۔ ہمیں آپ کی موجودگی کی ضرورت نہیں ہے' ہمیں جو کام کرنا ہے' وہ ہم کریں گے۔''

''میں تو رکوں گی۔'' یاسمین نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میں اسے اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔''

''آپ رہ سکتی ہیں۔'' ڈاکٹر مسعودہ لاشاری نے کہا۔ ''لیکن آپ کو اس سے دور رہنا ہوگا۔ ہائیڈروفوبیا کا مریض پاگل ہو کر خود بھی دوسروں کو کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔''

یاسمین کا سارا وجود تھرا اٹھا۔ اُف خدایا..... اس کا اظفر..... اس کا اپنا پیارا اظفر جو اسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھا' وہ اس کو کسی پاگل کتے کی طرح کاٹ سکتا تھا۔ ''یا میرے

مولا' میری قسمت میں یہ دن بھی لکھا تھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''خدا کتے کی موت مارے ان جعلی ویکسین بنانے والوں کو۔ اگر ہمارے بچے کو اصلی ویکسین مل گئی ہوتی تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔'' ایک نکیلا اور کاٹ دار تیر تھا کہ فیضو کے سینے میں ترازو ہوتا چلا گیا۔

وہ دونوں تقریباً دو گھنٹے تک اسپتال میں موجود رہے۔ ڈاکٹر مسعودہ کافی دیر تک وہاں موجود رہی تھی اور پھر اپنے اسسٹنٹوں کو ضروری ہدایات وغیرہ دے کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

''میں فون پر اسٹاف سے رابطہ رکھوں گی۔'' جانے سے پہلے اس نے یاسمین اور فیضو سے کہا۔ ''ویسے ان لوگوں کو سب کچھ اچھی طرح سے معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے۔ میں اب صبح کو آؤں گی۔''

دو گھنٹے بعد فیضو وہاں سے چلا آیا۔ یاسمین نے خود ہی اس پر زور دیا کہ وہ گھر چلا جائے اور وہ خود اظفر کے پاس رہے گی۔ فیضو جانا نہیں چاہتا تھا' کیونکہ اظفر کی حالت بہت خراب تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا لیکن جو کچھ بھی ہوسکتا تھا' اسے فیضو روک نہیں سکتا تھا۔ کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ اگر کوئی کچھ کرسکتا تھا تو وہ صرف ڈاکٹر مسعودہ تھی۔

فیضو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا اور اس کے دماغ میں برسوں پہلے کی کچھ پرچھائیاں ابھر رہی تھیں۔ شوکت چچا' شمسن چچی اور مسعودہ لانڈھی میں اس کے بنگلے میں آئے ہوئے تھے۔ ان سب کی حالت ہارے ہوئے سپاہیوں کی سی ہو رہی تھی اور پھر دادی کی موجودگی میں مسعودہ نے اس کو کس قدر ذلیل کیا تھا۔ مسعودہ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ جنہیں بھلائے ہوئے ایک طویل مدت گزر گئی تھی' ایک بار پھر اس کے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے۔ ان الفاظ کی کڑواہٹ اسے نئے سرے سے اپنے وجود کے اندر گھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ''تم اپنی وہ اوقات کس طرح بھول سکتے ہو فیضو جب تم گجر نالے کی بستی میں پھٹے پاجامے پہن کر گھوما کرتے تھے اور ہماری اماں تم پر ترس کھا کر تمہیں کپڑے بنوا دیتی تھیں۔ اگر ہمارے ابا نے تمہاری مدد نہ کی ہوتی تو تم اس وقت فیکٹری میں افسر لگے ہونے کی بجائے ٹائر کی کسی دکان پر پنکچر لگا رہے ہوتے۔''

آج اسے مسعودہ کے تیوروں میں اس سے کہیں زیادہ زہر گھلا ہوا لگ رہا تھا جتنا برسوں پہلے اس دن تھا۔ وہ اس کی مسعودہ سے آخری ملاقات تھی اور اس دن کے بعد آج ملاقات ہوئی تھی اور نفرت اور حقارت کا وہ زہر جو مسعودہ کے تیوروں میں اس دن موجود تھا' ایک بالکل نئی شکل اختیار کر کے آج بھی موجود تھا۔ فیضو کو معلوم تھا کہ مسعودہ اس کے بارے میں بہت

کچھ جانتی ہے اور وہ اس کی کتنی ہی پیش کشوں کو ٹھکرا چکی تھی۔ فیضو کو یہ بات آج تک نہیں معلوم تھی کہ ڈاکٹر مسعودہ شوکت حسین سبزی فروش کی بیٹی اور شاکرہ کی چھوٹی بہن ہے۔ یہ انکشاف آج ہی ہوا تھا اور اس انکشاف کے بعد اس کی یہ حالت تھی کہ وہ کسی بھیک منگے کی طرح ہاتھ پھیلائے شوکت حسین سبزی فروش کی چھوٹی بیٹی کے سامنے کھڑا ہوا اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا!

فیضو واپس گھر آ گیا۔ اس نے رات کا کھانا برائے نام کھایا اور کچھ دیر تک ٹی وی سے دل بہلاتا رہا۔ ایک گھنٹے کے بعد اس نے کلینک فون کیا اور یاسمین سے بات کر کے اظفر کی حالت کے بارے میں معلوم کیا۔ اظفر کی حالت میں کوئی بہتری نہیں پیدا ہوئی تھی' بلکہ حالت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔

فیضو نے جیسے تیسے وہ رات گزاری اور صبح ہونے کے تھوڑے ہی دیر کے بعد وہ ایک بار پھر اسپتال پہنچ گیا۔

اس نے یاسمین کو دیکھا۔ اجاڑ صورت والی ایک غم زدہ بوڑھی عورت' جس کی آنکھوں میں ویرانیاں تھیں۔

پھر اس نے اظفر کو دیکھا اور خوف اور دہشت کے عالم میں اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے یہ اظفر نہیں تھا۔ یہ اس کا پیارا نواسا اظفر نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اور مخلوق تھا۔ مسخ شدہ چہرے اور ٹیڑھے میڑھے نقوش والا یہ غیر انسانی سا وجود اس کا نواسا اظفر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ہنستا' کھیلتا' مسکراتا تندرست و توانا' شاداب اور گلرنگ چہرے والا اظفر تو نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ یہ ایک نیم مُردہ اور ڈراؤنی سی شکل کہاں سے آ گئی تھی؟

''وہ اب پہچانتا بھی نہیں ہے۔'' یاسمین نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ ''اس کی آنکھوں میں وحشت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے..... ہائے میرا بچہ..... نہ جانے کن ظالموں نے اس کا یہ حال کر دیا۔ خدا ان کو غارت کرے۔ ان کو بھی پاگل کتے کاٹیں اور اسی طرح سسک سسک کر مریں۔''

فیضو کے کانوں میں کوئی پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر مسعودہ آئی تو وہ اپنے ساتھ دو دوسرے ڈاکٹروں کو بھی لے کر آئی تھی۔ وہ دونوں بھی معروف اسپیشلسٹ تھے۔ فیضو ان دونوں سے واقف تھا۔

تینوں ڈاکٹر بہت دیر تک اظفر کا معائنہ کرتے رہے۔ فیضو اور یاسمین کو کمرے کے باہر ہی روک دیا گیا تھا۔

جب وہ ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلے تو ان تینوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔

''صورتِ حال امید افزا نہیں ہے فیضان علی صاحب!'' ڈاکٹر قدرت اللہ نے فیضو سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیس بہت بگڑ چکا ہے۔''

فیضو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ آج تو جیسے اس کا ذخیرہ الفاظ بالکل خالی ہو چکا تھا۔

باہر سے آئے دونوں ڈاکٹر چلے گئے۔ فیضو اور یاسمین ڈاکٹر مسعودہ کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''بڑا ظلم ہے فیضو بھائی' بڑا ظلم ہے۔'' ڈاکٹر مسعودہ لاشاری گہری اور بھاری آواز میں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ''کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اور مردار خور گِدھوں کا دیس ہے۔ کھلم کھلا جعلی اور غیر معیاری دوائیں بن رہی ہیں' مارکیٹیں ایسی دواؤں سے بھری ہوئی ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے..... اُف..... یہ انسانی لاشیں کھانے والے گدھ..... یہ اس معاشرے کا نہ جانے کیا حشر کریں گے۔''

فیضو یاسمین کے ساتھ دوپہر تک اسپتال میں ہی رہا۔ اظفر کی حالت میں بہتری کے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے تھے' لیکن آس کی ایک کمزور سی ڈوری تھی جسے فیضو اور یاسمین نے پکڑ رکھا تھا۔

یہ کمزور ڈوری اگلے دو دن سے زیادہ اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ سکی اور چوتھے دن صبح کو عین اس وقت ٹوٹ گئی جب ڈاکٹر مسعودہ مریض کے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

یاسمین تو اظفر کے اسپتال میں داخل ہونے کے بعد سے ایک منٹ کے لیے اسپتال سے باہر نہیں گئی تھی۔ اس نے سارا وقت اسپتال میں ہی گزارا تھا اور وہ اس وقت اپنے نواسے کے پاس ہی موجود تھی جب اس نے آخری سانسیں لیں۔ بس' چند سانسوں کا ہی تو فاصلہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ ختم۔

ڈاکٹر مسعودہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی نظریں مریض کے بیڈ کے ساتھ لگے ہوئے مانیٹر پر جم گئیں۔ وہاں سب کچھ گرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اور پھر سب کچھ گر گیا۔ ڈیوٹی پر موجود جونیئر ڈاکٹر اور نرس جلدی جلدی آخری ناکام کارروائیاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''سوری۔'' ڈاکٹر مسعودہ نے یاسمین کی طرف دیکھ کر آہستہ سے دکھ بھری آواز میں کہا۔ ''سوری یاسمین بھابی..... ہم ناکام ہو گئے۔''

یاسمین کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ دوہری ہو کر گرنے لگی۔ ایک وارڈ بوائے نے جلدی سے اس کو سہارا دیا۔

''انہیں دوسرے کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹا دو۔'' ڈاکٹر مسعودہ نے اسٹاف کو ہدایت کی دوسرے کمرے تک پہنچتے پہنچتے تک یاسمین پر بے ہوشی طاری ہو چکی تھی۔

فیضو کو فون پر اطلاع دے دی گئی۔ اس کے لیے اس اطلاع میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ فیضو کو معلوم تھا کہ وہ قاتل لمحہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے اور بالآخر وہ آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف گہری تاریکی پھیل گئی تھی۔ یہ فنا کی تاریکی تھی۔ ازلی اور ابدی تاریکی' جس میں اظفر کا ننھا سا وجود گم ہو کر تحلیل ہو چکا تھا۔

اظفر کی لاش کو گھر لایا گیا اور اسی دن تدفین ہو گئی۔

فیضو کا کوئی رشتے دار نہیں تھا جو اظفر کی تدفین میں شرکت کرتا۔ صرف اس کے دوست تھے اور یا پھر اس کے دفتری ملازمین جن کے لیے باس کے نواسے کی تدفین میں شرکت کرنا بھی ان کی ڈیوٹی کا ہی حصہ تھا۔

فیضو کو اگلے تین دن تک تو تن بدن کا ہوش ہی نہیں رہا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد تعزیت کے لیے آتی رہی۔ احساسِ زیاں کے مکمل ادارک میں کچھ وقت لگ گیا۔

اور جب یہ ادراک اپنے درجہ تکمیل کو پہنچا تو فیضو کو اپنے چاروں طرف بڑے ویران اور جان لیوا سناٹے کا احساس ہونے لگا۔ ساری دنیا تو ویسی ہی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سورج اسی طرح نکل رہا تھا' اسی طرح ڈوب رہا تھا' تمام کاروبارِ زندگی اسی طرح چل رہا تھا' سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا' ٹی وی کے چینلوں کی وہی چیخم دھاڑ تھی' بازاروں اور دکانوں میں وہی گہما گہمی تھی اور ان سارے ہنگاموں میں کوئی جانتا بھی نہیں تھا کہ اظفر اس دنیا سے چلا گیا ہے' فیضان علی کا وارث' ولی عہد' جاں نشین مر چکا ہے۔ اظفر کی کمی سے کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ البتہ فیضو اور یاسمین کے لیے تو ایک پوری دنیا مر چکی تھی اور اس کی جگہ لینے والی نئی دنیا حد درجہ اذیت ناک اور بھیانک تھی۔

فیضو یاسمین کو دیکھتا تھا تو اس کو لگتا تھا کہ ان چند دنوں کے دوران اس کی عمر میں نہ جانے کتنے برسوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ وہ ایک ہی جھٹکے میں بہت بوڑھی لگنے لگی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے' چہرے کی کھال اور زیادہ سکڑ گئی تھی' خشک ہو گئی تھی اور جھریوں میں یکبارگی بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ یاسمین اب کسی اجڑی ہوئی دنیا کی ایک تباہ شدہ مخلوق معلوم ہوتی تھی۔ وہ بہت کم بات کرتی تھی۔ زیادہ روتی بھی نہیں تھی۔ بس خاموش رہتی

تھی۔ اگر کوئی اس سے بات کرتا تو جواب دے دیتی تھی ورنہ خاموش بیٹھی پاگلوں کی طرح خلا میں گھورا کرتی تھی۔ پھر اس نے بہکی بہکی باتیں شروع کر دیں۔

''فیضان!'' اس شام اس نے اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا' جو اس کے قریب ہی موجود تھا۔ ''تم ان کتوں کو بھگاتے کیوں نہیں؟''

''کتے؟'' فیضان نے چونک کر کہا۔ ''کون سے کتے؟ کہاں ہیں کتے؟''

''دیکھو کتنے بہت سارے کتے بھونک رہے ہیں۔'' یاسمین نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے غائب دماغی کے ساتھ کہا۔ ''کتنے بڑے بڑے اور خوفناک کتے ..... انہیں بھگاؤ' ورنہ ہمارے اظفر کو کاٹ کھالیں گے۔''

''نہیں نہیں۔'' فیضو نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کوئی کتے وتے نہیں ہیں۔ صرف تمہارا وہم ہے۔ یہاں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔''

''وہ لے گئے.....'' اچانک یاسمین کی آواز بھرانے لگی۔ ''وہ ہمارے اظفر کو لے گئے۔ ہائے وہ بڑے بڑے کتے میرے اظفر کو لے گئے۔ وہ اسے کھا جائیں گے فیضان..... کتے میرے اظفر کو کھا جائیں گے..... میرے اظفر کو ان سے بچالو۔''

''ہوش میں آؤ یاسمین۔'' فیضو نے سخت پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''اظفر اب زندہ نہیں ہے یاسمین۔ تمہیں یاد رکھنا چاہئے۔ اظفر اب زندہ نہیں ہے۔'' فیضو اسے حقیقت کی دل آزار دنیا میں واپس لانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ''اظفر مر چکا ہے یاسمین۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے اور کوئی بھی چیز اب اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔''

یاسمین خاموش ہوگئی۔ فیضو اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ یاسمین کا چہرہ نہیں تھا' یہ تو نہ جانے کس عورت کا مڑا تڑا' ٹیڑھا میڑھا' بوڑھا چہرہ تھا۔ جس کے سارے عضلات بری طرح کھنچے ہوئے تھے اور اس پر ایک تشنجی کیفیت طاری تھی۔ اس بگڑے ہوئے خدوخال والے چہرے پر جو دو آنکھیں تھیں' انہوں نے شاید ساری دنیا کے دکھوں اور ویرانیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔

فیضو آہستہ سے وہاں سے اٹھا اور فون کے پاس جا کر ڈاکٹر فرقان کو فون کرنے لگا۔ ڈاکٹر فرقان دماغی اور نفسیاتی امراض کا ایک بہت مشہور و معروف ماہر تھا اور فیضو کے نیٹ ورک کا ایک حصہ بھی۔ فیضو نے ڈاکٹر فرقان کو یاسمین کی حالت میں اس تازہ تبدیلی کے بارے میں بتایا۔

''یہ ڈپریشن اور اینگزائٹی کی ایک شدید قسم ہے۔'' ڈاکٹر فرقان نے فیضو کی پوری بات

سننے کے بعد کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ وقتی ہے اور کچھ عرصے بعد ختم ہو جائے گی۔ میں دوا بتا رہا ہوں' آپ انہیں دوا دیجیے۔ دوا ایک دن دیکھئے پھر اگر ضرورت سمجھیں تو میرے پاس لے آیئے میں تفصیل کے ساتھ دیکھ لوں گا۔''

فیضو نے ڈاکٹر فرقان کی بتائی ہوئی دوا یاسمین کو دینی شروع کر دی لیکن یاسمین پورے طور سے نارمل نہیں ہوئی۔ فیضو اسے ڈاکٹر فرقان کے پاس لے کر بھی گیا اور اس نے اس کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد اسے کچھ مزید دوائیں دیں۔

''یہ صدمے اور ڈپریشن کی شدید کیفیت ہے۔'' ڈاکٹر فرقان نے کہا۔ ''یہ رفتہ رفتہ نارمل ہو جائیں گی' مگر اس میں وقت لگے گا۔''

یاسمین کی عجیب حالت ہوگئی تھی۔ ویسے تو وہ ٹھیک تھی' لیکن کسی کسی وقت اچانک اس کا دماغ جیسے ماؤف ہو جاتا اور وہ کسی اور ہی دنیا میں چلی جاتی' لیکن ان سب چیزوں کا تعلق اظفر سے ہوتا تھا اس کے دماغ میں جو بھی آڑی ترچھی' زندہ مُردہ تصویریں بنتیں' ان سب کا تعقل اظفر سے ہی ہوتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک چونک پڑتی۔

''ارے..... اتنی دیر ہوگئی۔ اظفر ابھی تک اسکول سے نہیں آیا۔ کہاں رہ گیا ہے؟''

''اظفر اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔'' فیضو بھرائی ہوئی آواز میں اسے یاد دلانے کی کوشش کرتا۔ ''اظفر اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ مر چکا ہے یاسمین۔ وہ مر چکا ہے۔''

''مر چکا ہے؟'' یاسمین فیضو کو گھورتی۔ ''مگر کیسے؟ کیسے مر گیا؟ ہاں ہاں..... کوئی کہہ رہا تھا..... کوئی کہہ رہا تھا کہ اسے کتوں نے کھالیا ہے۔ نہیں..... نہیں..... میرے بچے کو کتے نہیں کھا سکتے۔ یہ لوگ ایسے ہی کہتے ہیں۔ اظفر آئے گا' وہ ضرور آئے گا۔'' اور وہ بلک بلک کر رونے لگتی۔ فیضو کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلتے۔ وہ انہیں روکنے کی کوشش کرتا اور یاسمین کو سنبھالتا۔ ڈاکٹر فرقان نے کہا تھا کہ یاسمین کو اس کیفیت سے نکالنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے حقائق کا احساس دلایا جائے۔ اسے تصورات کی دنیا سے حقائق کی دنیا میں واپس لانے کی کوشش کی جائے۔

یاسمین کا جسم گھلتا جا رہا تھا۔ اس کا وزن بڑی تیزی کے ساتھ کم ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو کر ایک سال کا سفر ایک ساعت میں طے کر رہی ہو۔ اس کے چہرے کے خدوخال روز بروز زیادہ فرسودہ' مسخ اور شکستہ ہوتے جا رہے تھے۔ فیضو اس کی طرف دیکھتا تھا تو وہ اس کو کوئی اور ہی نظر آتی تھی۔ جسمانی زوال کے ساتھ ہی' وہ ذہنی زوال کا بھی شکار تھی اور اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔

فیضو اس کا علاج کروا رہا تھا۔ یاسمین پاگل نہیں تھی۔ وہ ایک پیچیدہ قسم کی نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی۔ اسے رات کو نہیں بھی کم آتی تھی۔ اکثر وہ سوتے سوتے اٹھ جاتی اور فیضو کو بھی جگا دیتی۔

''سنو..... سنو..... فیضان..... یہ کتے کہاں بھونک رہے ہیں؟ خدا کے لیے۔ ان کو روکو۔ یہ اظفر پر حملہ کر دیں گے۔ یہ اظفر کو کاٹ کھائیں گے۔''

''سو جاؤ..... سو جاؤ۔'' فیضو اسے تسلی دینے کے انداز میں کہتا۔ ''یہاں کوئی کتا نہیں ہے۔ اور اظفر اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اظفر مر چکا ہے یاسمین۔ اظفر مر چکا ہے۔''

''کیا؟ اظفر مر چکا ہے؟'' یاسمین کسی اچانک صدمے کے احساس تلے چونک کر کہتی۔ ''اظفر مر چکا ہے؟ کیا وہ اب کبھی نہیں آئے گا؟'' اور اس کے ساتھ ہی وہ رونا شروع کر دیتی۔ فیضو کا اپنا وجود بھی دُکھ کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا۔

صبح کو یاسمین بیدار ہوتی تو اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی ہوتیں اور اس کا چہرہ کسی بے آب و گیاہ صحرا کی طرح اجاڑ ہوتا۔

اور پھر ایک صبح ایسی ہوئی کہ جب یاسمین سو کر اٹھی ہی نہیں۔ اس دن اظفر کی موت کو ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس صبح کو یاسمین سو کر اٹھی ہی نہیں، اور پھر وہ کبھی نہیں اٹھی۔ فیضو نے جب اس کو خلافِ معمول دیر تک سوتا دیکھ کر جگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ اب کبھی نہیں جاگے گی، کیونکہ وہ ابدی نیند سو چکی ہے۔

پاگل کتے نے اظفر کے ساتھ ہی یاسمین کو بھی کھا لیا تھا۔

فیضو نے اس کی حالت دیکھ کر ایک چیخ ماری اور جلدی سے فون کی طرف بھاگا۔ ڈاکٹر اشتیاق علی کا گھر یہاں سے قریب تھا اور وہ بآسانی یہاں آ سکتا تھا۔

''جلدی سے آیئے ڈاکٹر اشتیاق علی۔'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''پلیز..... جلدی سے آ جایئے۔ میں گاڑی بھیج رہا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے فیضان صاحب۔'' ڈاکٹر اشتیاق علی نے کہا۔ ''گاڑی بھی موجود ہے اور ڈرائیور بھی، میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔''

فیضو کی چیخ سن کر گھر کے ملازموں میں ایک ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ یاسمین کی خاص ملازمہ اس کے بستر کے پاس کھڑی ہوئی، یاسمین کی مردہ شکل کو دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

ذرا دیر میں ڈاکٹر اشتیاق علی آن پہنچا۔ اسے جلدی سے یاسمین کے بستر کے پاس پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر اشتیاق علی نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی کہا۔ ''اوہ.....'' پھر وہ جلدی جلدی

اس کا معائنہ کرنے لگا۔

''سوری فیضان صاحب!'' اشتیاق علی نے مختصر معائنے کے بعد کہا۔ ''ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ انتقال کو تقریباً دو گھنٹے گزر گئے ہیں۔''

فیضو کی زبان سے ایک بھی لفظ نہیں نکلا، البتہ ملازمہ زور زور سے رونے لگی۔

یاسمین کی موت کو دو ہفتے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ فیضو کے لئے اب نہ دن، دن تھا نہ رات، رات تھی۔ بس، خاکِ الم کی طرح اُڑتے ہوئے لمحات کا ایک بے نام لشکر تھا جو ہر چیز سے بے نیاز فیضو کی ہر خوشی اور غم سے بے نیاز اُڑتا چلا جا رہا تھا، بھاگتا چلا جا رہا تھا اور کہیں بھی رکنے کو تیار نہیں تھا۔

فیضو اب اگر دفتر جاتا تھا تو صرف اس لیے کہ اس کا کچھ وقت گزر جائے۔ دفتر کے سارے امور اس نے اپنے پرانے دوست اور رازداں منیر کے سپرد کر دیئے تھے۔ منیر ہی سارے کاروبار کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ فیضو کو اب کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اظفر مر گیا تھا۔ یاسمین مر گئی تھی، تو پھر زندہ کون تھا؟

اظفر اور یاسمین کی موت کے بعد گزرنے والی تمام راتوں کی طرح فیضو کی زندگی کی وہ رات بھی اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھی، بلکہ آج تو دل مفلس کے چراغ کی طرح شام سے ہی بجھا جا رہا تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا اور فیضو بالکل تنہا اپنے بستر پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔

اچانک وہ پھر آ گئے..... بھونکتے ہوئے..... شور مچاتے ہوئے۔

پچھلے کئی دنوں سے اسے رات کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے سارے گھر میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں گونج رہی ہیں اور کتوں کے غول گھر میں ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں۔ آج پھر ان کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

رات کے گہرے اور پُراسرار سناٹے میں گھر کے کونے کونے سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ آوازیں قریب آتی جا رہی ہیں۔ بڑی بھیانک رات تھی اور بڑی بھیانک آوازیں تھیں۔ پھر ان آوازوں کے ساتھ ساتھ کتوں کا ایک غول درانہ گھستا ہوا اندر آ گیا اور اس کے ساتھ ہی گھر کے کسی گوشے سے اظفر نمودار ہو گیا۔ کتوں کا غول اظفر کا پیچھا کرنے لگا اور اظفر ان کتوں سے بچ کر چیختا چلاتا بھاگنے لگا۔ یکبارگی اس کتے کی شکل بدل گئی جو غول میں سب سے آگے تھا اس کی شکل اب بالکل فیضو جیسی ہو گئی تھی۔ فیضو کی شکل والا کتا سب سے بھاری بھرکم اور خوفناک تھا۔ اس کی آواز باقی دوسرے

کتوں کے مقابلے میں زیادہ کریہہ اور بھیانک تھی۔اس کی آنکھوں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔زبان لمبی ہوکر باہر لٹکی ہوئی تھی اور اس سے لعاب ٹپک رہا تھا۔وہ بھاری بھرکم کتا فیضو کی اپنی شکل تھا اور اظفر کو بری طرح دوڑا رہا تھا۔پھر اس نے ایک اونچی چھلانگ مار کر اظفر کو دبوچ لیا۔اظفر کی چیخوں سے سارا گھر لرز رہا تھا۔اب دوسرے کتے بھی فیضو جیسی شکل والے کتے کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔وہ سب مل کر اظفر کو بھنبھوڑ رہے تھے اور اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔پھر ایک طرف سے یاسمین نمودار ہوگئی۔وہ بالکل بڑھیا ہوگئی تھی۔اس کے سر کے بال سفید ہوگئے تھے اور کمر جھک گئی تھی۔وہ اپنے دونوں خالی ہاتھوں کی مدد سے اظفر کو بچانے کی کوشش کرنے لگی اور کتوں نے اسے بھی بھنبھوڑنا شروع کردیا۔یاسمین چیخ رہی تھی۔اظفر چیخ رہا تھا اور کتے خوفناک آواز میں بھونک رہے تھے اور اظفر اور یاسمین کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔فیضو جیسی شکل والا کتا سب سے زیادہ خونخوار انداز میں حملے کررہا تھا اور فیضو خود بھی.....فیضو خود ایک دور دراز گوشے میں کھڑا ہوا تھا اور اس کے قدموں میں سونے کا ایک ڈھیر جمع ہوتا جارہا تھا۔

فیضو نے اپنے سر کو دو تین بار زور زور سے جھٹکے دیئے اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔موسم میں ہلکی سی خنکی کے باوجود اس کا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔اس کا دل غیر معمولی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

یکبارگی وہ عالی شان محل نما گھر اس کی نظروں سے غائب ہوگیا۔وہ سعود آباد کے کوارٹر میں تھا۔برآمدے میں ایک جھلنگے سے پلنگ پر پڑے ہوئے ابا بری طرح کھانس رہے تھے۔''فیضو.....فیضو بیٹا.....دوا لے آئے ہو تو مجھے کھلا دو۔'' اور وہ ابا کو ٹی بی کی مہنگی دوا کی بجائے اسپرین کی سادہ اور سستی گولیاں کھلا رہا تھا۔ابا گولیاں کھاتے ہی چارپائی پر گر پڑے اور مرگئے۔ایک گوشے سے دادی روتی ہوئی نمودار ہوئیں.....ارے تُو نے مار دیا میرے بیٹے کو.....تُو نے میرے بیٹے کو مار دیا۔وہ ابا کی لاش کے سرہانے کھڑی ہوکر نوحہ خوانی کررہی تھیں۔

پھر نہ جانے کس طرف سے وہ بھاگتا ہوا آگیا.....مقبول.....فیضو یاسمین کے ساتھ سڑک پر تھا کہ مقبول نے بیچ چوراہے پر اس کو گریبان سے پکڑ لیا اور بے تحاشہ گالیاں دینے لگا۔پھر اس کے ہاتھ میں کہیں سے ایک ڈنڈا آگیا اور اس نے فیضو کو مارنا شروع کردیا۔اس کی ہر ضرب کے ساتھ فیضو کے حلق سے بے تحاشا چیخیں نکل رہی تھیں۔یاسمین اسے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کررہی تھی۔

فیضو نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو کمالو نے اس کا راستہ روک لیا۔کمالو مخالف سمت سے نمودار ہوگیا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔اس کے ساتھ کئی لاشیں تھیں۔سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاشیں، جو کمالو کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی آرہی تھیں۔کمالو ان کفن پوش لاشوں کو ایک قطار میں کھڑا کرکے خود فوراً ہی غائب ہوگیا.....اور اب ان لاشوں میں مزید مُردے شامل ہوتے جارہے تھے۔ابا آگئے تھے۔وہ دانت باہر نکالے ہوئے بڑی نفرت آمیز نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔دادی آگئیں ان کی آنکھوں سے قہر برس رہا تھا۔دادی کے پیچھے سے شاہدہ نمودار ہوگئی۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''میری بچیاں مجھے لوٹا دو۔میری بچیاں مجھے لوٹا دو۔'' شاہدہ رو رو کر بَین کررہی تھی۔شاہدہ کے ساتھ اس کا معذور بھائی ریاض تھا۔اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔پھر اظفر بھی آگیا۔یاسمین بھی آگئی۔

سارے مُردے اس کے سامنے ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے اور اسے دیکھ رہے تھے۔اظفر اور یاسمین کے مُردہ جسموں کا گوشت جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔

پھر سارے مُردے اشارے سے اسے اپنی طرف بلانے لگے۔کمالو کے ساتھ آنے والے کفن میں لپٹے ہوئے مُردوں نے اپنے ہاتھ کفن سے باہر نکال لیے تھے اور وہ فیضو کو اشارے سے اپنی طرف بلا رہے تھے۔

فیضو اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔اس کی ٹانگیں برح طرح کانپ رہی تھیں۔وہ اپنے جسم کو گھسیٹتا ہوا واش روم تک لے گیا، جہاں اس نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر واپس آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

بڑا گہرا اور جان لیوا سناٹا تھا۔اب کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی اور سارے مناظر بھی اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہوچکے تھے۔ایک گہری دھند تھی جو اس کی آنکھوں میں بھر گئی تھی۔ہر چیز دھندلاتی جارہی تھی۔

''کیسا لگتا ہوگا ان لوگوں کو؟'' اس کے ذہن میں بھی دھند بھرتی جارہی تھی۔آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی دھندلاتا جارہا تھا۔''کیسا لگتا ہوگا ان لوگوں کو؟ ابا کو، دادی کو، شاہدہ کو، اظفر کو، یاسمین کو.....ان سب کو جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔انہیں کیسا لگتا ہوگا؟ یہ لوگ اب کہاں ہوں گے؟ کہاں ہوں گے؟ ہڈیوں کے ڈھانچے۔''

وہ اٹھ کر اپنی الماری کے پاس پہنچ گیا جس کی دیوار میں ایک ایسی خفیہ تجوری تھی جس کا علم اس کے اور یاسمین کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔البتہ یاسمین کے انتقال کے بعد اس نے منیر

کو اس تجوری کے بارے میں بتا دیا تھا۔

دیکھنے والے کو اس کی موجودگی کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس تجوری میں بھاری مالیت کے سونے کے علاوہ غیر ملکی اکاؤنٹس کی چیک بکیں اور بڑی تعداد میں اسٹاکس، شیئرز، سرٹیفکیٹس اور پراپرٹی کے کاغذات موجود تھے۔ وہ اس سارے خزانے کو دھندلی دھندلی نظروں سے دیکھتا رہا، جو اس کے بھاری اثاثوں کا ایک حصہ تھا۔

فیضو کچھ دیر تک تجوری کو کھولے ہوئے اس خزانے کو دیکھتا رہا۔ کاغذوں اور سونے کے بسکٹوں اور ٹکڑوں کو چھو چھو کر دیکھتا رہا۔ یہ سب کس قدر اجنبیت اور بیگانگی سے بھرپور تھا۔ اس میں اپنا تو کچھ بھی نہیں تھا۔

فیضو نے تجوری کو واپس بند کر دیا اور الماری کے دوسرے خانے میں ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکال لیا۔ یہ لائسنس والا ریوالور برسوں پہلے اس کے پاس موجود تھا اور وہ اسے اپنے بیڈروم میں رکھتا تھا، محض حفاظتی نقطہ نظر سے۔ اس ریوالور کو استعمال کرنے کی اسے آج تک ضرورت نہیں پیش آئی تھی لیکن وہ اس کو استعمال کرنے کے طریقے سے بخوبی واقف تھا۔

اس نے ریوالور کو لوڈ کیا اور ذہنی طور پر ڈیفنس سوسائٹی کے اس بنگلے کو چھوڑ کر گجر نالے کی جھگیوں کی بستی میں چلا گیا، جہاں کبھی اماں بھی تھیں، دادی بھی تھیں اور ابا بھی تھے۔ سب اپنے اپنے حصے کے کام پورے کر کے غائب ہو گئے تھے..... اماں؟ اماں نہ جانے کہاں ہوں گی؟ اور وہ آدمی..... وہ گورا اور خوبصورت سا آدمی..... کیا وہ اب بھی اتنا ہی گورا اور خوبصورت ہوگا؟

فیضو کو اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا اور اسے اب کسی جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کی انگلی نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکے کی آواز ہوئی اور ریوالور سے نکلنے والی گولی اس کی کنپٹی میں پیوست ہو گئی اور اندر جا کر پھنس گئی۔ فیضو کی آخری اذیت چند لمحوں سے زیادہ کی نہیں تھی۔ ان لمحوں کے ختم ہوتے ہی سب کچھ ختم ہو گیا..... ساری اذیت، سارا دکھ، سارا عذاب۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔

فیضو کی موت کو خودکشی کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار دیا جا سکتا تھا، کیونکہ اس کے بیڈروم کا دروازہ اندر سے لاک تھا اور ملازموں کی اطلاع پر منیر وہاں پولیس کو اپنے ساتھ لے کر پہنچا تھا۔ منیر اور ملازموں کی موجودگی میں جب فیضو کے کمرے کا دروازہ توڑا گیا تو فیضو کی خون آلود لاش اس کے بستر کے قریب فرش پر پڑی ہوئی پائی گئی۔ ریوالور اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

میڈیا کے لیے یہ ایک بڑی زبردست، سنسنی خیز اور دلچسپ اسٹوری تھی۔ ایک ارب پتی صنعت کار و تاجر نے اپنے نواسے اور بیوی کی موت کے غم میں دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔ اس کے نواسے کو، جو اس کا اکلوتا وارث تھا، پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا اور وہ ہائیڈروفوبیا کا شکار ہو کر مر گیا اور اس کی بیوی اپنے نواسے کے غم میں نیم دیوانی ہو کر چل بسی۔

☆======☆======☆

منیر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کام میں مصروف تھا۔ فیضو کی موت کے بعد سے کمپنی کے سارے کام کی نگرانی وہی کر رہا تھا۔ فوری طور پر اس نے یہ بندوبست کیا کہ اسمگلنگ کی ساری سرگرمیوں کو موقوف کر دیا تھا اور وہ جعلی اور غیر معیاری دواؤں کے کاروبار کو روکنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس ادارے کو نئے سرے سے منظم کرنا چاہتا تھا۔

سیکرٹری نے اطلاع دی کہ فرحان علی نامی کوئی صاحب اس سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کوئی قانونی معاملہ ہے جس کو طے کرنے کے لیے وہ یہاں آئے ہیں۔

منیر نے فرحان علی کو بلوا لیا۔ فرحان علی ایک درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''میں فیضان علی کا سگا بھتیجا ہوں۔ میرے والد احسان علی سمیت وہ کل تین بھائی تھے۔ سب سے بڑے رحمٰن علی تھے، ان سے چھوٹے میرے والد اور سب سے چھوٹے فیضان چچا۔ رحمٰن تایا اور ان کے بیوی بچوں میں سے اب کوئی زندہ نہیں ہے اور میں اپنے والد صاحب کی اکلوتی اولاد ہوں۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' منیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں۔''

''میں آپ کو یہ سب کچھ اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں فیضان چچا کا قانونی وارث ہوں۔'' فرحان علی نے کہا۔ ''ان کے انتقال کے بعد ان کی ہر چیز میری ملکیت ہے۔ میرے وکیل نے عدالت میں وراثت نامے کے حصول کے لیے درخواست دے دی ہے، عنقریب مجھے عدالت سے وراثت نامہ مل جائے گا۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ کو یہ بات پہلے سے بتا دوں۔ آپ میرے ساتھ تعاون کیجیے۔ یہاں جو لوگ بھی مجھ سے تعاون کریں گے، وہ فائدے میں ہی رہیں گے۔''

''مجھے افسوس ہے فرحان علی صاحب کہ میں اس معاملے میں آپ سے کوئی تعاون نہیں کر سکتا۔'' منیر نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''کیونکہ فیضان علی مرحوم کی کسی بھی چیز پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان کے مال و دولت کی وارث ان کی اولادیں ہیں۔''

''لیکن ان کی تو کوئی اولاد نہیں ہے۔'' فرحان علی نے حیرت سے کہا۔ ''ان کی ایک ہی بیٹی تھی تزئین' جو ایک بیٹے کو چھوڑ کر مرگئی اور پھر وہ بیٹا بھی مرگیا اور یاسمین چچی بھی۔ اب تو فیضان چچا کے مرحوم بھائی کی اکلوتی اولاد کی حیثیت سے میں ہی ان کا وارث ہوں۔ میرے وکیل نے سارے معاملے کا بہت اچھی طرح سے قانونی جائزہ لے لیا ہے۔ میرا حقِ وراثت تو غیر متنازع ہے۔''

''آپ کا تو سرے سے کوئی حقِ وراثت ہی نہیں ہے بھائی۔'' منیر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''فیضان علی مرحوم کا جو کچھ بھی ہے' وہ ان کی دونوں بچیوں کا ہے' وہی ان کی وارث ہیں۔''

''بچیاں؟'' مگر فیضان چچا کی تو ایک ہی بیٹی تھی..... تزئین..... اور وہ اب زندہ نہیں ہے.....''

''نہیں' تزئین ان کی اکلوتی بیٹی نہیں تھی۔'' منیر نے کہا۔ ''ان کی دو بیٹیاں اور بھی ہیں..... صائمہ اور نائلہ!''

یہ بات دنیا میں صرف چار ہی افراد کو معلوم تھی' منیر کو' اس کی بیوی نسرین کو صائمہ اور نائلہ کو۔

☆======☆======☆

منیر کی نگاہیں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اس کے کان اس شخص کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو اپنے اندر سمیٹ رہے تھے اور اس کا ذہن آج سے برسوں پہلے کے واقعات کے پیچ وخم میں الجھ رہا تھا۔

نسرین کے ساتھ اس کی شادی کو اب زمانہ گزر گیا تھا۔ زندگی کا سفر بڑی تیزی سے جاری تھا لیکن ان دونوں کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ تاہم منیر کے دل میں کبھی بھولے سے بھی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا تھا کیونکہ نسرین اسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ نسرین کو دکھ دینے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے اور نسرین کے علاج میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ڈاکٹری رپورٹوں کے مطابق دونوں بالکل ٹھیک تھے لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ کسی دوسرے کی اولاد کو گود لینے کا خیال نسرین کو کبھی پسند نہیں آیا تھا۔

نسرین نے فیضو کی دوسری شادی کے لیے لڑکی کی تلاش میں اپنے شوہر کی مدد کی تھی اور نسرین نے ہی شاہدہ کو تلاش کیا تھا جو کہ فیضو کی مرضی اور ضرورت کے معیار پر پوری اترتی

تھی۔ اور پھر فیضو اور شاہدہ کی شادی ہوگئی۔

نسرین اکثر اپنے شوہر سے یہ سوال پوچھتی تھی کہ اگر شاہدہ سے بھی کوئی بیٹا پیدا نہ ہوا تو پھر فیضان علی کیا کرے گا۔ منیر کے پاس اپنی بیوی کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ خود فیضان علی کے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن منیر نے بیٹی کی پیدائش کی صورت میں شاہدہ اور بیٹی کے حقوق کے مکمل تحفظ کا مضبوط بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ شاہدہ میں فیضو کی دلچسپی صرف اس حد تک ہے کہ شاہدہ ایک بیٹے کو جنم دے دے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرسکی تو اس کی دو کوڑی کی اوقات نہیں ہوگی۔ منیر شاہدہ کو مشکلات سے بچانا چاہتا تھا۔

میٹرنٹی ہوم میں شاہدہ کا رجسٹریشن منیر نے ہی کروایا تھا اور وہاں کے ریکارڈ میں اس کے تمام حقیقی کوائف درج کرائے گئے تھے۔ شاہدہ کا پتہ وہی لکھوایا گیا تھا جو کہ فیضان علی کے گھر کا پتہ تھا۔ فیضان علی کے گھر اور دفتر کے فون نمبر بھی لکھوائے گئے تھے۔ اسپتال ریکارڈ سے کبھی بھی ثابت ہوسکتا تھا کہ شاہدہ فیضان علی کی منکوحہ تھی' فیضان علی اور شاہدہ کا نکاح نامہ بھی منیر کی تحویل میں تھا جسے منیر نے بہت احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھا تھا۔

پھر جب شاہدہ نے میٹرنٹی ہوم میں دو جڑواں بچیوں کو جنم دیا تو منیر اسی وقت سمجھ گیا کہ شاہدہ کے مقدر کا ستارہ اندھیروں میں ڈوب رہا ہے۔ اب شاہدہ اور اس کی بچیوں کو مدد کی ضرورت تھی۔

شاہدہ تو اسی دن ہر قسم کی مدد کی ضرورت سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہوگئی۔ اسپتال میں اس کی موت واقع ہوگئی اور کسی کو کبھی بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اسے اس کے شوہر نے قتل کردیا تھا۔

فیضو نے بچیوں کی پیدائش کے فوراً بعد ہی منیر کو یہ عندیہ دے دیا تھا کہ اسے ان بچیوں کی ضرورت نہیں ہے۔

''لیکن انہیں تو اپنے حقوق کی ضرورت ہے۔'' منیر نے دل ہی دل میں کہا۔ ''انہیں کس قصور کی سزا ملے؟''

منیر نے اسپتال کے رجسٹر میں دونوں بچیوں کے نام صائمہ اور نائلہ لکھوائے اور بعد میں انہی ناموں سے ان کے برتھ سرٹیفکیٹ حاصل کیے گئے۔ جن میں ان کی ماں کا نام شاہدہ اور باپ کا نام فیضان علی تھا۔ اور پتا فیضان علی کے گھر کا تھا مع فون نمبرز کے۔ منیر نے شاہدہ کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا جس میں اس کی موت سے متعلق کوائف کے علاوہ اس کی

موت کی تفصیلات درج تھیں۔ وہ میٹرنٹی ہوم میں دو جڑواں بچیوں کو جنم دینے کے بعد انتقال کر گئی تھی۔

بچیوں کو چند روز تک نرس کی تحویل میں رکھنے کے بعد فیضو نے منیر سے کہا کہ وہ انہیں ایدھی سینٹر کے کسی جھولے میں ڈال دے تاکہ ان سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کی جا سکے۔ منیر کو اندازہ تھا کہ فیضان علی اسی قسم کی کوئی حرکت کرے گا لیکن منیر یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں بچیاں باپ کے ہوتے ہوئے لاوارث قرار دے دی جائیں۔ باپ کی دولت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا' اور تزئین کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں تھا۔

منیر نے جب نسرین کو بچیوں کے بارے میں فیضو کے فیصلے سے آگاہ کیا تو نسرین نے اس کی سخت مخالفت کی اور اسے سراسر ظلم اور ناانصافی قرار دیا۔

''ہم دوسروں کی اولاد کو اپنی اولاد تو نہیں بنا سکتے' لیکن ہم اپنی اولاد کی طرح پال ضرور سکتے ہیں۔'' نسرین نے کہا۔ ''ان دونوں بچیوں کو لاوارث قرار دے کر جھولے میں ڈالنے کی بجائے انہیں یہاں لے آؤ۔ ہم انہیں پالیں گے کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کا باپ کون ہے۔ ہم سب لوگوں سے یہی کہیں گے کہ ہم نے انہیں کہیں سے لے کر پالا ہے۔''

منیر کو اپنی بیوی کی طرف سے اشارے کا انتظار تھا۔ وہ تو خود دل و جان سے یہ چاہتا تھا کہ یہ دونوں بچیاں اس کے گھر آ جائیں۔ چنانچہ اس نے فیضو سے تو یہی کہا کہ اس نے بچیوں کو جھولے میں ڈال دیا ہے لیکن وہ انہیں اپنے گھر لے آیا اور بچیاں وہاں رہنے لگیں۔

دونوں میاں بیوی نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ بچیوں سے حقیقت چھپائی نہیں جائے گی اور وقت آنے پر انہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا تاکہ آئندہ چل کر وہ کسی غیر متوقع صدمے سے دوچار نہ ہوں۔ چنانچہ بچیاں جب ذمہ دار ہوئیں تو انہیں یہ بات بتا دی گئی کہ منیر اور نسرین ان کے اصل والدین نہیں ہیں۔ بلکہ انہوں نے انہیں لے کر پالا ہے اور یہ کہ ان کی ماں مر چکی ہے۔ باپ زندہ ہے وہ ایک مالدار آدمی ہے لیکن وہ بیٹیوں سے نفرت کرتا ہے اور انہیں پالنے کے لیے تیار نہیں اس کے جواب میں صائمہ اور نائلہ نے بھی اپنے نادیدہ باپ سے شروع ہی سے نفرت کی۔ ان کے لیے ان کے اصل ماں باپ تو نسرین اور منیر ہی تھے۔ یہ دونوں مشفق و مہربان اور ٹوٹ کر چاہنے والی ہستیاں ہی ان کی زندگی میں سب کچھ تھیں۔ انہیں ایک نفرت کرنے والے باپ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جس نے انہیں لاوارث قرار دیا تھا۔

منیر' ان بچیوں کا سرپرست تھا اور ولدیت کے خانے میں ہر جگہ فیضان علی کا نام تھا۔ میٹرنٹی ہوم میں بچیوں کی پیدائش کے سرٹیفکیٹس میں ہر جگہ فیضان علی کے گھر کا ہی پتہ

لکھایا گیا تھا۔ منیر نے اس امر کا مکمل طور پر بندوبست کر لیا تھا کہ نائلہ اور صائمہ کو کسی بھی وقت فیضان علی کی اولادیں ثابت کیا جا سکے اور انہیں ان کا قانونی حق دلوایا جا سکے۔ فیضو کبھی بھول کر بھی ان بچیوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ بے نام و نشان ننھی بچیاں انسانوں کے اس عظیم الشان سمندر میں نہ جانے کہاں گم ہو چکی ہوں گی۔ فیضو کے لیے تو وہ محض ایک معدوم شے تھیں

فیضو کی خودکشی کے بعد منیر اور نسرین نے نائلہ اور صائمہ کو ان کی اصل حقیقت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ان کی اکلوتی سوتیلی بہن تزئین اور اس کا میاں عرصہ ہوا مر چکے تھے ان کا اکلوتا بیٹا اظفر بھی مر چکا تھا۔ تزئین کی ماں یاسمین بھی مر چکی تھی اور اب سب سے آخر میں خود فیضان علی بھی مر چکا تھا۔ اس کی تمام دولت' املاک کی واحد وارث اس کی دونوں بیٹیاں نائلہ اور صائمہ تھیں جن کے حقِ وراثت کا منیر ان کی پیدائش کے وقت سے ہی تحفظ کرتا چلا آ رہا تھا اور اس نے وہ سارے ضروری اقدامات کر لیے تھے جو ان دونوں کو فیضان علی کی وراثت میں شریک کرنے کے لیے ضروری تھے۔ اب جبکہ فیضان علی کی کوئی اولاد یا اولاد کی اولاد یا پہلی بیوی زندہ نہیں تھی۔ فیضان علی کی دوسری بیوی کی دونوں بیٹیاں نائلہ اور صائمہ ہی اس کی جائز اور قانونی وارث تھیں

یاسمین کی موت کے بعد جب فیضان علی بالکل اکیلا رہ گیا تھا اور شدید ڈپریشن کا اور تنہائی کا شکار تھا تو منیر کے دل میں خیال آیا کہ وہ فیضان علی کو بتا دے کہ شاہدہ کے بطن سے پیدا ہونے والی اس کی دونوں بیٹیاں زندہ ہیں اور اب کالج میں پڑھ رہی ہیں۔ اس نے نسرین سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا تھا اور وہ دونوں اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب یہ بات بتا دی جائے کیونکہ اب وہ دنیا میں بالکل ہی اکیلا اور تنہا لاوارث ہو کر رہ گیا تھا لیکن قبل اس کے کہ منیر فیضان علی کو اس کی بیٹیوں کے بارے میں بتا پاتا' فیضان علی نے انتہائے یاس کی حالت میں خودکشی کر لی۔

نائلہ اور صائمہ کے لیے ان کے باپ کی خودکشی کی خبر میں صدمے کا عنصر کچھ زیادہ نہیں تھا البتہ اس حیرت کا تناسب بہت زیادہ تھا کہ وہ غیر معمولی طور پر دولت مند بن گئی تھیں۔ ویسے غریب تو وہ پہلے بھی نہیں تھیں' کیونکہ ان کے ''ابو'' کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور ''ابو'' اور ''امی'' کے ساتھ رہتے ہوئے انہیں کبھی بھی کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

فیضان علی کی خودکشی کے بعد منیر نے اس کی دونوں بیٹیوں کو ان کا حقِ وراثت دلوانے کے لیے قانونی کوششوں کا فوری طور پر آغاز کر دیا۔ اس کے پاس تمام تر ضروری مواد اور

شہادتیں پہلے سے موجود تھیں جن کو اس نے بڑی محنت کے ساتھ سنبھال کر رکھا تھا۔ بہترین وکیل قانونی مشاورت اور پیروی کے لیے موجود تھے۔

اس نے یہ ساری تفصیلات فرحان علی کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف مختصر سا بیان کافی تھا۔ ''صائمہ اور نائلہ؟'' فرحان علی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ''نہیں تو۔ فیضان چچا اور یاسمین چچی کی تزئین کے علاوہ اور کوئی اولاد نہیں تھی۔''

''آپ کو نہیں معلوم۔'' منیر نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''فیضان علی صاحب نے ایک شادی اور بھی کی تھی ان کی بیوی کا نام شاہدہ تھا اور وہ دو جڑواں بچیوں کی پیدائش کے وقت انتقال کر گئی تھیں۔ وہ دونوں جڑواں بچیاں زندہ ہیں اور وہی اپنے والد کی تمام املاک کی واحد وارث ہیں۔ آپ اپنے وکیل کو یہ بات بتا دیجئے تاکہ وہ اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہ کریں۔''

☆======ختم شد======☆